تفاسیر قرآن مجید

اور

مرزائی شبہات

جلد اول

مولانا شاہ عالم گورکھپوری

شاہی کتب خانہ دیوبند

تفصیلات

نام کتاب : تفاسیر قرآن مجید اور مرزائی شبہات

نام مرتب : مولانا شاہ عالم گورکھپوری نائب ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

تعداد صفحات : ۳۲۸

سن طباعت : نومبر ۲۰۰۲ء

باہتمام : حافظ ابوبکر شاہی، منیجر شاہی کتب خانہ دیوبند

کتابت : شاہی کمپیوٹر سینٹر، دیوبند

ناشر : شاہی کتب خانہ دیوبند۔ فون نمبر 220345 ,01336+

قیمت : 110

ملنے کے پتے

1- دفتر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

۲۔ مکتبہ دارالعلوم دیوبند

۳۔ دیوبند کے تمام کتب خانوں سے

۴۔ مدرسہ نورالاسلام، راجپور بلدیہا، ضلع مہراج گنج (یوپی)

۵۔ ملی تعلیمی کونسل، ۵۵۲۔ بی، موتی مسجد روڈ ذاکرنگر اوکھلا نئی دہلی۔ ۲۵

فون نمبر 011-6924730
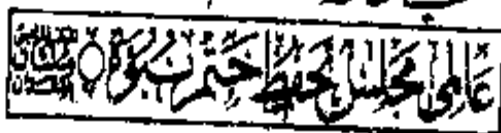
انتساب

دو شفیق ہستیوں کے نام

۱۔ حضرت والد ماجد محمد حدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً
جن کی حسن نیت آج بھی ہماری زندگی کے ہر موڑ پر کارفرما ہے۔

۲۔ استاذ مکرم حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب مدظلہ،
ناظم کل مجلس تحفظ ختم نبوت و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
جن کی مربیانہ شفقتوں نے تحفظ ختم نبوت اور رد قادیانیت کے
میدان میں کچھ کر گذرنے کا حوصلہ بندھایا ہوا ہے۔

شاہ عالم گورکھپوری

کتاب میں مندرج تفاسیر کی تفصیلات

ترجمہ: شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی: متوفی ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ
(مطبوعہ خادم حرمین شریفین شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ منورہ)

معارف القرآن: مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم ہند و پاکستان،
متوفی ۱۱ شوال ۱۳۹۶ھ ۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء (مطبوعہ دیوبند)

بیان القرآن: حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی: متوفی ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ
(مندرجہ معارف القرآن)

تفسیر ماجدی: مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی: متوفی ۶ جنوری ۱۹۷۷ء
(مطبوعہ لاہور)

ترجمہ کنز الایمان: مولانا مولوی مفتی شاہ محمد احمد رضا خانصاحب:
متوفی ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء (مطبوعہ تاج کمپنی لاہور کراچی)

خزائن العرفان: تفسیر مولانا مولوی سید محمد نعیم الدین صاحب، متوفی ۱۹۴۸ء

تفسیر ثنائی: مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری: متوفی ۱۹۴۸ء (مطبوعہ چشم نور امرتسر)

تفہیم القرآن: مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب: متوفی ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء
(مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۸۹ء)

جامع البیان: امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری متوفی ۳۱۰ھ
(مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۹۹۵ء)

کشاف: علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری: متوفی ۵۳۸ھ
(مطبوعہ .)

معالم التنزیل: محی السنۃ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی:
متوفی ۵۱۶ھ (مطبوعہ مکتبہ تعلیم ملتان)

التفسیر الکبیر: امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ (احیاء التراث العربی)

ابن کثیر: حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر القرشی:
متوفی ۷۷۴ھ (مطبوعہ مؤسسۃ الریان بیروت الطبعۃ الرابعۃ)

اجمالی فہرست

تفصیلی فہرست مضامین

رابطے کے لئے ای۔میل

shahalamgorakhpuri@rediffmail.com

ویب سائٹ برائے معلومات تحفظ ختم نبوت ورد قادیانیت

www.mtkn-deoband.org

ویب سائٹ دارالعلوم دیوبند برائے معلومات تحفظ ختم نبوت ورد قادیانیت

www.darululoom-deoband.org
www.darululoom-deoband.com

Phone (Resi) 01336-220345 Fax 01336-220603

نوٹ: کتاب میں دیئے گئے حوالوں میں (خ،ص) سے مراد ان کتابوں کے صفحات ہیں جس میں قادیانیوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تمام تصنیفات کو شامل کر کے روحانی خزائن کے نام سے شائع کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب کی تالیف

ضروریات اور تقاضے

کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کی زیر نگرانی جب تحفظ ختم نبوت اور ردقادیانیت کے موضوع پر کام بڑھا اور باضابطہ فضلاء دارالعلوم کے لئے یک سالہ اور دیگر مدارس کے اساتذہ کے لئے سہ ماہی کورس کا کامیاب نصاب تجویز ہوا، تو درس میں قادیانی استدلال اور اس کے جواب اور جواب الجواب کی تقریر کے بعد زیر بحث قرآنی آیات اور احادیث سے متعلق اس تحقیق کی بھی ضرورت پیش آتی ہے کہ ہندوستان میں پائے جانیوالے دیگر مکاتب فکر کے مفسرین حضرات کا موقف کیا ہے۔ اور ان کی تشریحات کیا ہیں؟

اس میں سالانہ کورس میں شریک طلبہ تو وقت ہونے کے باعث تلاش و ورق گردانی کی دقتوں کے باوجود حسب ضرورت کتب خانہ دارالعلوم سے تمام تفاسیر کی طرف مراجعت کر لیتے ہیں، لیکن سہ ماہی کورس والوں کے لئے قلت وقت کے باعث یہ کام مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی لئے ایک ایسے مجموعہ کی سخت ضرورت تھی جو دونوں کی مشکلات کو حل کر سکے اور مختصر وقت میں تمام مقاصد کے حصول میں معاون ہو سکے۔

تحفظ ختم نبوت کے میدان میں کام کرنے والے بعض علماء نے بتایا کہ قادیانیوں نے ایک آیت سے غلط اور گمراہ کن استدلال کیا، میں نے اپنے حلقہ میں دستیاب کتب تفاسیر کی روشنی میں اس آیت کے معنی و مطلب کو سمجھا کر صحیح جواب دیدیا مگر قادیانیوں نے عوام کے دل و دماغ میں وسوسہ پیدا کرنے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا کہ فلاں مفسر نے اس آیت کے یہ معنی و مطلب بیان کیے ہیں اور فلاں نے یہ مطلب بتایا ہے، اب ہم کس کی مانیں۔ موقع پر یہ اصولی جواب دینا تو آسان ہے کہ ہمارے مخالف مکاتب فکر کی تفسیریں ہمارے خلاف حجت

نہیں ہو سکتیں۔ تاہم یہ ضرورت تو باقی رہتی ہی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ واقعی انھوں نے ایسا کہا بھی ہے یا موروثی فطرت کے مطابق دفع الوقتی کے لئے قادیانیوں نے ان مفسرین پر محض اتہام باندھا اور اپنا پیچھا چھڑایا ہے جیسا کہ مرزا قادیانی کیا کرتا تھا۔

اب دشواری یہ ہے کہ ایک تفسیر دستیاب ہے تو دوسری نہیں اور تلاش بسیار کے بعد وہ مل بھی گئی تو تیسری نہیں ملتی اس طرح کی بیشمار دشواریاں سامنے آتی ہیں۔ لہٰذا اسکا کوئی حل نکلنا چاہئے۔

خود راقم سطور کے ساتھ، قصبہ رڑکی، ضلع ہریدوار میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ قادیانی پوپ دھڑا دھڑ شیعی روایتیں اور کبھی چکڑالوی روایتیں اور کبھی دیگر مکاتب فکر کی تفسیریں پیش کرتا اور تمام تر اختلافات پیش کر کے مرزا کو حکم بنانے کی کوشش کرتا۔ مگر ہوتا یہ کہ اپنے حکم (مرزاجی) کے بدنما کیریکٹر اور ہفوات کے جال میں خود پھنس کر شرمندہ ہو جاتا۔ اور اس کے سارے تانے بانے بکھر جاتے۔

بہر کیف اس موقع پر بندہ کو اس کا احساس ہوا کہ رد قادیانیت کے میدان میں کام کرنے والوں کے سامنے ایک ایسا مجموعہ ہونا چاہئے جس سے آسانی سے اس طرح کی قادیانی دسیسہ کاریوں پر قابو پایا جا سکے، نیز عوام کو اس طرح کی مرزائی تلبیسات سے محفوظ رکھنے کے لئے دیگر مکاتب فکر کے موقف سے صحیح واقفیت حاصل کی جا سکے۔

بعض علاقوں میں خطابت اور وعظ و تقریر کا بڑا زور ہے۔ رمضان المبارک میں تراویح کے بعد تفسیر قرآن سننے اور سنانے کا بھی بہترین ماحول بنتا جا رہا ہے۔ بندہ ناچیز نے بعض ائمہ اور مقررین کو اس طرف توجہ دلائی کہ تفسیر کے سبق میں عقائد پر بھی کچھ روشنی ڈالا کریں بالخصوص رد قادیانیت کے موضوع پر، تو ان میں سے بعض کا جواب یہ تھا کہ قادیانیت کیا ہے؟ وہ کن آیات و احادیث کو اپنے استدلال کی بنیاد بناتے ہیں؟ ہمیں معلوم نہیں۔ جبکہ بعضوں کا یہ کہنا تھا کہ رد قادیانیت کے موضوع پر ہمیں کچھ تو معلومات حاصل ہیں لیکن کتب تفاسیر ہمارے پاس موجود نہیں اور صرف چند آیات کی وجہ سے کئی کئی جلدوں کی تفسیریں خریدنا اور پھر ان کا مطالعہ کرنا ایک دشوار کن امر ہے۔

یہاں بھی ایک ایسے مجموعہ کا تقاضا سامنے آیا جس سے ائمہ کرام، واعظین و مقررین حضرات کی یہ ضرورتیں پوری ہوں اور رمضان میں تفسیر سنانے والے اس کی روشنی میں قادیانی عقائد باطلہ کی تردید کر سکیں اور عوام کو قادیانی فتنہ سے محفوظ رکھ سکیں۔

ہر جگہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا جال پھیلا ہوا ہے بلکہ ضرورت زندگی اور افادہ واستفادہ کا اہم ذریعہ بنتا جارہا ہے۔ آج لوگ گھر بیٹھے دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کم وقت اور کم خرچ میں بہت سی معلومات جمع کر لیتے ہیں۔ اس کے پیش نظر بھی ایک ایسے مجموعے کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں وہ تمام آیات واحادیث اور انکی مستند تفاسیر وتشریحات جمع ہوں جن میں قادیانی دجل وتلبیس سے کام لیتے ہیں تاکہ اگر اس مجموعہ کو انٹرنیٹ پر نشر کر دیا جائے تو دنیا کا ہر شخص جب چاہے اور جہاں سے چاہے بآسانی قادیانیوں کی دجل وتلبیس سے آگاہ ہو سکے۔ اور صحیح اسلامی علم وعقائد سے واقف ہو سکے۔

ہاں! قادیانی جن جن تفاسیر کو اپنی تحریف کا شکار بناتے ہیں یا بنا سکتے ہیں وہ تو محدود نہیں کہ ان سب کو جمع کیا جا سکے البتہ ابتک جن آیات واحادیث کو انھوں نے مشق ستم بنایا ہے ان کا استقراء کرتے ہوئے چند تفاسیر شامل اشاعت ہیں۔ ان کے علاوہ اگر کسی اور تفسیر کا قادیانی حوالہ دیتے ہیں تو ضرورت مند حضرات بندہ سے رابطہ کر کے مطلوبہ تفاسیر دارالعلوم دیوبند کی ویب سائٹ پر دیکھ سکتے ہیں۔

اس مجموعے کی ترتیب میں بندہ نے حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب مدظلہ کی کتاب "قادیانی شبہات کے جوابات" سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اللہ انھیں جزاء خیر دے حضرت موصوف کی جمع وترتیب نے ہمارے کام کو نہایت سہل بنادیا۔ کتاب میں جواب اور جواب الجواب "قادیانی شبہات کے جوابات" سے ہی لئے گئے ہیں، البتہ بعض مرزائی مغالطوں کے جوابات جو اُس میں نہیں تھے ان کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اردو تفاسیر میں ان مکاتب فکر کی تفسیروں کو شامل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جن کے معتقدین کی ایک معتدبہ تعداد ہے اور جو تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم پر متحد اور متفق ہیں تاکہ دیگر مسلکی اختلافات سے بالاتر ہو کر عقیدہ ختم نبوت کے سلسلہ میں کسی بھی مکتب فکر سے متعلق افراد کی، بلکہ ایک عام آدمی کی بھی حقیقت تک رسائی ہو سکے۔ اور عربی تفسیروں میں جن تفاسیر کا انتخاب بندہ نے کیا ہے ان میں سے ہر تفسیر ماشاء اللہ اپنی جگہ ایک علاحدہ خوبی اور خصوصیت کی حامل ہے جنھیں شمار کرانے کا یہاں موقع نہیں۔ ضرورت مند حضرات اس

فن کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ اُن تفاسیر کی تفصیلات صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیے

یہ مجموعہ ختم نبوت کے موضوع پر صرف دس آیات پر مشتمل ہے۔ آئندہ بھی یہی کوشش رہے گی کہ ہر جلد دس آیتوں پر مشتمل رہے تاکہ جلدیں زیادہ ضخیم بھی نہ ہوں اور زیادہ ہلکی بھی نہ ہوں۔ بسہولت ہر آدمی ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

یہ وہ مختلف ضرورتیں تھیں اور مختلف نوعیت کے حالات اور تقاضے تھے جو اس مجموعہ کی ترتیب پر آمادہ کرتے رہے۔ اور آج الحمدللہ وہ مجموعہ جیسا بھی ہے آپ کے سامنے ہے اس کا کوئی جزو اگر آپ کے کام آجائے تو یقیناً یہ ہمارے لئے دنیا میں باعث مسرت اور آخرت میں باعث نجات ہوگا۔ (انشاءاللہ) ہم اپنے قارئین سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کی کوتاہیوں اور کمیوں پر مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر لی جائے۔

اب اخیر ہم اپنے معاونین و مخلصین بالخصوص استاذ گرامی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی مدظلہ اور فاضل نوجوان جناب مولانا محمد وارث مظہری قاسمی صاحب مدظلہ کے ممنون ہیں جنہوں نے حرفاً حرفاً قادیانی استدلال اور اسکے جواب وجواب الجواب کو بغور ملاحظہ فرمایا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ نیز شعبہ میں داخل سالانہ کورس میں شریک طلبہ کے علاوہ اس سال کے سہ ماہی کورس میں شریک (مرکز المعارف برانچ بمبئی کی زیر نگرانی انگریزی زبان میں تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر ریسرچ کرنیوالے) مولانا معین الدین اور مولانا رفیق الاسلام آسامی نے اور مولانا عبدالرشید قاسمی (راجستھان) نے بھی حوالوں کی مراجعت میں تعاون دیا اور دوران تحقیق کتاب سے فائدہ اٹھایا، فجزاھم اللہ

اور بڑی ناسپاسی ہوگی اس موقع پر اگر ہم اپنے محسن ومربی حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا بدر الدین اجمل صاحب مدظلہ رکن شوری دارالعلوم دیوبند کے شکر گزار نہ ہوں کہ جن کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔

شاہ عالم گورکھپوری

نائب ناظم مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعائیہ کلمات

ہندوستان میں مسائی تحفظ ختم نبوت کی نشاۃ ثانیہ کے محرک اول، جانشین شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب مدظلہ

امیر الہند، صدر جمعیۃ علماء ہند و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

حضرت خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والے تیس بڑے دجالوں میں ایک دجال مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۹۰۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اس نے اپنے دعویٰ نبوت و دیگر دعاوی باطلہ کو دجل و فریب کے ذریعہ قرآنی آیات کی غلط تشریح کا سہارا لیکر ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی اور آج تک اس کی ذریت اسی دجالی مشن میں لگی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے بعض پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے فریب میں آجاتے ہیں، اس لئے ان آیات کریمہ کو سلف و خلف کی تفاسیر کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس گروہ کا دجل و فریب آشکارا ہو سکے۔

جناب مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری نائب ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کو چند سال پہلے اس ضرورت کا شدید احساس ہوا کہ ان آیات میں قادیانی تحریفات کے مسکت جوابات کے ساتھ ساتھ ان آیات کی صحیح تفسیریں حوالوں کے ساتھ جمع کردی جائیں اسی وقت سے موصوف نے اس موضوع پر کام شروع کردیا تھا جس کے سلسلہ کی پہلی کڑی "تفاسیر قرآن مجید اور قادیانی شبہات" کے نام سے سامنے آرہی ہے۔

اس تالیف سے واضح ہوگا کہ قادیانی دسیسہ کاریوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے علماء کا موقف یکساں ہے اور سب کے نزدیک یہ گروہ دائرہ اسلام سے خارج، مرتد اور زندیق ہے۔ اسی لئے شروع سے ہی قادیانی فتنہ کے تعاقب میں ان علماء نے مشترکہ جدوجہد کی ہے۔

اس طرح کی کتاب کی وقتی ضرورت تھی تاکہ جس مکتب فکر کا مسلمان بھی قادیانیت سے متاثر ہو وہ متقدمین مفسرین اور اپنے مکتب فکر کے علماء کی تحریروں کو پڑھ کر قادیانیت کے کفر و زیغ و ضلال سے واقف ہو جائے اور اپنے ایمان و عقیدہ کی حفاظت کرے۔

خداوند کریم مولانا شاہ عالم صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی اس اہم دینی خدمت کو قبولیت سے نوازکر قادیانیت سے فریب خوردہ لوگوں کیلئے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

اسعد غفرلہٗ

۵ ار رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

مدنی منزل دیوبند سہارنپور

رائے گرامی

محب العلماء گرامی قدر مولانا بدرالدین اجمل صاحب قاسمی

صدر آل انڈیا مرکز المعارف ورکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری نے تمام اسلامی مکاتب فکر کے علماء کی تفسیروں کو جمع کر کے ایک بہترین کام انجام دیا ہے جس سے مختلف موضوعات پر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔ دیگر مکاتب فکر کے علماء کی تائیدات بھی شامل کر لی جائیں، یہ بندہ کی رائے ہے۔

والسلام

بدرالدین اجمل قاسمی

کتبہٗ منزل علی آسامی

مہتمم جامعہ الشیخ حسین احمد المدنی دیوبند

۲۲ رشعبان ۱۴۲۳ھ

تائید و تحسین

گرامی قدر جناب مولانا عبدالوہاب خلجی صاحب

☆صدر معہد الاسلام ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری ☆ سابق ناظم عمومی مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند
☆معاون سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل ☆ نائب صدر جمعیت فضلاء سعودیہ
☆ورکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

برصغیر میں انگریزی اقتدار کی آخری نصف صدی مذہبی اعتبار سے بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ اس دور میں کئی فتنوں نے جنم لیا، کئی تحریکیں اٹھیں، باطل پرستوں نے بھی معرکہ آرائی شروع کی، انگریز نے اپنے استعماری تسلط کو برقرار رکھنے کے لئے مال ومتاع کے ذریعہ انتشار وافتراق کے مختلف حربوں کا استعمال کیا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنے ذہن وفکر کے مطابق لوگوں کی پرورش وپرداخت شروع کردی۔ ایسے ہی لوگوں میں اسے صوبۂ پنجاب کے قصبہ قادیان سے مرزا غلام احمد نامی شخص دستیاب ہوگیا۔ جس کے جھوٹی نبوت کے دعوی نے قصر ختم نبوت پر حملہ کرکے انگریز کے حکم کی بجاآوری کے ذریعہ جہاں اس کے تسلط کے استحکام کیلئے موقعہ فراہم کیا وہیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک فتنہ کا دروازہ کھول دیا۔

برصغیر کے علمائے حق نے اس فتنہ کے پیدا ہوتے ہی اسکی سرکوبی کے لئے ایسا وار کیا جس سے انگریز اور اس کے پروردہ تلملا اٹھے، اور اس معرکۂ حق وباطل میں اسے بری طرح پسپائی ہوئی، علمائے صدق وصفا کے اس گروہ حقانی نے اللہ کے نازل کردہ دین اسلام کی رہنمائی ووکالت اس کے دفاع اور اس فتنہ کے استیصال کے لئے پوری قوت اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ تقریر وتحریر، بحث ومباحثہ، مناظرہ ومجادلہ اور مباہلہ تک سے گریز نہیں کیا اور قصر ختم نبوت کی حفاظت کے لئے بھرپور طریقہ استعمال کئے۔

فتنہ قادیانیت کے قلع قمع اور رد کے لئے جن علمائے اسلام نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان میں برصغیر کے علمائے اہل حدیث کو برتری وتقویت حاصل ہے۔

شیخ الکل فی الکل علامہ سید نذیر حسین محدث دہلوی میاں صاحب، ان کے شاگرد رشید مولانا محمد حسین بٹالوی، شیخ الاسلام مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا عبداللہ، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی جیسے اساطین علم بیشمار ایسے علماء ہیں جنہوں نے قادیانی امت کو ہر محاذ پر پسپا کیا اور تحریک تحفظ ختم نبوت کی آبیاری کی۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی "جس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف آواز اٹھائی اس آواز کو دبانے کے لئے سب سے پہلے میدان میں مولانا ثناء اللہ مرحوم آتے تھے" جبکہ آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں "علمائے اہل حدیث نے مرزا کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ مرزا قادیانی اس فتویٰ سے تلملا اٹھا اور میاں صاحب کو مناظرے کا چیلنج کر دیا" جن علمائے اہل حدیث نے مرزا اور اس کے بعد قادیانی گروہ کو زیر کیا، ان میں مولانا محمد بشیر سہسوانی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سرفہرست ہیں، لیکن جس شخصیت کو علمائے اہل حدیث میں فاتح قادیان کا لقب ملا وہ "مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے" اسی مرد مجاہد سے مباہلے کا نتیجہ تھا کہ قصر ختم نبوت کا منکر اور مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو اپنے ہاتھ سے لکھے خط کے بعد صرف ایک سال ایک ماہ اور بارہ دن بعد لاہور میں اپنے میزبان کے گھر بیت الخلاء میں دم توڑ دیا، جبکہ علامہ امرتسری اس کی عبرتناک موت کے چالیس سال بعد تک محمدی جرنیل کا کردار ادا کرتے ہوئے ناموس رسالت کے دفاع کے صف اول میں بے مثال خدمات انجام دیتے رہے۔

زیر نظر کتاب برصغیر میں تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں جاری ان کوششوں کا ایک تسلسل ہے جو علمائے اسلام اس فتنے کے سد باب کے لئے انجام دے رہے ہیں، ایک ایسے وقت میں جبکہ قادیانی امت کے زر خرید کارندے مال و متاع کے لالچ کے ساتھ ساتھ حقائق کو توڑ مروڑ کر شکوک و شبہات اور وساوس سے بھرا اپنا دام مکر و فریب پھیلا کر عامۃ الناس کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ کتاب ان کے لئے مشعل راہ ہوگی تاکہ وہ براہ راست علمائے امت کے ان جوابات سے مستفید ہو سکیں جو اس اخبار میں موجود ہیں۔

مولانا شاہ عالم قاسمی ایک باہمت حوصلہ مند اور فکر مند نوجوان عالم ہیں، دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ہی وہ ایک تحریکی ذہن کے ساتھ میدان عمل میں سرگرم عمل ہیں انہوں نے نہ صرف اس سلسلے میں کافی مطالعہ کیا ہے بلکہ میدان میں اتر کر اسکا مشاہدہ بھی کیا ہے اس طرح وہ گھر کے بھیدی اور خبیر کی حیثیت رکھتے ہیں، جس طرح ماضی میں قافلۂ روحانیت کے شہسوار اعظم حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ (جن کے خود مولانا شاہ عالم قاسمی بڑے مداح وقدرداں ہیں) نے متحدہ ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے علمائے اسلام کا رد قادیانیت میں فتوی لیکر شائع کیا تھا۔ مولانا شاہ عالم قاسمی وفقہ اللہ نے زیر نظر تالیف لطیف میں عرب وعجم کے علماء کی رد قادیانیت میں آیات قرآنیہ کی تفسیرات کو یکجا جمع کر کے نہ صرف اس اولین فتوے کی یاد تازہ کردی، بلکہ اس فکر کو بھی پیش کردیا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنان وباغیان اسلام کی یورش کے سامنے تمام علماء خود سیسہ پلائی دیوار کی طرح متحد وصف بستہ ہیں۔

اس کے لئے مولانا موصوف تبریک وتہنیت اور تحسین کے مستحق ہیں، اللہ تعالی ان کی یہ کاوش قبول فرمائے اور ملت اسلامیہ کے لئے مفید ومثمر بنائے ہر مسلمان کو زیغ وضلال سے محفوظ رکھے نیز پیغمبر آخر الزماں ختمی مرتبت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پیروکار بنائے اور ختم نبوت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

عبدالوہاب خلجی

۲۶ رشعبان ۱۴۲۳ھ

تائید و پیغام

شہنشاہ خطابت گرامی قدر جناب مولانا عبید اللہ اعظمی صاحب

چشتی، سہروردی، برکاتی ممبر پارلیمنٹ (راجیہ سبھا)

مجھے یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی کہ مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری رد قادنیت پر پوری طرح کمربستہ ہیں۔

تاریخی طور پر یہ حیثیت اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ قادیانی مذہب حکومت برطانیہ کی جھولی سے نکلا ہوا ایک زبردست ابلیسی فتنہ ہے۔ انگریزوں کا مقصد تھا کہ ایک ایسا فرضی نبی پیدا کیا جائے جو حکومت برطانیہ کی غلامی کا حق ادا کرتے ہوئے مسلمانوں کے اندر سے جہاد کی اسپرٹ ختم کردے تاکہ انگریزوں کی سامراجی گورنمنٹ کیخلاف مسلمانوں کی طرف سے بغاوت کا جذبہ سرد پڑ جائے۔ ان ساری باتوں کے لئے ہمیں باہر سے کوئی گواہی نہیں چاہئے۔ خود کذاب زمانہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے قلم سے سارے ثبوت فراہم کردیئے ہیں۔ مرزاجی کی یہ تحریر ان کی جھوٹی نبوت کا کس طرح پردہ فاش کررہی ہے ملاحظہ ہو۔

میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں، نہ مدینہ میں، نہ روم میں، نہ شام میں، نہ ایران میں، نہ کابل میں، مگر اس انگریز گورنمنٹ میں، جسکے اقبال کے لئے دعا کرتا ہوں۔

(اشتہار مرزا کی مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ۶ ص ۶۹)

مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری نے جس طرح انگریزوں کے دلال مرزا غلام احمد قادیانی کا تعاقب فرمایا ہے، پوری ملت اسلامیہ پر فرض ہے کہ بلا اختلاف مسلک اس قادیانی فتنے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کیلئے کمربستہ رہے، خداوند عالم اس سمت میں ہر کوشش بخواب کو شرمندۂ تعبیر فرمائے آمین۔

عبید اللہ خاں اعظمی

ممبر پارلیمنٹ نئی دہلی

۹ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

تائید و تاثرات

گرامی قدر جناب مولانا محمد شفیع مونس صاحب

نائب صدر جماعت اسلامی ہند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفاسیر قرآن اور مرزائی شبہات کے ایک جز کو سنا اور اس سلسلے میں بصورت گفتگو بھی معلومات حاصل ہوئیں۔ جیسا کہ اسلام میں علماء کرام کی رہنمائی میں ملت قادیان کو مسلم حکومتوں نے خارج از ملت قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے متعلقین ہم عوام کو فریب دے کر اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پنجاب اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں میں یہ فتنہ پھر سر اٹھاتا نظر آتا ہے۔ اس وجہ سے جن حضرات کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے عوام کو باخبر کرنے کا موقع نصیب ہے ان کی خدمات قابل قدر بھی ہیں اور لائق شکر گزاری بھی۔

مولانا شاہ عالم گورکھپوری بھی ان اہل علم و دانش حضرات میں شامل ہیں جو اس سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے شعبہ میں نائب ناظم کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات لائقہ کو شرف قبول بخشے اور توفیق مزید عطا کرے۔

والسلام

محمد شفیع مونس

۱۴/۱۱/۲۰۰۲ء

تقریظ

حضرت مولانا سید محمد اسماعیل صاحب کٹکی

نائب صدر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت،

رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند و امیر شریعت کٹک

"قرآنی تفاسیر اور مرزائی شبہات" نامی تالیف کا مسودہ ملاحظہ کیا۔ یہ کتاب مولانا شاہ عالم نائب ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کی تالیف ہے۔ مذہب مرزائیت صرف دھوکہ دہی، غلط بیانی، غلط سلط حوالے مکر و فریب کاری کا مجموعہ مرکب ہے۔ مثال کے طور پر ایک حوالہ دیتا ہوں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب شہادۃ القرآن میں لکھا ہے کہ "بخاری شریف" جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے اس میں یہ حدیث موجود ہے کہ امام مہدی کے لئے آسمان سے آواز آئیگی "ھذا خلیفۃ اللہ المہدی" حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے بخاری شریف میں یہ حدیث نہیں ہے۔ مرزا غلام احمد نے آیات قرآنی اور ان کی تفسیر میں جابجا اپنی طرف سے اضافہ کر کے تحریف کی ہے۔ میں نے اس دجالی مذہب کے خلاف اپنی زندگی کا پورا حصہ صرف کیا ہے اور درجنوں تقریری و تحریری مناظرے کئے ہیں اور مرزائی کل کتابوں کا بالتفصیل مطالعہ کیا ہے۔ اکثر مناظرے میں یہ منظر میں نے دیکھا ہے کہ اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کیلئے قادیانی مناظر تفسیر کبیر، تفسیر ابن کثیر وغیرہ کا غلط حوالہ دیتے ہیں۔ اسکا الزامی جواب ہم اکثر دیتے ہیں۔ مگر مولانا شاہ عالم صاحب نے ان کے شبہات کا تحقیقی جواب دیا ہے۔ اس کتاب کی اشد ضرورت تھی جو ہمارا مناظر الزامی جواب کے ساتھ تحقیقی جواب بھی دیکر مرزائیت کے تابوت میں کیل ٹھوک دیں۔

احقر محمد اسماعیل عفی عنہ

۲۲ر شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ

تاثرات

امیر شریعت حضرت مولانا مفتی سید نظام الدین صاحب

امیر شریعت پھلواری شریف پٹنہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

مرزا غلام احمد قادیانی کے خارج از اسلام ہونے میں تمام علماء کرام کا اتفاق ہے، مرزا نے قرآنی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں جگہ جگہ دجل وفریب سے کام لیا ہے۔ لائق مبارک باد مولانا شاہ عالم صاحب زید مجدہ ہیں جنہوں نے تمام معتبر تفسیروں کو سامنے رکھ کر ان آیتوں کی تفاسیر کو حوالہ کے ساتھ جمع کر دیا ہے جس سے مرزا کا فریب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ مولانا موصوف نے اس میں کافی محنت کی ہے، امت کی طرف سے انہوں نے اس فریضہ کو بڑی خوش اسلوبی سے ادا کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ انکی اس محنت کو قبول فرمائے اوران کے لئے زاد آخرت بنائے۔

رد قادیانیت کے سلسلہ میں اس کتاب کا مطالعہ تمام اہل علم کیلئے ضروری ہے بالخصوص جن حضرات کو اس فن سے لگاؤ ہے اور جو اس خدمت میں مشغول ہیں۔

سید نظام الدین

۲ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

تقریظ

گرامی قدر مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس ورکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔۔ امابعد ۔۔!

مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری، نائب ناظم کل ہند تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کی تازہ تالیف "تفاسیر قرآن مجید اور قادیانی شبہات" نظر نواز ہوئی۔ مؤلف نے بڑی ہی عرق ریزی اور جانفشانی سے قرآن پاک کی ان آیات کی مستند اور معتبر تفسیر کا بیڑا اٹھایا ہے جن آیات سے قادیانی اپنے باطل مزعومات کے سلسلے میں تلبیس اور تحریف کے ذریعہ استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا موصوف نے خاص کام یہ کیا ہے کہ ہر آیت کی تفسیر میں تمام اسلامی مکاتب فکر کے علمائے کرام کی تفسیروں کو جمع کر دیا ہے، کیونکہ ختم نبوت اہل اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے اور اس مسئلہ میں تمام مکاتب فکر کے علماء متفق ہیں۔ اس طرح کسی قادیانی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ یہ تفسیر فلاں مسلک کے عالم کی ہے۔

کتاب علمائے کرام اور خاص طور سے رد قادیانیت کے سلسلے میں کام کرنے والے حضرات کیلئے بے حد مفید ہے۔ چونکہ مولانا شاہ عالم صاحب کو اس کام کا کافی تجربہ ہے اس لئے قادیانیوں کے دجل وفریب سے بھی خوب آگاہ ہیں اور ان کے تعاقب میں بھی پورے طور پر کامیاب ہیں۔

میری دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کتاب کو قبول عام عطا فرمائے اور مؤلف کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین والسلام

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ

خادم جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس

۲۳ر شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ

تقریظ

محسن ملت جناب مولانا اسرار الحق صاحب قاسمی

صدر آل انڈیا ملی وتعلیمی فاؤنڈیشن، ایڈیٹر ماہنامہ ملی اتحاد دہلی،

اسسٹنٹ سکریٹری آل انڈیا ملی کونسل

قادیانی فتنہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر امت مسلمہ کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے، گرچہ علماء اسلام نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیا ہے پھر بھی یہ فتنہ اسلام ہی کے نام پر سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں سرگرم عمل ہے۔

قادیانیت کی بڑھتی ریشہ دوانیوں کا احساس صرف ایک مکتب فکر یا جماعت کو نہیں بلکہ بلا امتیاز مسلک ومشرب پوری قوم مسلم کو ہے، امت مسلمہ کی تمناؤں کا مرکز دارالعلوم دیوبند نے اپنی سابقہ روایات کے مطابق فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے لئے باضابطہ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے ایک مجلس تشکیل دے رکھی ہے، دارالعلوم دیوبند کا یہ شعبہ قادیانیت کی سرکوبی کے لئے پیہم کوشاں ہے اور اس کے ذمہ داروں کی مخلصانہ جدوجہد کے نتیجے میں اب تک بے شمار لوگوں کو قادیانی فتنہ سے تائب ہونے کی توفیق ملی ہے۔

مختلف علاقوں کے دورہ کرتے وقت مجھے بھی قادیانیت کی زہرناکیوں کا شدت سے احساس ہے، بحث ومباحثہ کے دوران قادیانی مبلغین علماء اسلام کی مختلف تفاسیر کے پس پردہ علماء اہل حق کو فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اس پس منظر میں ضرورت اس کی تھی کہ جن آیتوں سے قادیانی استدلال کرتے ہیں، ان کے ضمن میں سبھی مکاتب فکر کے علماء کی تفاسیر جمع کردی جائیں، خدا کا شکر ہے کہ اس ضرورت کی تکمیل مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے جناب مولانا شاہ عالم صاحب نائب ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے ذریعہ انجام پذیر ہوئی، اس کام کیلئے جس عزم وحوصلہ، علمی تحقیق، وسعت مطالعہ، کام کی لگن، ذہنی وفکری بلندی، اور دیگر مسلک ومشرب کے علماء کو جوڑنے کی صلاحیت ہونی چاہئے وہ بدرجہ اتم مولانا موصوف میں موجود ہے۔ ہمارے اس نظریہ کو تقویت بخشنے کے لئے موصوف کی پیش نظر تازہ تالیف کافی ہے جس میں انہوں نے ہر مکتب فکر کے کلیدی علماء کی تفاسیر کی روشنی میں قادیانی مستدلات کا دندان شکن جواب دے کر اپنی نہ صرف وسعت ظرفی بلکہ اس موضوع پر گہری بصیرت کا بھرپور ثبوت پیش کیا ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب ہر طبقہ میں قبولیت حاصل کریگی اور طلبہ واساتذہ سبھی کیلئے یکساں طور پر مفید ہوگی۔

والسلام

اسرار الحق، دہلی

۲ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

تائید و تبریک

پیر طریقت جناب مولانا پیرزادہ شبیر نقشبندی صاحب

صدر آل انڈیا ریلیجس لیڈرس ایسوسی ایشن و بانی فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم.. اما بعد!

مرزا غلام احمد قادیانی کے ماننے والے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اسلام اور مسلمانوں کے لبادہ میں مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں محض ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے ہر طبقہ کے مسلمان اس فتنہ سے متاثر ہو رہے ہیں ان حالات میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ بلا اختلاف مسلک ومشرب تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم پر متحد ہو کر قادیانی فتنہ کا مقابلہ کیا جائے۔ جیسا کہ شیخ طریقت صوفی غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ، مشہور صوفی حضور پیر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف، امام اہل سنت مولانا احمد رضا خاں صاحب چشتی سہروردی قادری برکاتی اسی طرح ہمارے سلسلہ کے تمام بزرگوں نے دین اسلام کی خدمت کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں اور حضور تاجدار مدینہ ﷺ کے عشق ومحبت کو اپنے دل میں بسا کر آپ کو آخری نبی مانا اور اس عقیدہ پر نہ صرف یہ کہ قائم رہے بلکہ اس عقیدہ کے خلاف اٹھنے والے تمام فتنوں کا بھرپور مقابلہ کیا۔ بنابریں ہمارے لئے بھی قادیانی کا مقابلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق وایمان کی علامت ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے نوجوان فاضل جناب مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری کے خیالات اور ان کی تیار کردہ تازہ کتاب "تفاسیر قرآن مجید اور مرزائی تحریفات" دیکھ کر ہمیں بے حد مسرت ہوئی تمام مسالک کی تفاسیر کو جمع کر کے یقیناً مولانا موصوف نے ملت کی ایک اہم اور ضروری خدمت انجام دی ہے۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء انشاء اللہ یہ کتاب ہر خاص وعام کے لئے مفید ہوگی۔

فقط خادم القرآن خاکپائے حضور سرور کائنات ﷺ السید شبیر نقشبندی

پیرزادہ شبیر نقشبندی

۱۴/۱۱/۲۰۰۲ء

تائیدوتاثرات

شیخ عبدالروف، سیداحمد نصر شیخ حسین ابراہیم الشامی

من متخرجي جامعه ازهر شريف مصر ومبعوث وزارة الأوقاف جمهوريه مصر عربيه لاحياء ليالي شهر رمضان المبارك بالهند

بسم الله الرحمن الرحيم

قال الله تعالى في تنزيله العزيز: ماكان محمدأبا أحد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبين، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنا خاتم النبين لانبيبعدي...... اتفقت الأمة على أن سلسلة النبوة قد انتهت نبينا محمد صلى الله عليه وسلم ولن يأتي نبي أورسول بعده الى يوم القيامة. هذه عقيدة من عقائد الاسلام الأساسية... وعليه فان كل من ينكر ذلک أو يعتقد على عكس ماعليه أهل السنة والجماعة في هذا الباب، لايمت بصلة الى الإسلام.

وقد إطلعنا على أن الشيخ شاه عالم القاسمي الف كتابا حول هذا الموضوع الهام باللغة الأردية، جمع فيه آراء وتصريحات لعديد من المفسرين باللغتين العربية والأردية فيما يتعلق بهذا الموضوع حتى يغدو الأمر جليا وواضحا في أعين الناس خاصة البسطاء الذين لايعرفون القضية حق معرفة ويمكن لهم أن يقفوا بسهولة في فخ القاديانية المرتدة.

ونظرا إلى أهمية وقيمة هذا الكتاب فانا نقدم كل تقديرنا وثنا ئنا للمؤلف راجيا الله سبحانه وتعالى أن يقبله قبولا حسنا ويجعله سبب هداية لعباده المؤمنين اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنا به. وصلى الله على النبي الكريم وعلى آله وصحبه وسلم تسليما.

عبد الرؤف محمد سيد احمد نصر   حسين ابراهيم الشامي

۹/ رمضان المبارک   ۹/ رمضان المبارک

آیت (۱)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (سورۂ فاتحہ:۶،۷)

ترجمہ: بتا ہم کو راہ سیدھی راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا۔ جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

خلاصہ:۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کو سکھلائی گئی یہ ایک جامع اور اہم ترین درخواست ہے، جس میں پہلے جملہ میں بندہ، عقائد و اعمال اور زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں اپنے رب سے رہنمائی اور ہدایت طلب کرتا ہے اور دوسرے جملے میں مزید اس کی وضاحت و تشریح کرتے ہوئے خدا کے مقبول اور منظور نظر بندوں یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہدا اور صالحین کی پیروی، اور نافرمانوں یعنی یہود و نصاریٰ سے علاحدگی مانگتا ہے۔ تا کہ صراط مستقیم پر چلنا آسان سے آسان تر ہو جائے۔

تمام مفسرین و مجددین امت نے آج تک اس آیت کا یہی معنی و مطلب سمجھا اور سمجھایا ہے جیسا کہ آپ تفاسیر کے باب میں ملاحظہ فرمالیں گے۔ خود فرنگی نبی مرزا غلام احمد قادیانی بھی ایک زمانہ تک یہی معنی و مفہوم مراد لیتا رہا ہے۔ لیکن جب اس کا ذہن بیمار ہوا اور اس پر ضلالت کا دور آیا تو وہ شتر بے مہار ہو بیٹھا۔

نہ رسول کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب کہئے، یا ہنر،
بے پاؤں سر کے زبان پر جو بات آئی وہ کہہ دیا

مرزا قادیانی نے اپنی تصنیفات میں تقریباً ۲۰ سے زائد مقامات پر اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ جبکہ دس جلدوں پر مشتمل اس کے ملفوظات میں ۳۸ سے زائد مقامات پر اس آیت سے استدلال ملتا ہے۔ لیکن اس کی متضاد تحریریں خود اس کے ذہنی مریض ہونے اور اس کے استدلالات کی ضلالت و گمراہی پر واضح دلیل ہیں۔ جیسا کہ اس کی نشاندہی اسی کے چیلے مسٹر محمد علی نے بھی کی ہے۔

چنانچہ مرزا قادیانی براہین احمدیہ میں اس آیت کی مراد کو "علم وحکمت" کے ساتھ خاص کرتا ہے۔ جیسا کہ اس نے لکھا ہے" چونکہ اہل کمال لوگوں کا صراط مستقیم یہی ہے کہ وہ علی وجہ البصیرت حقائق کو معلوم کرتے ہیں نہ اندھوں کی طرح...... سو دیکھئے اس دعا میں بھی علم اور حکمت ہی خدا سے چاہی ہے اور وہ علم مانگا ہے جو تمام دنیا میں متفرق تھا" (خ ص ۵۰۲ تا ۵۰۵ ج ۱) اور کبھی انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کا راستہ مراد لیتا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے "اب میں سورہ فاتحہ کی طرف رجوع کر کے کہتا ہوں اھدنا الصراط المستقیم میں انعمت علیہم کی راہ طلب کی گئی ہے (ملفوظات ۵۶ ج ۲ ۲۲ مئی ۱۹۰۰ء) گویا کہ یہ ایک درخواست اور دعا ہے، جو عام ہے اور اس کا مانگنا تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ اور کبھی کہتا ہے کہ " دل میں یہی ملحوظ رکھو کہ میں صحابہ اور مسیح موعود کی جماعت کی راہ طلب کرتا ہوں۔ (تحفہ گولڑویہ روحانی خ ص ۲۰۸ ج ۱۷) گویا کہ اس سے مسیح موعود یعنی خود مرزا قادیانی اور اس کی جماعت کا ہی کا راستہ مراد ہے۔

لیکن جب مرزا سے سوال ہوا کہ جو لوگ آپ کو نہیں مانتے وہ انعمت علیہم کے نیچے ہیں یا نہیں؟ تو قادیانیوں کو اپنے نبی مرزا کادیانی کا فیصلہ یاد رکھنا چاہئے، مرزا نے واضح لفظوں میں یہ فیصلہ سنایا ہے

"انعمت علیہم میں تو میں اپنی جماعت کو بھی شامل نہیں کرسکتا" (ملفوظات ص ۲۱۶، ۲۱۷ ج ۲ ۲۰ فروری ۱۹۰۱ء)"

اور چند ہی یوم کے بعد ۲۶ فروری ۱۹۰۱ء میں مرزا نے کیا گل کھلایا، ملاحظہ فرمایئے

"فرمایا: اھدنا الصراط المستقیم کی دعا سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ظلی سلسلہ پیغمبروں کا اس امت میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ (ملفوظات ۲۲۳ ج ۲، ۲۸ ج ۲)

گویا آیت کا منشاء مرزا کے اس قول کے مطابق اب یہ طے ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ نبوت جاری ہونے کی اور ظلی نبیوں کے آنے کی خبر دے رہے ہیں۔ لہذا یہ آیت یا تو اب دعا، و درخواست نہ رہی اور اگر رہی بھی، تو ہر شخص کے مانگنے کی چیز نہ رہی۔ یہ ہیں اس کے متضاد اقوال۔

مرزا کے ذہنی بیمار ہونے کے ثبوت میں ایک قول اور ملاحظہ فرمایئے

''عرب صاحب نے سوال کیا کہ مسیح موعود کے متعلق قرآن میں کہاں کہاں ذکر ہے۔ فرمایا سورہ نور میں سورہ تحریم وغیرہ میں سورہ فاتحہ میں تو اھدنا الصراط المستقیم۔''

(ملفوظات ج ۳ ص ۳۸۵)

مرزا کے اس قول کا خلاصہ یہ نکلا کہ صراط مستقیم کا مصداق کل مرزا قادیانی ہے۔ نہ اس میں نبوت جاری ہونے کی خبر ہے نہ منعم علیہم گروہ کا راستہ اس کا مصداق ہے۔ جبکہ ایک طرف مرزا کے اخص الخاص مرید مسٹر محمد علی لاہوری کا کہنا یہ ہے کہ اس سے نبوت کا جاری سمجھنا یا اس پر استدلال کرنا حماقت وگمراہی ہے۔ اور قادیانی نبی کے چیلے اپنا یہ طنبورا بجاتے ہیں کہ اس سے تو کھلے طور پر بروزی نہیں بلکہ عام نبوت کا جاری ہونا ثابت ہوتا ہے۔ گویا جتنے منہ اتنی بات کا معاملہ ہے۔ جس کے جی میں جو آیا وہ بک دیا۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

یہاں پہ کچھ، وہاں پہ کچھ، اور کہیں کچھ
ہم ایسے داغ داغ چمن کے خلاف ہیں

بہرکیف۔ پہلے آپ قادیانی استدلال اور اس کے جوابات دیکھیں اس کے بعد حضرات مفسرین کی آیت سے متعلق آراء ملاحظہ فرمائیں۔

قادیانی استدلال۔

''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ ۶، ۷)

کہ اے اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے اپنی نعمت نازل کی۔ گویا ہم کو بھی وہ نعمتیں عطا فرما۔ جو پہلے لوگوں کو تو نے عطا فرمائیں۔ اب سوال ہوتا ہے کہ وہ نعمتیں کیا تھیں؟ قرآن مجید میں ہے۔ یاقوم اذکروا نعمة الله علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا۔ (المائدہ ۲۱) موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔ اے قوم! تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو۔ جب اس نے تم میں سے نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔ ثابت ہوا کہ نبوت اور بادشاہت وہ نعمتیں ہیں جو خدا تعالیٰ کسی قوم کو دیا کرتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی دعا سکھائی ہے اور خود ہی نبوت کو نعمت قرار دیا ہے۔ اور دعا کا سکھانا بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی قبولیت کا فیصلہ فرما چکا ہے۔ لہٰذا امت محمدیہ میں نبوت ثابت ہوئی۔ (تبلیغی پاکٹ بک ص ۲۶۰)

جواب نمبر ا۔

اس آیت میں منعم علیہم کی راہ پر چلنے اور منعم علیہم گروہ کی طرح استقامت کی راہ پر قائم رہنے کی دعا ہے نہ کہ نبی بننے کی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے طریق عمل کو نمونہ بنایا جائے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (احزاب ۲۱) کیونکہ جو ممکن انعامات ہیں، مثلاً ہر قسم کے انوار و برکات، محبت و یقین کامل، تائیدات سماویہ اور قبولیت، معرفت تامہ، عزیمت و استقامت وغیرہ کے انعام، جو امت محمدیہ کے لئے مقرر ہیں اسی راہ پر چلیں گے۔

۲- نعمت سے مراد نبوت کا ملنا نہیں۔ کیوں کہ یہ نعمت حضرت مریم علیہا السلام پر بھی نازل ہوئی "اُذْكُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ (المائدہ ۱۱۰) اے عیسیٰ میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تجھ پر اور تیری ماں پر کی۔ ایسا ہی زید ابن حارثہؓ پر انعام ہوا "اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ (الاحزاب ۳۷) اسی طرح سب مسلمانوں پر انعام الٰہی ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے "وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا" (آل عمران: ۱۰۳) ان سب مقامات پر نعمت ملنے کا ذکر ہے۔ لیکن اس سے نبوت لازم نہیں آتی اسی طرح زیر بحث آیت میں بھی نعمت سے مراد نبوت ملنا لازم نہیں۔

۳- نبوت دعاؤں سے نہیں ملا کرتی۔ اگر نبوت دعاؤں سے ملے تو نبوت کسبی ہو جائے گی۔ حالانکہ نبوت وہبی ہے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام: ۱۲۴) جیسا کہ مرزا قادیانی نے بھی نبوت کو وہبی تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے استدلال مرزا کے مسلمات کے خلاف ٹھہرا۔ مرزا نے لکھا ہے:

''نبوت کیا ہے ایک جوہر خداداد ہے۔ اگر کسب سے ہوتا تو سب بن جاتے ہی ہوجاتے'' (ملفوظات ص۲۵۹ ج۱)

۴۔ ''اِھْدِ نَا الصِّراطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' یہ دعاء نبی کریم ﷺ نے بھی مانگی بلکہ یہ دعاء مانگنا آپ ﷺ نے امت کو سکھلایا۔ لیکن یہ دعا آپ ﷺ نے اس وقت مانگی جب آپ ﷺ نبی منتخب ہو چکے تھے۔ قرآن مجید آپ ﷺ پر اترنا شروع ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ اس دعا سے نبی نہیں بنے تو پھر قادیانی عقائد و نظریات کے حساب سے اس دعا کا فائدہ کیا ہوا؟ علاوہ ازیں آپ ﷺ کا ہر نماز میں اِھْدِ نَا الصِّراطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے الفاظ سے دعا کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اس سے حصول نبوت مراد نہیں۔

۵۔ قادیانی فلسفہ کے مطابق اگر دعاء اور انبیاء کی پیروی سے آدمی نبی بن سکتا ہے تو کیا خدا کی پیروی سے خدا بن جائیگا؟ جیسا کہ خدا کا فرمان ہے اِنَّ ھٰذا صِراطِیْ مُسْتَقِیْماً فَاتَّبِعُوْہُ (انعام:۱۵۳) اور کیا گورنر کے راستہ پر چلنے والے کے لئے گورنر بن جانا لازم ہے؟ کیا مرزا کے راستہ پر چلنے والا مرزا بن جاتا ہے؟

وہ سنگ آج بھی حائل تمہاری راہ میں ہے
جسے ہٹانے چلے تھے، اسے ہٹا نہ سکے

۶۔ نبوت اور بادشاہت دونوں خدا کی نعمت ہیں جیسا کہ مرزائی استدلال میں بھی اعتراف کیا گیا ہے۔ تو مرزائی بتائیں کہ ان کے قول کے مطابق مرزا نبی تو بنا مگر بادشاہ نہ بنا تو کیا آدھی دعا قبول ہوئی؟ اور آدھی مردود؟

۷۔ شریعت اور کتاب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت بلکہ نعمت عظمیٰ ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ (بقرہ:۲۳۱) تو پھر قادیانیوں کے ہاں اس پر پابندی کیوں ہے؟ اگر دعا سے نبوت ملتی ہے تو پھر نعمت تامہ یعنی تشریعی نبوت ملنی چاہئیے تا کہ مکمل نعمت حاصل ہو حالانکہ مرزائی اس کے قائل نہیں۔

۸۔ مرزا قادیانی اس آیت کے تحت لکھتا ہے۔

"پس اس آیت سے بھی کھلے کھلے طور پر یہی ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ اس امت کو ظلی طور پر تمام انبیاء کا وارث ٹھہراتا ہے تا انبیاء کا وجود ظلی طور پر ہمیشہ باقی رہے اور دنیا اُن کے وجود سے کبھی خالی نہ ہو" (شہادت القرآن خ ص۳۵۲ ج۶)

اس آیت سے مراد مرزا قادیانی وہ ظلی نبی لیتا ہے جو ہمیشہ دنیا میں چلے آتے ہیں جن سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی۔ مگر مرزا کی امت، حضور ﷺ کے بعد اور مرزا سے پہلے کسی کو بھی نبی تسلیم نہیں کرتی۔ معلوم ہوا کہ مرزا کچھ کہتا ہے اور اسکی امت کچھ کہتی ہے۔ اب مرزائی خود فیصلہ کریں کہ وہ درست کہتے ہیں یا انکا حقیقی مرزا؟

تیری تضاد بیانی پہ کیا کہوں ناصح۔ پتہ نہیں ہے کہ تو کون سی ضمیر کا ہے

۹۔ مرزا سے پہلے تیرہ سو برس میں اگر کوئی نبی نہ بنا جیسا کہ مرزائیوں کا ماننا ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا کسی کی بھی دعا قبول نہ ہوئی؟ جس مذہب میں کروڑوں لوگوں کی دعا قبول نہ ہو وہ خیر امت نہیں کیسے ہوسکتی ہے؟۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر مرزائی کہیں کہ صرف مرزا کی دعا قبول ہوئی۔ تو پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر مرزا کے حق میں قبول ہوئی تو مکمل کیوں نہ قبول ہوئی؟ کیوں کہ بادشاہت اور نبوت مستقلہ بھی نعمت ہیں یہ دونوں نعمتیں مرزا کو کیوں نہ ملیں؟ مرزا میں وہ کون سی خامیاں تھیں جن کی وجہ سے مرزا کو ان نعمتوں سے محروم رکھا گیا؟

۱۰۔ اِھْدِنَا میں "نَا" ضمیر منصوب جمع ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی بنائے۔ اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے مرزا قادیانی کی بھی دعا قبول نہ کی۔ کیوں کہ اگر دعا قبول ہوئی ہوتی تو مرزا قادیانی کے سب پیروکاروں کو نبی ہونا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اور اگر سب نبی ہی بن جائیں تو سوال یہ ہے کہ پھر امتی کہاں سے آتے؟ کیا مرزائیوں میں سے کوئی نبوت چھوڑ کر امتی بننے کے لئے تیار ہے؟

۱۱۔ یہی دعا عورتوں کو بھی سکھائی گئی ہے۔ تو کیا وہ بھی منصب نبوت پر فائز ہو سکتی ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر یہ دعا انھیں کیوں سکھائی گئی ہے؟ اور اگر ہاں میں

ہے تو یہ تمہارے خلاف ہے۔

۱۴- اگر نبوت طلب کرنے کی دعا ہے تو غلام احمد قادیانی نبی بن جانے کے بعد یہ دعا کیوں مانگتا تھا۔ کیا اسے اپنی نبوت پر یقین نہ تھا؟۔

۱۳- مرزا قادیانی نے لکھا:

"اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" تو دل میں یہی ملحوظ رکھو کہ میں صحابہ اور مسیح موعود کی جماعت کی راہ طلب کرتا ہوں۔

(تحفہ گولڑویہ رو حانی خ ص ۲۱۸ ج ۱۷)

مسیح موعود کی پخ تو خود دجال (مرزا قادیانی) نے خود لگائی ہے لیکن "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کا معنی گویا یہ ہوا مرزا کی راہ طلب کرنا نہ کہ مرزا کی طرح مسیح موعود بننا۔ پس مرزا کے اس اقرار سے مرزائیوں کی دلیل کا مرزائیوں کے دلوں کی طرح خانہ خراب ہو گیا۔ اور یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت میں منعم علیہم کی نعمت طلب کرنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔ بلکہ ان کے رستے پر چلنے کی دعا سکھلائی گئی ہے۔ انبیاء کا راستہ شریعت و مذہب ہے کہ وہ اس کی پابندی اور اتباع کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ اگر نبوت طلب کرنے کی تعلیم دینی مقصود ہوتی تو "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" کی بجائے "اَعْطِنَا مَا اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" ہوتا۔

قابل غور ٹھوکر اور گرو، چیلا۔

"مرزائیوں کے لاہوری گروپ کے گرو مسٹر محمد علی لاہوری نے اپنی نام نہاد تفسیر "بیان القرآن" ص ۵ ج ۱، میں لکھا ہے۔

یہاں (منعم علیہم میں) نبی کا لفظ آ جانے سے بعض لوگوں کو یہ ٹھوکر لگی ہے کہ خود مقام نبوت بھی اس دعا کے ذریعہ سے مل سکتا ہے۔ اور گویا ہر مسلمان ہر روز بار بار مقام نبوت کو ہی اس دعا کے ذریعہ سے طلب کرتا ہے۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے اس لئے کہ نبوت محض موہبت ہے اور نبوت میں انسان کی جدوجہد اور اس کی سعی کو کوئی دخل نہیں۔ ایک وہ چیزیں ہیں جو موہبت سے ملتی ہیں اور ایک وہ جو انسان کی جدوجہد سے ملتی ہیں۔ نبوت اول میں سے ہے۔"

محمد علی لاہوری کا کہنا کہ ''بعض لوگوں کو ٹھوکر لگی، یہ اصولی غلطی ہے، یہ ٹھوکر کسی اور کو آج تک کبھی نہیں لگی یہ تو صرف اور صرف محمد علی کے چیف گرو مرزا قادیانی کو لگی اس اصولی غلطی اور ٹھوکر کا مرتکب صرف مرزا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مرزا کی تحریر ملاحظہ ہو

''افسوس کہ حال کے نادان مسلمانوں نے اپنے اس نبی مکرم کا کچھ قدر نہیں کیا اور ہر ایک بات میں ٹھوکر کھائی۔ وہ ختم نبوت کے ایسے معنی کرتے ہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو نکلتی ہے نہ تعریف۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس پاک میں افاضہ اور تکمیل نفوس کے لئے کوئی قوت نہ تھی اور وہ صرف خشک شریعت کو سکھلانے آئے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس اُمت کو یہ دعا سکھلاتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ پس اگر یہ اُمت پہلے نبیوں کی وارث نہیں اور اس انعام میں سے ان کو کچھ حصہ نہیں تو یہ دعا کیوں سکھلائی گئی'' (حقیقت الوحی خ ص ۱۰۴ ج ۲۲)

دعا سکھانے کا فلسفہ تو مسٹر محمد علی اپنے گرو مرزا جی سے سیکھیں۔ ہاں ہمیں یہ ضرور بتائیں کہ متضاد باتوں کو گرو اور چیلہ دونوں ٹھوکر قرار دے رہے ہیں۔ تو کون سچا ہے؟! کیا خوب کہا کہنے والے نے۔

تماشا بن گئے دنیا کی نظروں میں گرو، چیلا
چلے تھے جو جہاں سے تیرگی، شب مٹانے کو۔

ہاں لاہوریوں کی اس حیلہ تراشی کا کہ مرزا جی نبوت کے دعویدار نہیں، بلکہ صرف مسیح موعود ہونے کے مدعی ہیں بھی پردہ فاش ہو گیا۔ کیوں کہ مرزا تو اپنی نبوت منوانے پر اس طرح تلا ہوا ہے کہ وہ اس کے لئے تحریف قرآن تک سے باز نہیں آتا۔ اور لاہوری ہیں کہ اس کی بیجا پردہ پوشی کرتے پھرتے اور اس کی روح کو مزید تکلیف پہنچاتے ہیں۔

کیا فرماتے ہیں مفسرین:

تفسیر معارف القرآن: ص ۲۹ ج ۱

آخری تین آیتیں جن میں انسان کی دعا و درخواست کا مضمون ہے اور ایک خاص دعا کی تلقین ہے یہ ہیں: اهد نا الصراط المستقیم . صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ۔ جس کا ترجمہ یہ ہے: کہ "بتلادیجئے ہم کو راستہ سیدھا، راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا' نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا' اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوگئے"

ان تینوں آیات میں چند باتیں قابل غور ہیں: (موضوع کی مناسبت سے یہاں صرف دو ہی آیات سے متعلق تفصیلات ذکر کی جائیں گی۔ مرتب)

ہدایت کے معنی اور اس کے اقسام۔

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ صراط مستقیم کی ہدایت کے لئے دعاء جو اس آیت میں تعلیم فرمائی گئی ہے اس کے مخاطب جس طرح تمام انسان اور عام مؤمنین ہیں، اسی طرح اولیاء اللہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس کے مامور ہیں، جو بلاشبہ ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لے ہدایت کا سرچشمہ ہیں، پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دعاء مانگنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم کرنے پر موقوف ہے، اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، جس سے سوال مذکور کے علاوہ ان تمام اشکالات کا بھی جواب معلوم ہو جائیگا جو مفہوم ہدایت کے متعلق قرآن کریم کے بہت سے مقامات میں عموماً پیش آتے ہیں، اور ہدایت کی حقیقت سے نا آشنا قرآن کی بہت سی آیات میں باہمی تضاد و اختلاف محسوس کرنے لگتا ہے،

لفظ ہدایت کی بہترین تشریح امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں تحریر فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصلی معنی ہیں کسی شخص کو منزل مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا، اور ہدایت کرنا حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جس کے مختلف درجات ہیں،

ایک درجہ ہدایت کا عام ہے، جو کائنات ومخلوقات کی تمام اقسام جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ کو شامل ہے، یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ ان بے جان، بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام؟

کیونکہ قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ کائنات کی تمام اقسام اور ان کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے درجے کے موافق حیات واحساس بھی رکھتا ہے اور عقل وشعور بھی، یہ دوسری بات ہے کہ یہ جوہر کسی نوع میں کم کسی میں زیادہ ہے، اسی وجہ سے جن اشیاء میں یہ جوہر بہت کم ہے ان کو بے جان، بے شعور سمجھا اور کہا جاتا ہے، احکامِ الٰہیہ میں بھی ان کے ضعفِ شعور کا اتنا اثر آیا کہ ان کو احکام کا مکلف نہیں بنایا گیا، حیات کے آثار تو نمایاں ہیں، مگر عقل وشعور نمایاں نہیں، ان کو ذی حیات، جاندار مگر بے عقل وشعور کہا جاتا ہے، اور جن میں حیات کے ساتھ عقل وشعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں ان کو ذوی العقول کہا جاتا ہے، اور اسی اختلاف درجات اور عقل وشعور کی کمی بیشی کی وجہ سے تمام کائنات میں احکامِ شرعیہ کا مکلف صرف انسان اور جنات کو قرار دیا گیا ہے، کہ ان میں عقل وشعور مکمل ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسری انواع واقسام میں حیات واحساس یا عقل وشعور بالکل نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ" (سورۂ بنی اسرائیل: ۴۴)

"یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (قالاً یا حالاً) بیان نہ کرتی ہو، لیکن تم لوگ ان کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو"

اور سورۂ نور میں ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ.

یعنی کیا تجھ کو معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں، اور (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلائے ہوئے اڑتے پھرتے ہیں، سب کو اپنی اپنی دعاء اور تسبیح معلوم ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے"

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اس کی پاکی بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے، اور یہ علم بدون عقل شعور کے نہیں ہوسکتا اس لئے ان آیات سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کے اندر روح وحیات بھی ہے، اور اک واحساس بھی، عقل وشعور بھی، مگر بعض کائنات میں یہ جوہر اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اسکا احساس نہیں ہوتا، اسی لئے عرف میں ان کو بے جان یا بے عقل کہا جاتا ہے، اور اس بناء پر ان کو احکام شرعیہ کا مکلف بھی نہیں بنایا گیا، قرآن کا یہ فیصلہ اُس وقت کا ہے جب دنیا میں نہ کہیں کوئی فلسفی تھا، نہ کوئی فلسفہ مدوّن تھا، بعد میں آنے والے فلاسفروں نے بھی اپنے اپنے وقت میں اس کی تصدیق کی، قدیم فلاسفہ میں بھی اُس خیال کے کچھ لوگ گذرے ہیں، اور جدید فلاسفہ اور اہل سائنس نے تو پوری وضاحت کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے،

الغرض ہدایتِ خداوندی کا یہ درجۂ اولیٰ تمام مخلوقات: جمادات نباتات، حیوانات انسان اور جنات کو شامل ہے، اسی ہدایت عامہ کا ذکر قرآن کریم کی آیت اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی میں فرمایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس خلقت کے مناسب اس کو ہدایت دی، اور یہی مضمون سورۂ اعلیٰ میں ان الفاظ سے ارشاد ہوا:

"سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی الَّذِی خَلَقَ فَسَوّٰی. وَالَّذِی قَدَّرَ فَهَدٰی.

"یعنی آپ اپنے پروردگار عالی شان کی تسبیح کیجئے جس نے ساری مخلوقات کو بنایا، پھر ٹھیک بنایا، اور جس نے تجویز کیا، پھر راہ بتائی"

یعنی جس نے تمام مخلوقات کے لئے خاص خاص مزاج اور خاص خاص خدمتیں تجویز فرما کر ہر ایک کو اس کے مناسب ہدایت کردی،

اسی ہدایت عامہ کا نتیجہ ہے کہ کائناتِ عالم کے تمام انواع واصناف اپنا اپنا مقررہ فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہے ہیں، جو چیز جس کام کے لئے بنادی ہے وہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، حضرت مولانا رومیؒ نے اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

با من و تو مردہ، با حق زندہ اند

زبان سے نکلی ہوئی آواز کے معنی کا ادراک نہ ناک کر سکتی ہے نہ آنکھ، حالانکہ یہ زبان سے زیادہ قریب ہیں اس ادراک کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے کانوں کے سپرد کیا ہے، وہی زبان کی بات کو لیتے ہیں اور ادراک کرتے ہیں، دانائے روم نے خوب فرمایا ہے۔

مرزباں را مشتری جز گوش نیست

واقف این راز جز بے ہوش نیست

اسی طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کا کام نہیں لیا جاسکتا، ناک سے دیکھنے یا سننے کا کام نہیں لیا جاسکتا، سورہ مریم میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"وَإِن كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا" یعنی کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو نہ آوے رحمٰن کا بندہ ہوکر۔

دوسرا درجہ ہدایت کا اس کے مقابلے میں خاص ہے، یعنی صرف ان چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے جو عرف میں ذوی العقول کہلاتی ہیں، یعنی انسان اور جن، یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر انسان کو پہنچتی ہے، پھر کوئی اس کو قبول کر کے مؤمن و مسلم ہو جاتا ہے کوئی رد کر کے کافر ٹھہرتا ہے۔

تیسرا درجہ ہدایت کا اس سے بھی زیادہ خاص ہے کہ صرف مؤمنین و متقین کے ساتھ مخصوص ہے، یہ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ انسان پر فائض ہوتی ہے، اس ہدایت کا دوسرا نام توفیق ہے، یعنی ایسے اسباب اور حالات پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایات کا قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا آسان ہو جائے، اور ان کی خلاف ورزی

دشوار ہوجائے، اس تیسرے درجے کی وسعت غیر محدود اور اس کے درجات غیر متناہی ہیں۔ یہی درجہ انسان کی ترقی کا میدان ہے، اعمال صالحہ کے ساتھ ساتھ اس درجۂ ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے، کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس زیادتی کا ذکر ہے مثلاً وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ، جو شخص اللہ پر ایمان لائے اس کے دل کو ہدایت کردیتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی مزید ہدایت کردیتے ہیں"

یہی وہ میدان ہے جہاں ہر بڑے سے بڑا نبی و رسول اور ولی اللہ آخر عمر تک زیادتی ہدایت و توفیق کا طالب نظر آتا ہے، اسی مقام ہدایت کے متعلق مولانا رومیؒ نے فرمایا:

اے برادر بے نہایت در گہے ست
ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

اور سعدی شیرازیؒ نے فرمایا۔

نگویم کہ برآب قادر نیند
کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

درجات ہدایت کی اس تشریح سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے، اور اس کے مزید درجات عالیہ حاصل کرنے سے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغناء بھی نہیں، اسی لئے سورۂ فاتحہ کی اہم ترین دعاء ہدایت کو قرار دیا گیا، جو ایک ادنیٰ سے مؤمن کے لئے بھی مناسب حال ہے، اور بڑے سے بڑے رسول اور ولی کے لئے بھی اتنی ہی اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آخر عمر میں سورۂ فتح کے اندر فتح مکہ کے فوائد و ثمرات بتلاتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا کہ ویہدیک صراطاً مستقیماً، یعنی مکہ مکرمہ اس لئے آپؐ کے ہاتھوں فتح کرایا گیا تاکہ آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ہو ظاہر ہے کہ سید الانبیاء ﷺ پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے بھی ہدایت مجسم تھے، پھر اس موقع پر آپ کو ہدایت ہونے

کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ ہدایت کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپ کو اس وقت حاصل ہوا،

ہدایت کی اس تشریح سے آپ کے لئے فہم قرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہو گئے،

اوّل: یہ کہ قرآن میں کہیں تو ہدایت کو ہر مؤمن و کافر کے لئے بلکہ کل مخلوقات کیلئے عام فرمایا گیا ہے، اور کہیں اس کو محض متقین کے ساتھ مخصوص لکھا گیا جس میں ناواقف کو تعارض کا شبہ ہو سکتا ہے، ہدایت کے عام و خاص درجات معلوم ہونے کے بعد یہ شبہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے کہ ایک درجہ سب کو عام اور شامل ہے اور دوسرا درجہ مخصوص ہے،

دوسرا فائدہ: یہ ہے کہ قرآن میں ایک طرف تو جگہ جگہ یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمین یا فاسقین کو ہدایت نہیں فرماتے، اور دوسری طرف مکرر سکرر یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت فرماتے ہیں، اس کا جواب بھی درجات کی تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہدایت عامہ سب کو کی جاتی ہے، اور ہدایت کا تیسرا مخصوص درجہ ظالمین و فاسقین کو نصیب نہیں ہوتا،

تیسرا فائدہ: یہ ہے کہ ہدایت کے تین درجات میں سے پہلا اور تیسرا درجہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں کسی نبی یا رسول کا دخل نہیں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کا کام صرف دوسرے درجۂ ہدایت سے متعلق ہے،

قرآن کریم میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السلام کو ہادی قرار دیا ہے وہ اسی دوسرے درجے کے اعتبار سے ہے، اور جہاں یہ ارشاد ہے: اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ، یعنی آپ ہدایت نہیں کر سکتے جس کو چاہیں، تو اس میں ہدایت کا تیسرا درجہ مراد ہے یعنی توفیق دینا آپ کا کام نہیں،

الغرض اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ایک جامع اور اہم ترین دعاء ہے جو انسان کو سکھلائی گئی ہے، انسان کا کوئی فرد اس سے بے نیاز نہیں، دین اور دنیا دونوں میں صراط مستقیم کے بغیر فلاح و کامیابی نہیں، دنیا کی اُلجھنوں میں بھی صراطِ مستقیم کی دعاء نسخۂ اکسیر ہے مگر لوگ توجہ نہیں کرتے، ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا،

صراط مستقیم کونسا راستہ ہے؟ سیدھا راستہ وہ ہے جس میں موڑ نہ ہوں، اور مراد اس سے دین کا وہ راستہ ہے جس میں افراط اور تفریط نہ ہو، افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنا اور تفریط کے معنی کوتاہی کرنا، پھر اس کے بعد کی دو آیتوں میں اس صراط مستقیم کا پتہ دیا گیا ہے، جس کی دعاء اس آیت میں تلقین کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے صراط الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "یعنی راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا" اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ان کی تفصیل ایک دوسری آیت میں اس طرح آئی ہے: الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ۔ یعنی وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، مقبولان بارگاہ الہی کے یہ چار درجات ہیں، جن میں سب سے اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں، اور صدیقین وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی امت میں سب سے زیادہ رتبے کے ہوتے ہیں، جن میں کمالات باطنی بھی ہوتے ہیں، عرف میں ان کو اولیاء کہا جاتا ہے، شہداء وہ ہیں جنہوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دیدی، اور صلحاء وہ ہیں جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں، واجبات میں بھی مستحبات میں بھی، جن کو عرف میں نیک دیندار کہا جاتا ہے،

اس آیت میں پہلے مثبت اور ایجابی طریق سے صراط مستقیم کو متعین کیا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات جس راستے پر چلیں وہ صراط مستقیم ہے، اس کے بعد آخری آیت میں سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعیین کی گئی ہے، ارشاد ہے:

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

تفسیر ماجدی:۔

ترجمہ: چلا ہم کو سیدھا راستہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے ۱۸

۱۸۔ (باب ہدایت میں) یہ مزید شرح و تفسیر ہے اسی سیدھے راستہ یا صراط مستقیم کی۔ تعلیمات و ہدایات تو ساری کی ساری قرآن مجید کے لفظ و عبارت میں آگئیں۔

لیکن مشیت الٰہی نے مزید شفقت وکرم سے ان تعلیمات وہدایات کے عملی نمونے بھی انسانی روح وقالب میں بشری صورت وسیرت میں بکثرت بھیج دیئے کہ اس صراط مستقیم پر چلنا اور زیادہ آسان ہو جائے۔ یہ انعام پائے ہوئے لوگ انبیاء ومرسلین ہیں ان کی زندگی کے واقعات وحالات قرآن مجید میں بکثرت نقل ہوئے ہیں۔ اور ان میں بھی علی الخصوص اس پاکیزہ جماعت نے پاکیزہ ترین سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی سیرت مبارکہ کا ایک ایک جزئیہ تک محفوظ ہے۔ پھر اس کے بعد آپ کے جو صحیح نائب وجانشین آپ کے معاً بعد ہوئے ہیں اور پھر ہر دور میں ہوتے آئے ہیں۔ یعنی اولیاء امت یا صدیقین یا پھر شہیدان راہ حق اور عام صالحین کہ یہ بھی اپنے اپنے درجہ میں نمونہ کا کام اپنے بعد آنے والوں کے لئے دے سکتے ہیں۔ خود قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ ان انعام پائے ہوؤں کی فہرست کے خاص خاص عنوانات گنا دیئے ہیں۔ وَمَنْ یطع اللہ والرسول فاولٓئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبین والصدیقین والشہداء والصالحین (سورہ نساء) انعمت علیہم کے لفظ سے امام ابن جریر نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جن لوگوں کو یہ مرتبہ نصیب ہوا ہے اس کی تہ میں اصل شئی محض انعام الٰہی وفضل خداوندی ہے۔ وفی ھذہ الآیۃ دلیلٌ واضحٌ علٰی اَنّ طاعۃ اللہ جلّ ثناءہ لا ینالھا المُطیعون الاّ بانعام اللہ بھا علیھم وتوفیقہ ایّاھم لھا۔ مرشد تھانوی مدظلہ (رحمۃ اللہ علیہ۔ مرتب) نے فرمایا کہ الذین انعمت علیہم سے اشارہ اس طرف ہو گیا کہ صراط مستقیم میسر نہیں ہوتا بغیر اس کے کہ پیروی اہل صراط مستقیم کی کی جائے۔ اور اس کے لئے محض اوراق وکتب کافی نہیں۔

ترجمہ کنز الایمان

"ہم کو سیدھا راستہ چلا راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا"

تفسیر نعیمی:۔

اھدنا الصراط المستقیم معرفت ذات وصفات کے بعد عبادت اس کے بعد

دعا تعلیم فرمائی اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ بندے کو عبادت کے بعد مشغول دعا ہونا چاہیے، حدیث شریف میں بھی نماز کے بعد دعا کی تعلیم فرمائی گئی (الطبرانی فی الکبیر والبیہقی فی السنن) صراط مستقیم سے مراد اسلام یا قرآن یا خُلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضور کے آل واصحاب ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صراط مستقیم طریق اہل سنت ہے جو اہل بیت واصحاب اور سنت وقرآن وسواد اعظم سب کو مانتے ہیں۔ صراط الذین انعمت علیھم جملہ اولیٰ کی تفسیر ہے کہ صراط مستقیم سے طریق مسلمین مراد ہے اس سے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں کہ جن امور پر بزرگان دین کا عمل رہا ہو وہ صراط مستقیم میں داخل ہے۔

تفسیر ثنائی:۔

ترجمہ: ہمیں سیدھی راہ پر پہنچا۔ ان کی راہ پر جن پر تو نے انعام کیے۔

تفسیر:

ہمیں سیدھی راہ پر پہنچا(۱) اور اگر یہی ہے کہ جس پر ہم ہیں تو اسی پر ہمیں قائم رکھ اے ہمارے مولیٰ! ہماری یہ آرزو نہیں کہ جس راہ کو ہم ناقص العقل سیدھی سمجھیں یا ہمارے اور بھائی اچھی جانیں وہ دکھا حاشا وکلا۔ بلکہ ان بزرگوں کی راہ پر پہنچا جن پر تو نے بوجہ ان کی دینداری کے بڑے بڑے انعام کیے اور عطیات دیے اور مہربانیاں مبذول فرمائیں۔

حاشیہ (۱) اہدنا۔ یہ پہلا موقع قرآن کریم کا ہے کہ دعا کا اس میں ذکر آیا نہ صرف ذکر آیا بلکہ تعلیم کی گئی۔ قرآن مجید اور حدیث شریف سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ دعا جب دل کی توجہ سے کی جائے تو ضرور ہی قبول ہوتی ہے۔ قرآن شریف میں تو صریح ارشاد ہے اجیب دعوۃ الداع اذا دعانی۔ یعنی پکارنے والا جب مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں قبول کرتا ہوں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ خدا ایسا جواد ہے کہ دعا گو بندے کے ہاتھ خالی پھیرنے سے اسے شرم آتی ہے۔ اس مضمون کی آیات اور احادیث کثیر التعداد ہیں۔ جملہ اہل اسلام بلکہ جمہور انام بھی اس امر پر متفق ہیں اور عقل بھی اسی کی مقتضی ہے کہ ایک عاجز بندہ جو اپنے خدا کو سب طاقتوں کا مالک جان کر اس سے اپنے ارادوں کے پورا ہونے میں امداد چاہتا ہے تو ایسے وقت میں اس عاجز بندے کی حاجت روائی نہ کرنا ایک قسم کا بخل ہے۔ جبکہ انسانی طبائع کا تقاضا ہے کہ اگر کسی سائل کا سوال الحاح کو پہنچتا ہے تو طبیعت انسانی اس کی حاجت روائی پر متوجہ ہوتی ہے۔ حالانکہ انسانی طبائع میں بخل بھی

ہے۔ پھر جو ذات ستودہ صفات بخل اور امساک سے مبرا ہو اس کا یہ تقاضا ہو کہ سائل کے سوال پر متوجہ ہو تو اس سے زیادہ بخل کیا ہوگا " تعالی اللہ عن ذالک علوا کبیرا۔ یسئلہ من فی السموات والارض کل یوم ہو فی شان فبای الاء ربکما تکذبان۔ یہی وجہ ہے کہ سب لوگ بالطبع تکلیف کے وقت اس فعل پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے شغل سے اپنی حاجت روائی کی امید رکھتے ہیں۔ مگر اس زمانہ کے محقق سرسید احمد خان اس امر میں نہ صرف اہل اسلام بلکہ جملہ انام سے مخالف ہو بیٹھے ہیں اور قبولیت دعاء کے وہ معنی نہیں مانتے جو سب لوگ مانتے ہیں چنانچہ اپنی تفسیر کی پہلی جلد کے صفحہ ۱۰۰ پر یوں رقم طراز ہیں۔

" دعا جب دل سے کی جاتی ہے بیشہ مستجاب ہوتی ہے مگر لوگ دعا کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کیلئے ہم دعا کرتے ہیں۔ دعا کرنے سے وہ مطلب حاصل ہو جائے گا۔ اور استجابت کے معنی اس مطلب کا حاصل ہو جانا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے حصول مطلب کے لئے جو اسباب خدا نے مقرر کئے ہیں وہ مطلب تو انہیں اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر دعا نہ تو اس مطلب کے اسباب سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے بلکہ وہ اس قوت کو تحریک کرنے والی ہے جس سے اس رنج و مصیبت اور اضطراب میں جو مطلب کے نہ حاصل ہونے سے ہوتا ہے تسکین دینے والی ہے"

ناظرین غور کریں کہ سرسید کی کس قدر جرأت ہے اور مجھے ہمیشہ ان کی جرأت پر تعجب ہوا کرتا ہے کہ تمام جہان کے مقابلہ پر خم ٹھونک کر کھڑے تو ہو جاتے ہیں مگر اس کے سامان مہیا نہیں کرتے۔ کوئی دلیل قوی تو کجا ضعیف بھی اپنے دعوے پر پیش نہیں کرتے۔ بتلا دیں تو اس مسئلہ میں جو سب لوگوں کے خلاف رائے ظاہر کی تو اس کی کوئی دلیل بھی بیان کی ہے؟ نہیں معلوم اپنے آپ کو معصوم واجب الاتباع جانتے ہیں کہ جو کچھ کہیں امت پر اس کا ماننا فرض ہو جائیگا۔ ہمارے خیال میں سرسید کا یہ کہنا تو صحیح ہے کہ دعا اس مطلب کے اسباب میں سے نہیں مگر یہ فرمانا کہ نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے بالکل غلط ہے۔ ہم حسب درخواست سید صاحب تفسیر القرآن بالقرآن (سرسید نے بجواب مولوی مہدی علی صاحب درخواست کی ہوئی ہے کہ آپ اپنے مطلب پر دلیل عقلی یا نقلی ضرور پیش کریں اور دلیل نقلی کی تعریف سید صاحب نے یہ کی ہے کہ تفسیر القرآن بالقرآن ہو" دیکھو تہذیب الاخلاق بابت رمضان ۱۲۹۱ھ صفحہ ۲۵۳") کی ایک آیتیں بتلاتے ہیں۔ جن سے سرسید کے اس بیان کی غلطی ناظرین نیز سید صاحب پر پورے طور سے منکشف ہو جائیگی۔ اس مطلب کو بہت سی جگہ اللہ تعالی نے بیان کیا ہے کہ انبیاء سابقین نے جب تنگ آ کر دعا کی تو ہم نے فوراً ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی نسبت فرمایا۔ فدعا ربہ انی مغلوب فانتصر۔ ففتحنا ابواب السماء بماء منھمر وفجرنا الارض عیونا فالتقی الماء علی امر قد قدر۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ ف کو جس کا ترجمہ پس ہے جب پہلے کلام پر تفریع لاتے ہیں تو پہلا کلام پچھلے کے لئے سبب ہوتا ہے جیسے سبنی زید فضربتہ مجھے زید نے گالی دی تو میں نے اسے مارا اس سے صاف ظاہر ہے کہ گالی دینا پیٹنے کے لئے سبب ہے۔ اسی طرح اس آیت میں فدعا ربہ۔ ففتحنا کے لئے علت ہے جس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بارش کے لئے یا کم سے کم بارش کے اسباب جمع کرنے کے لئے سبب تھی۔ گو کفار کی ہلاکت کے اسباب کچھ اور ہی ہوں۔ مگر اس میں تو شک نہیں کہ ان اسباب کو جمع کرنے میں دعاء کو بھی دخل ہے ورنہ فاء لا کر ففتحنا فرمانا بے معنی ہے۔ (نوٹ اپنے استدلال پر متعدد آیتیں مولانا امرتسری نے پیش فرمائی ہیں تفصیل کے لئے اصل کی طرف رجوع کیا جائے۔ مرتب)

تفہیم القرآن۔ (ص ۳۵ ج ا، مطبوعہ لاہور)

ترجمہ: ہمیں سیدھا راستہ دکھا (۸) ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں (۹)

تفسیر:۔

(۸) یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہمیں بتا جو بالکل صحیح ہو جس میں غلط بینی اور غلط کاری پر بد انجامی کا خطرہ نہ ہو جس پر چل کر ہم سچی فلاح وسعادت حاصل کر سکیں۔ یہ ہے وہ درخواست جو قرآن کا مطالعہ شروع کرتے ہوئے بندہ اپنے خدا کے حضور پیش کرتا ہے۔ اس کی گذارش یہ ہے کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ قیاسی فلسفوں کی اس بھول بھلیاں میں حقیقت نفس الامری کیا ہے، اخلاق کے ان مختلف نظریات میں صحیح نظام اخلاق کون سا ہے، زندگی کی ان بے شمار پگڈنڈیوں کے درمیان فکر وعمل کی سیدھی اور صاف شاہراہ کون سی ہے۔ (۹) یہ اس سیدھے راستے کی تعریف ہے جس کا علم ہم اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں۔ یعنی وہ راستہ جس پر ہمیشہ سے تیرے منظور نظر لوگ چلتے رہے ہیں۔ وہ بے خطا راستہ کہ قدیم ترین زمانہ سے آج تک جو شخص اور جو گروہ بھی اس پر چلا وہ تیرے انعامات کا مستحق ہوا اور تیری نعمتوں سے مالا مال ہو کر رہا۔

جامع البیان للطبری، (ص ۱۰۶۔۱۱۵، ج ۱)

قال أبو جعفر: ومعنى قوله: ﴿ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾ في هذا الموضع عندنا: وفّقنا للثبات عليه، كما رُوي ذلك عن ابن عباس.

۱۴۶۔ حدثنا أبو كريب، قال: حدثنا عثمان بن سعيد، قال: حدثنا بشر بن عمارة، قال: حدثنا أبو روق، عن الضحاك، عن عبد الله بن

عباس ، قال قال جبريل لمحمد : "قل يا محمد اهدنا الصراط المستقيم " يقول ألهمنا الطريق الهادي.

وإلهامه إياه ذلك هو توفيقه له كالذي قلنا في تأويله . و معناه نظير معنى قوله : ﴿ إياك نستعين ﴾ في أنه مسألة العبد ربه التوفيق للثبات على العمل بطاعته ، وإصابة الحق والصواب فيما أمره به و نهاه عنه فيما يستقبل من عمره دون ما قد مضى من أعماله و تقضى فيما سلف من عمره ، كما في قوله : ﴿إياك نستعين﴾ مسألة منه ربه المعونة على أداء ما قد كلفه من طاعته فيما بقي من عمره . فكان معنى الكلام : اللهم إياك نعبد وحدك لا شريك لك ، مخلصين لك العبادة دون ما سواك من الآلهة والأوثان ، فأعنا على عبادتك ، ووفقنا لما وفقت له من أنعمت عليه من أنبيائك وأهل طاعتك من السبيل والمنهاج .

فإن قال قائل: وأنى وجدت الهداية في كلام العرب بمعنى التوفيق ؟ قيل له. ذلك في كلامها أكثر وأظهر من أن يحصى عدد ما جاء عنهم في ذلك من الشواهد ، فمن ذلك قول الشاعر:

لا تَحْرِمَنِّي هَدَاكَ اللهُ مَسْأَلَتِي ولا أكُونَنْ كَمَنْ أَوْدَى بِهِ السَّفَرُ

يعني به: وفقك الله لقضاء حاجتي. ومنه قول الآخر:

وَلا تُعَجِلَنِّي هَدَاكَ المَلِيكُ فإنَّ لِكُلِّ مَقامٍ مَقَالَا

فمعلوم أنه إنما أراد : وفقك الله لإصابة الحق في أمري . ومنه قول الله جل ثناؤه : ﴿ وَاللهُ لا يَهْدِي القَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴾ في غير آية من تنزيله. وقد علم بذلك أنه لم يعن أنه لا يبين للظالمين الواجب عليهم من فرائضه. و كيف يجوز أن يكون ذلك معناه ، وقد عم بالبيان جميع المكلفين من خلقه ؟ ولكنه عنى جل وعز، أنه لا يوفقهم، ولا يشرح للحق والإيمان صدورهم .

وقد زعم بعضهم أن تأويل قوله: ﴿ اهدنا ﴾ زدنا هداية .وليس يخلو هذا القول من أحد أمرين : إما أن يكون قائله قد ظن أن النبي صلى الله عليه وسلم أمر بمسألة ربه الزيادة في البيان ، أو الزيادة في المعونة و التوفيق . فإن كان ظن أنه أمر بمسألة الزيادة في البيان فذلك ما لا وجه له ؛ لأن الله جل ثناؤه

لا يكلف عبداًفرضاً من فرائضه إلا بعد تبيينه له وإقامة الحجة عليه به. ولو كان معنى ذلك معنى مسألته البيان ، لكان قد أمر أن يدعو ربه أن يبين له ما فرض عليه ، وذلك من الدعاء خلف؛ لأنه لا يفرض فرضاًإلا مبيناً لمن فرض عليه ، أويكون أمرأن يدعوربه أن يفرض عليه الفرائض التي لم يفرضها . وفي فساد وجه مسألة العبد ربه ذلك ما يوضح عن أن معنى : ﴿ اهْدِنا الصِّرَاطَ المُسْتَقِيم﴾ غير معنى بين لنا فرائضك وحدودك، أويكون ظن أنه أمر بمسألة ربه الزيادة في المعونة والتوفيق . فإن كان ذلك كذالك ، فلن تخلو مسألته تلك الزيادة من أن تكون مسألة للزيادة في المعونة على ما قد مضى من عمله ، أو على ما يحدث . وفي ارتفاع حاجة العبد إلى المعونة على ما قد تقضّى من عمله ما يعلم أن معنى مسألة تلك الزيادة إنما هو مسألته الزيادة لما يحدث من عمله . و إذا كان ذلك كذلك صارالأمر إلى ما وصفنا و قلنا في ذلك من أنه مسألة العبد ربه التوفيق لأداء ما كلف من فرائضه فيما يستقبل من عمره . وفي صحة ذلك فساد قول أهل القدر الزاعمين أن كل مأمور بأمر أو مكلف فرضاً ، قد أعطي من المعونة عليه ما قد ارتفعت معه في ذلك الفرض حاجته إلى ربه ؛ لأنه لو كان الأمرعلى ما قالوا في ذلك لبطل معنى قول الله جلّ ثناؤه: ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ اهْدِنا الصِّرَاطَ المُسْتَقِيم ﴾ وفي صحة معنى ذلك على ما بينا فساد قولهم .

وقد زعم بعضهم أن معنى قوله :﴿ اهْدِنا الصِّرَاطَ المُسْتَقِيم ﴾ : أسلكنا طريق الجنّة في المعاد ، أي قدمنا له وامض بنا إليه ،كما قال جلّ ثناؤه : ﴿فَاهْدُوهُم إِلَى صِرَاطِ الجَحِيم﴾ أي أدخلوهم النار؛كما تهدى المرأة إلى زوجها، يعني بذلك أنها تدخل إليه، وكما تهدى الهدية إلى الرجل، وكما تَهدي الساقَ القدم ؛ نظير قول طرفة بن العبد :

لعبتْ بعدي السُّيُولُ به وجَرَى في رَوْنَقٍ رِهَمُه
للفتى عَقْلٌ يَعِيشُ به حَيْثُ تَهْدِى ساقَهُ قَدَمُه

أي ترد به الموارد وفي قول الله جلّ ثناؤه : ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ ما ينبئ عن خطأ هذا التأويل مع شهادة الحجة من المفسرين على تخطئته ، وذلك أن جميع المفسرين من الصحابة والتابعين مجمعون على أنّ معنى "الصراط" في هذا الموضع غير المعنى الذي تأوله قائل هذا القول ، وأن قوله : ﴿ إياك نَسْتَعِينُ ﴾ مسألة العبد ربه المعونة على عبادته ، فكذلك قوله "اهدنا" إنما هو مسألة الثبات على الهدى فيما بقي من عمره و العرب تقول : هديت فلاناً الطريق ، و هديته للطريق ، وهديته إلى الطريق : إذا أرشدته إليه وسددته له ، وبكل ذلك جاء القرآن ، قال الله جلّ ثناؤه: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا ﴾ وقال في موضع آخر ﴿ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ وقال : ﴿ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾ و كل ذلك فاشٍ في منطقها موجود في كلامها ، من ذلك قول الشاعر :

أَسْتَغْفِرُ اللهَ ذَنْباً لَسْتُ مُحْصِيَهُ ... رَبَّ العِبَادِ إِلَيْهِ الوَجْهُ و العَمَلُ

يريد: أستغفر الله لذنب ، كما قال جلّ ثناؤه : ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ ﴾

ومنه قول نابغة بني ذبيان:

فَيَصِيدُ نَا العَيْرَ المُدِلَّ بِحُضْرِهِ ... قَبْلَ الوَنَى والأَشْعَبَ النَّبَّاحا

يريد: فيصيد لنا. وذلك كثير في أشعارهم وكلامهم ، وفيما ذكرنا منه كفاية .

القول في تأويل قوله تعالى ﴿ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾

قال أبو جعفر: أجمعت الأمة من أهل التأويل جميعاً على أن الصراط المستقيم هو الطريق الواضح الذي لا اعوجاج فيه. وكذلك ذلك في لغة جميع العرب، فمن ذلك قول جرير بن عطية الخطفي:

أَمِيرُ المُؤمِنِينَ على صِرَاطٍ ... إذا اعوَجَّ المَوَارِدُ مُسْتَقِيمِ.

يريد على طريق الحق .ومنه قول الهزلي أبي ذؤيب :

صَبَحْنا أرضَهُم بالخَيْلِ حتى ... تركْناها أَدَقَّ مِنَ الصِّرَاطِ.

ومنه قول الراجز:

فَصُدَّ عَنْ نَهْجِ الصِّرَاطِ المقاصِيد

والشواهد على ذلك أكثر من أن تحصى ، وفيما ذكرنا غنى عما تركنا

ثم تستعير العرب الصراط فتستعمله في كل قول وعمل وصف باستقامة أو اعوجاج، فتصف المستقيم باستقامته، والمعوج باعوجاجه

والذي هو أولى بتأويل هذه الآية عندي، أعني: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ أن يكونا معنيا به. وفقنا للثبات على ما ارتضيته و وفقت له من أنعمت عليه من عبادك، من قول وعمل. وذلك هو الصراط المستقيم، لأن من وفق لما وفق له من أنعم الله عليه من النبيين و الصديقين و الشهداء، فقد وفق للاسلام، وتصديق الرسل، والتمسك بالكتاب، والعمل بما أمر الله به، والانزجار عما جزره عنه، واتباع منهج النبي ﷺ، ومنهاج أبي بكر و عمر وعثمان وعليّ، وكل عبد لله صالح. وكل ذلك من الصراط المستقيم.

وقد اختلفت تراجمة القرآن في المعني بالصراط المستقيم، يشمل معاني جميعهم في ذلك ما اخترنا من التأويل فيه.

ومما قالته في ذلك، ماروي عن عليّ بن أبي طالب رضي الله عنه، عن النبي ﷺ انه قال و ذكر القرآن فقال: "هُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ"

۱۲۸ـ حدثنا بذلك موسى بن عبدالرحمن المسروقي قال: حدثنا حسين الجعفي، عن حمزة الزيات، عن أبي المختار الطائي، عن ابن أخي الحارث، عن الحارث، عن علي، عن النبي ﷺ.

ـ وحدثنا عن إسماعيل بن أبي كريمة، قال: حدثنا محمد بن سلمة، عن أبي سنان، عن عمرو بن مرة، عن أبي البختري، عن الحارث، عن علي، عن النبي ﷺ مثله.

ـ وحدثنا أحمد بن إسحاق الأهوازي، قال: حدثنا أبو أحمد الزبيري، قال: حدثنا حمزة الزيات، عن أبي المختار الطائي، عن إبن أخي الحارث الأعور، عن الحارث، عن علي، قال: الصراط الْمُسْتَقِيمُ كتاب الله تعالىٰ

۱۲۸ـ حدثنا أحمد بن إسحاق الأهوازي، قال: حدثنا أبو أحمد الزبيري، قال: حدثنا سفيان ح. وحدثنا محمد بن حميد الرازي، قال: حدثنا مهران، عن سفيان، عن منصور عن أبي وائل، قال: قال عبدالله: "الصراط المستقيم كتاب الله"

۱۲۹ـ حدثني محمود بن خداش الطالقاني، قال: حدثنا حميد بن عبد

الرحمٰن الرؤاسي ، قال . حدثنا علي والحسن ابنا صالح جميعاً ، عن عبد الله بن محمد بن عقيل، عن جابر بن عبد الله: ﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾ قال: الإسلام، قال : هو أوسع مما بين السماء والأرض .

۱۵۰ ـ حدثنا أبو كريب ، قال : حد ثنا عثمان بن سعيد ، قال : حدثنا بشر بن عمار ، قال : حدثنا أبو روق عن الضحاک ، عن عبد الله بن عباس ، قال : قال جبريل لمحمد : قل يا محمد : اهدنا الصراط المستقيم ، يقول ألهمنا الطريق الهادي وهو دين الله الذي لا عوج له .

۱۵۱ ــ وحدثنا موسیٰ بن سهل الرازی ، قال :حدثنا يحي بن عوف، عن الفرات بن السائب ، عن ميمون بن مهران ، عن ابن عباس في قوله : ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ قال : ذلک الإسلام .

۱۵۲ ــ وحدثني محمود بن خداش ، قال : حدثنا محمد بن ربيعة الكلابي،عن إسماعيل الأزرق ، عن أبي عمر البزار ، عن ابن الحنفية في قوله : ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ قال: هو دين الله الذي لا يقبل من العباد غيره.

۱۵۳ ــ وحدثني موسى بن هارون الهمداني، قال: حدثنا عمرو بن طلحة القناد ، قال: حدثنا أسباط ، عن السدي في خبر ذكره عن أبي مالک ، وعن أبي صالح عن ابن عباس ، وعن مرة الهمداني ، عن ابن مسعود ، وعن أناس من أصحاب النبي ﷺ : ﴿ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾ قال : هو الإسلام.

۱۵۴ ــ وحدثنا القاسم بن الحسن، قال: حدثنا الحسين بن داود ، قال: حدثني حجاج عن ابن جريج، قال: قال ابن عباس في قوله: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ قال : الطريق .

۱۵۵ ـ حدثنا عبد الله بن كثير أبو صديف الآملي ، قال :حدثنا هاشم بن القاسم ، قال :حدثنا حمزة بن أبي المغيرة ، عن عاصم ، عن أبي العالية في قوله :﴿ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ قال : هو رسول الله ﷺ وصاحباه من بعده : أبو بكر وعمر. قال : فذكرت ذلک للحسن ، فقال: صدق أبو العالية ونصح.

۱۵۶ ــ وحدثني يونس بن عبد الأعلى ، قال : حدثنا ابن وهب ، قال : قال عبد الرحمٰن بن زيد بن أسلم : ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ قال : الإسلام.

۱۵۷ـ حدثنا المثنى قال: حدثنا أبو صالح ـ قال. حدثني معاوية بن صالح أن عبد الرحمن بن جبير، حدثه عن أبيه، عن نواس بن سمعان الأنصاري، عن رسول الله ﷺ قال: "ضرب الله مثلاً صراطاً مستقيماً" والصراط: الإسلام.

ـحدثنا المثنى، قال: حدثنا آدم العسقلاني، قال: حدثنا الليث عن معاوية بن صالح، عن عبدالرحمن بن جبير بن نفير، عن أبيه عن نواس بن سمعان الأنصاري، عن النبي ﷺ بمثله.

قال أبو جعفر: وإنما وصفه الله بالاستقامة، لأنه صواب لا خطأ فيه. وقد زعم بعض أهل الغباء أنه سماه مستقيماً لاستقامته بأهله إلى الجنة: وذلك تأويل لتأويل جميع أهل التفسير خلاف، وكفى بإجماع جميعهم على خلافه دليلاً على خطئه. القول في تأويل قوله تعالى:

﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾

وقوله: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ إبانة عن الصراط المستقيم أي الصراط هو، إذ كان كل طريق من طرق الحق صراطاً مستقيماً، فقيل لمحمد ﷺ: قل يا محمد: اهدنا يا ربنا الصراط المستقيم، صراط الذين أنعمت عليهم، بطاعتك وعبادتك من ملائكتك، وأنبيائك، والصديقين، والشهداء، والصالحين. وذلك نظير ما قال ربنا جلّ ثناؤه في تنزيله: ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا وَإِذًا لَآتَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا. وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ قال أبو جعفر: فالذي أمر محمد ﷺ وأمته أن يسألوه ربهم من الهداية للطريق المستقيم، هي الهداية للطريق الذي وصف الله جلّ ثناؤه صفته. وذلك الطريق هو طريق الذي وصفهم الله بما وصفهم به في تنزيله، ووعد من سلكه فاستقام فيه طائعاً لله ولرسوله ﷺ أن يورده مواردهم، والله لا يخلف الميعاد. وبنحو ما قلنا في ذلك روي الخبر عن ابن عباس وغيره.

۱۵۸ـ حدثنا محمد بن العلاء، قال: حدثنا عثمان بن سعيد، قال: حدثنا بشر بن عمار، قال: حدثنا أبو روق، عن الضحاك، عن ابن عباس: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ يقول: طريق من أنعمت عليهم بطاعتك و

عبادتك من الملئكة والنبيين والصديقين والشهداء والصالحين الذين أطاعوك وعبدوك.

١٥٩ ـ وحدثني أحمد بن حازم الغفاري، قال: أخبرنا عبيد الله بن موسى، عن أبي جعفر عن ربيع: ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ قال: النبيون.

١٦٠ ـ وحدثني القاسم قال: حدثنا الحسين، قال: حدثني حجاج عن ابن جريج، قال: قال ابن عباس: ﴿ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ قال: المؤمنين.

١٦١ ـ وحدثنا القاسم، قال: حدثنا الحسين، قال: قال وكيع ﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾: المسلمين.

١٦٢ ـ وحدثني يونس بن عبدالأعلى، قال: أخبرنا ابن وهب، قال: قال عبد الرحمن بن زيد في قول الله: ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ قال: النبي ﷺ ومن معه.

قال أبو جعفر: وفي هذه الآية دليل واضح على أن طاعة الله جل ثناؤه لاينالها المطيعون إلا بإنعام الله بها عليهم وتوفيقه إياهم لها. أوَلا يسمعونه يقول: ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ فأضاف كل ما كان منهم من اهتداء وطاعة وعبادة إلى أنه إنعام منه عليهم؟

فإن قال قائل: وأين تمام هذا الخبر، وقد علمت أن قول القائل لآخر: أنعمت عليك، مقتض الخبر عما أنعم به عليه. فأين ذلك الخبر في قوله: ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ وما تلك النعمة التي أنعمها عليهم؟ قيل له: قد قدمنا البيان فيما مضى من كتابنا هذا عن اجتزاء العرب في منطقها ببعض من بعض إذا كان البعض الظاهر دالاً على البعض الباطن وكافياً منه فقوله: ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ من ذلك؛ لأن أمر الله جل ثناؤه عباده بمسألته المعونة وطلبهم منه الهداية للصراط المستقيم لما كان متقدماً قوله: ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ الذي هو إبانة عن الصراط المستقيم، وإبدال منه، كان معلوماً أن النعمة التي أنعم الله بها على من أمرنا بمسألته الهداية لطريقهم هو المنهاج القويم والصراط المستقيم الذي قد قدمنا البيان عن تأويله آنفاً، فكان ظاهر ما ظهر من ذلك مع قرب تجاور الكلمتين مغنياً عن تكراره كما قال نابغة بني ذبيان:

كأنك من جمالِ بني أُقَيشٍ يُقعقعُ خلفَ رجليه بشنّ

يريد كأنك من جمال بني أقيش جمل يقعقع خلف رجليه بشن فاكتفى بما ظهر من ذكر الجمال الدال على المحذوف من اظهار ما حذف . وكما قال الفرزدق بن غالب :

ترى أرباقهم متقلّديها اذا صدئ الحديدُ على الكُماةِ

يريد متقلد يها هم ، فحذف "هم" اذا كان الظاهر من قوله: "أرباقهم" دالاً عليها . والشواهد على ذلك من شعر العرب وكلامها أكثر من أن تحصى ، فكذلك ذلك في قوله : ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ .

تفسیر کشاف۔

صراط الذين انعمت عليهم بدل من الصراط المستقيم وهو في حكم تكرير العامل كانه قيل : اهدنا الصراط المستقيم ' اهدنا صراط الذين انعمت عليهم كما قال. للذ ين استضعفوا لمن آمن منهم .فان قلت ما فائدة البدل؟ وهلا قيل اهد نا صراطَ الذين انعمت عليهم ؟ قلت : فائدته التوكيد لما فيه من التثنية و التكرير والاشعار بان الطريق المستقيم بيانه وتفسيره صراط المسلمين ليكون ذلك شهادة لصراط المسلمين بالاستقامة على ابلغ وجه وآكده كما تقول : هل ادلك على اكرم الناس و افضلهم فلان فيكون ذالك ابلغ في وصفه بالكرم والفضل من قولك : هل ادلك على فلان الاكرم الافضل ' لانك ثنيت ذكره مجملاً اوّلاً ومفصلاً ثانياً و اوقعت فلاناً تفسيراً و ايضاحاً للاكرم الافضل فجعلته عَلَماً في الكرم و الفضل ' فكانك قلت : من اراد رجلا جا معاً للخصلتين فعليه بفلان فهو المشخص المعين لاجتماعهما فيه غير مدافع ولا منازع ' والذين انعمت عليهم هم المؤ منون . واطلق الانعام ليشمل كل انعام لان من انعم الله عليه بنعمة الاسلام لم تبق نعمة الا اصابته واشتملت عليه . وعن ابن عباس هم اصحاب موسىٰ قبل ان يغيروا ' وقيل هم الانبياء.وقرأ ابن مسعود ﴿صراط﴾ من ﴿انعمت عليهم﴾

تفسیر معالم التنزیل۔(ص ۱۲ ج ۱)

قوله : ﴿إهدنا الصراط المستقيم﴾ ، اهدنا: أرشدنا، وقال علي وأبي بن كعب : ثبتنا ، كما يقال للقائم : قم حتى أعود إليك ، أي : دم على ما أنت عليه ، وهذا الدعاء من المؤمنين مع كونهم على الهداية ، بمعنى التثبيت وبمعنى طلب مزيد الهداية ، لأن الالطاف والهدايات من الله تعالىٰ لاتتناهى على مذهب أهل السنة.

﴿ الصراط﴾ : وصراط قُرىء بالسين رواه أويس عن يعقوب وهو الأصل سمي سراطاً لأنه يسرط السابلة ، ويُقرأ بالزاي وقرأ حمزة بإشمام الزاي وكلها لغات صحيحة ، والاختيار الصاد عند أكثر القراء لموافقة المصحف.

والصراط المستقيم : قال ابن عباس وجابر: هو الإسلام وهو قول مقاتل ، وقال ابن مسعود : هو القرآن ، وروي عن علي مرفوعاً "الصراط المستقيم كتاب الله" وقال سعيد بن جبير : طريق الجنة ، وقال سهل بن عبدالله : طريق السنة والجماعة ، وقال بكر بن عبد الله المزني : طريق رسول الله ﷺ ، وقال أبو العالية والحسن : رسول الله وآله وصاحباه ، وأصله في اللغة الطريق الواضح،

﴿صراط الذ ين أنعمت عليهم﴾ أي : مننت عليهم ، بالهداية والتوفيق، قال عكرمة : مننت عليهم بالثبات على الإيمان والاستقامة وهم الأنبياء عليهم السلام ، وقيل : هم كل من ثبته الله على الإيمان من النبيين والمؤمنين الذين ذكر الله تعالىٰ في قوله :﴿ فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين﴾ الآية، وقال ابن عباس: هم قوم موسى وعيسى عليهما السلام قبل أن غيّروا دينهم ، وقال عبدالرحمن : هم النبي ومن معه ، وقال أبو العالية : هم الرسول ﷺ وأبو بكر وعمررضي الله عنهما ، وقال عبدالرحمن بن زيد ان : رسول الله ﷺ وأهل بيته ، وقال شهرُ بن حوشب : هم أصحاب رسول الله ﷺ وأهل بيته ؛ قرأ حمزة "عليهم ولديهم واليهم" بضم ها آتها، ويضم يعقوب كل هاء قبلها ياء ساكنة تثنية

وجمعاً إلا قوله :﴿ بين أيديهنّ وأرجلهن ﴾ وقرأ الآخرون بكسرهما ، فمن ضم الهاء ردها إلى الأصل لأنها مضمومة عند الانفراد ، ومن كسرها فلأجل الياء الساكنة والياء أخت الكسرة ، وضم ابن كثير وأبو جعفر كل ميم جمع مشبعاً في الوصل إذا لم يلقها ساكن ، فإن لقيها ساكن فلا يُشبع، ونافع بخير ، ويضم ورش عند ألف القطع ، وإذا تلقته ألف وصل وقبل الهاء كسر أو ياء ساكنة ضم الهاء والميم حمزة والكسائي وكسرهما أبو عمرو، كذلك يعقوب إذا انكسر ما قبله ، والآخرون يقرؤون بضم الميم وكسر الهاء لأجل الياء أو لكسر ما قبلها وضم الميم على الأصل .

تفسیر کبیر (ص ۲۱۷-۲۲۳ ج ۱ طبع بیروت)

معنى قوله: ﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾

الفائدة الأولى: لقائل أن يقول: المصلي لابدّ و أن يكون مؤمناً، وكل مؤمن مهتد ، فالمصلي مهتد ، فإذا قال: اهدنا كان جارياً مجرى أن من حصلت له الهداية فإنه يطلب الهداية فكان هذا طلباً لتحصيل الحاصل ، وانه محال ، والعلماء أجابوا عنه من وجوه :.

الأول: المراد منه صراط الأولين في تحمل المشاق العظيمة لأجل مرضاة الله تعالى. يحكي أن نوحاً عليه السلام كان يضرب في كل يوم كذا مرات بحيث يغشى عليه ، وكان يقول في كل مرة : اللهم اهد قومي فإنهم لايعلمون . فإن قيل : إن رسولنا عليه الصلاة والسلام ما قال ذلك إلا مرة واحدة ، وهو كان يقول كل يوم مرات فلزم أن يقال إن نوحاً عليه السلام كان أفضل منه ، والجواب لما كان المراد من قوله اهدنا الصراط المستقيم طلب تلك الأخلاق الفاضلة من الله تعالى والرسول عليه السلام كان يقرأ الفاتحة في كل يوم كذا مرة كان تكلم الرسول ﷺ بهذه الكلمة أكثر من تكلم نوح عليه السلام بها .

الوجه الثاني في الجواب : أن العلماء بينوا أن في كل خلق من الأخلاق طرفي تفريط وإفراط ، وهما مذمومان ، والحق هو الوسط، و يتأكد ذلك بقوله تعالى: ﴿وكذلك جعلناكم أمة وسطاً ﴾(البقرة:١٤٣) .

وذلك الوسط هو العدل والصواب ، فالمؤمن بعد أن عرف الله بالدليل صار مؤمناً مهتدياً ، أما بعد حصول هذه الحالة فلابد من معرفة العدل الذي هو الخط المتوسط بين طرفي الإفراط والتفريط في الأعمال الشهوانية وفي الأعمال الغضبية وفي كيفية إنفاق المال . فالمؤمن يطلب من الله تعالى أن يهديه إلى الصراط المستقيم الذي هو الوسط بين طرفي الإفراط والتفريط في كل الأخلاق وفي كل الأعمال ، وعلى هذا التفسير فالسؤال زائل .

الوجه الثالث : أن المؤمن إذا عرف الله بدليل واحد فلا موجود من أقسام الممكنات إلا وفيه دلائل على وجود الله وعلمه وقدرته وجوده ورحمته وحكمته ، وربما صح دين الإنسان بالدليل الواحد وبقي غافلاً عن سائر الدلائل ، فقوله : اهدنا الصراط المستقيم معناه عرفنا يا إلهنا ما في كل شيء من كيفية دلالته على ذاتك وصفاتك وقدرتك وعلمك ، وعلى هذا التقدير فالسؤال زائل .

الوجه الرابع : أنه تعالى قال : ﴿وإنك لتهدي إلى صراط مستقيم ، صراط الله الذي له ما في السموات وما في الأرض﴾ (الشورى: ٥٢) وقال أيضاً لمحمد عليه السلام : ﴿وأن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه﴾ (الأنعام: ١٥٣) وذلك الصراط المستقيم هو أن يكون الإنسان معرضاً عما سوى الله مقبلاً بكلية قلبه وفكره وذكره على الله ، فقوله : اهدنا الصراط المستقيم المراد أن يهديه الله إلى الصراط المستقيم الموصوف بالصفة المذكورة ، مثاله أن يصير بحيث لو أمر بذبح ولده لأطاع كما فعله إبراهيم عليه السلام ، ولو أمر بأن ينقاد ليذبحه غيره لأطاع كما فعله إسمعيل عليه السلام ؛ ولو أمر بأن يرمي نفسه في البحر لأطاع كما فعله يونس عليه السلام ، ولو أمر بأن يتلمذ لمن هو أعلم منه بعد بلوغه في المنصب إلى أعلى الغايات لأطاع كما فعله موسى مع الخضر عليهما السلام ، ولو أمر بأن يصبر في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر على القتل والتفريق نصفين لأطاع كما فعله يحيى وزكريا عليهما السلام ، فالمراد بقوله اهدنا الصراط المستقيم هو الاقتداء بأنبياء الله في الصبر على الشدائد والثبات عند نزول البلاء ؛ ولاشك أن هذا مقام شديد هائل ؛ لأن أكثر الخلق لاطاقة لهم به ، إلا أنا نقول : أيها الناس ، لاتخافوا ولاتحزنوا ،

فإنه لايضيق أمر في دين الله إلا اتسع ؛ لأن في هذه الآية ما يدل على اليسر و السهولة ؛لأنه تعالى لم يقل صراط الذين ضربوا وقتلوا بل قال: ﴿صراط الذين أنعمت عليهم﴾ فلتكن نيتك عند قراءة هذه الآية أن تقول: يا إلهي إن والدي رأيته ارتكب الكبائر، كما ارتكبتها وأقدم على المعاصي كما أقدمت عليها، ثم رأيته لما قرب موته تاب وأناب فحكمت له بالنجاة من النار والفوز بالجنة فهو ممن أنعمت عليه بأن وفقته للتوبة، ثم أنعمت عليه بأن قبلت توبته. فأنا أقول: إهدنا إلى مثل ذلك الصراط المستقيم طلباً لمرتبة التائبين، فإذا وجدتها فاطلب الاقتداء بدرجات الأنبياء عليهم السلام ، فهذا تفسير قوله اهدنا الصراط المستقيم

الوجه الخامس : كأن الإنسان يقول في الطريق : كثرة الأحباب يجروتني إلى طريق ، والأعداء إلى طريق ثانٍ والشيطان إلى طريق ثالث، وكذا القول في الشهوة والغضب والحقد والحسد ، وكذا القول في التعطيل والتشبيه والجبر والقدر والإرجاء والوعيد والرفض والخروج ، والعقل ضعيف ، والعمر قصير، والصناعة طويلة ، والتجربة خطرة ، والقضاء عسير، وقد تحيرت في الكل فاهدني إلى طريق أخرج منه إلى الجنة و المستقيم : السوي الذي لا غلط فيه.

يحكى عن إبراهيم بن أدهم أنه كان يسير إلى بيت الله ، فإذا أعرابي على ناقة له فقال: ياشيخ إلى أين؟ فقال إبراهيم إلى بيت الله ، قال كأنك مجنون لاأرى لك مركباً، ولا زاداً، والسفر طويل، فقال إبراهيم: إن لي مراكب كثيرة ولكنك لاتراها ، قال: وماهي؟ قال: إذا نزلت على بلية ركبت مركب الصبر، وإذا نزل على نعمة ركبت مركب الشكر وإذا نزل بي القضاء ركبت مركب الرضا ، إذا دعتني النفس إلى شيء علمت أن ما بقي من العمر أقل مما مضى فقال الأعرابي : سر بإذن الله فأنت الراكب و أنا الراجل.

الوجه السادس: قال بعضهم : الصراط المستقيم: الإسلام ، وقال بعضهم: القرآن ، وهذا لايصح ؛ لأن قوله :﴿ صراط الذين أنعمت عليهم﴾ بدل من ﴿الصراط المستقيم﴾، وإذا كان كذلك كان التقدير إهدنا صراط من أنعمت عليهم من المتقدمين ، ومن تقدمنا من الأمم ما كان لهم القرآن

والإسلام ، وإذا بطل ذلک ثبت أن المراد إهدنا صراط المحقين المستحقين للجنة ، وإنما قال الصراط ولم يقل السبيل ولا الطريق وإن كان الكل واحداً ليكون لفظ الصراط مذكراً لصراط جهنم فيكون الإنسان على مزيد خوف وخشية.

القول الثاني : في تفسير إهدنا : أي ثبتنا على الهداية التي وهبتها منا ، ونظيره قوله تعالى: ﴿ربنا لاتزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا﴾ [آل عمران ٨] أي ثبتنا على الهداية فكم من عالم وقعت له شبهة ضعيفة في خاطره فزاغ وذل وانحرف عن الدين القويم والمنهج المستقيم.

الفائدة الثانية: لقائل أن يقول: لم قال إهدنا ولم يقل إهدني؟ والجواب من وجهين : الأول أن الدعاء كلما كان أعم كان إلى الإجابت أقرب . كان بعض العلماء يقول لتلامذته : إذ قرأتم في خطبة السابق "ورضي الله عنک وعن جماعة المسلمين" إن نويتني في قولک "رضي الله عنک" فحسن، وإلا فلا حرج، ولكن إياک وأن تنساني في قولک "وعن جماعة المسلمين" لأن قوله رضي اللهعنک تخصيص بالدعاء فيجوز أن لايقبل، وأما قوله وعن جماعة المسلمين فلا بد وأن يكون في المسلمين من يستحق الإجابة ، وإذا أجاب الله الدعاء في البعض فهو أكرم من أن يرده في الباقي، ولهذا السبب فإن السنة إذا أراد أن يذكر دعاء أن يصلي أولاً على النبي ﷺ ثم يدعو ثم يختم الكلام بالصلاة على النبي ﷺ ثانياً ؛ لأن الله تعالى يجيب الداعي في صلاته على النبي ﷺ ثم إذا أجيب في طرفي دعائه امتنع أن يرد في وسطه .

الثاني: قال عليه الصلاة والسلام: "ادعوا الله بألسنة ما عصيتموه بها، قالوا: يا رسول الله ومن لنا بتلک الألسنة، قال يدعو بعضكم لبعض؛ لأنک ما عصيت بلسانه وهو ما عصى بلسانک.

والثالث: كأنه يقول: أيها العبد ، ألست قلت في أول السورة الحمد لله وما قلت أحمد الله فذكرت أولاً حمد جميع الحامدين فكذلک في وقت الدعاء أشركهم فقال إهدنا.

الرابع: كأن العبد يقول: سمعت رسولک يقول: الجماعة رحمة، والفرقة عذاب،فلما أردت تحميدک ذكرت حمد الجميع فقلت الحمد لله ،

ولما ذكرت العبادة ذكرت عبادة الجميع فقلت إياك نعبد ، ولما ذكرت الاستعانة ذكرت استعانة الجميع فقلت وإياك نستعين، فلاجرم لما طلبت الهداية طلبتها للجميع فقلت إهدنا الصراط المستقيم ، ولما طلبت الاقتداء بالصالحين طلبت الاقتداء بالجميع فقلت صراط الذين أنعمت عليهم ، ولما طلبت الفرار من المردودين فررت من الكل فقلت غير المغضوب عليهم ولاالضالين ، فلما لم أفارق الانبياء والصالحين في الدنيا فأرجو أن لاأفارقهم في القيامة ، قال تعالى: ﴿فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين﴾ (النساء:٦٩) الآية.

الفائدة الثالثة : اعلم أن أهل الهندسة قالوا الخط المستقيم هو أقصر خط يصل بين نقطتين، فالحاصل أن الخط المستقيم أقصر من جميع الخطوط المعوجة ، فكان العبد يقول : إهدنا الصراط المستقيم لوجوه : الأول : أنه أقرب الخطوط وأقصرها ، وأنا عاجز فلا يليق بضعفي إلا الطريق المستقيم. الثاني : أن المستقيم واحد وما عداه معوجة وبعضها يشبه بعضاً في الإعوجاج فيشتبه الطريق علي، أما المستقيم فلا يشابهه غيره فكان أبعد عن الخوف والآفات وأقرب إلى الأمان. الثالث: الطريق المستقيم يوصل إلى المقصود، والمعوج لايوصل إليه. والرابع: المستقيم لايتغير، والمعوج يتغير، فلهذه الأسباب سأل الصراط المستقيم، والله أعلم.

الفصل الثامن في تفسير قوله صراط الذين أنعمت عليهم، وفيه فوائد

معنى قوله ﴿صراط الذين أنعمت عليهم﴾:

الفائدة الأولى: في حد النعمة ، وقد اختلف فيها ، فمنهم من قال إنها عبارة عن المنفعة المفعولة على جهة الإحسان إلى الغير، ومنهم من يقول: المنفعة الحسنة المفعولة على جهة الإحسان إلى الغير، قالوا وإنما زدنا هذا القيد لأن النعمة يستحق بها الشكر، وإذا كانت قبيحة لايستحق بها الشكر، والحق أن هذا القيد غير معتبر، لأنه يجوز أن يستحق الشكر بالإحسان وإن كان فعله محظوراً ، لأن جهة استحقاق الشكر غير جهة استحقاق الذنب والعقاب ، فأي امتناع في اجتماعهما ؟ ألاترى أن الفاسق يستحق بإنعامه الشكر، والذم بمعصية الله ، فلم لايجوز أن يكون الأمر ههنا كذلك.

ولنرجع إلى تفسير الحد المذكور فنقول : أما قولنا "المنفعة" فلأن المضرة المحضة لاتكون نعمة وقولنا "المفعولة على جهة الإحسان" لأنه لو كان نفعاً حقاً وقصد الفاعل به نفع نفسه لانفع المفعول به لايكون نعمة، وذالك كمن أحسن إلى جاريته ليربح عليها.

إذا عرفت حد النعمة فيتفرع عليه فروع : الفرع الأول : اعلم أن كل ما يصل إلى الخلق من النفع ودفع الضرر فهو من الله تعالى على ما قال تعالى: ﴿وما بكم من نعمة فمن الله﴾[النحل:٥٣] ثم أن النعمة على ثلاثة أقسام: أحدها: نعمة تفرد الله بإيجادها ، نحو أن خلق ورزق . وثانيها: نعمة وصلت من جهة غير الله في ظاهر الأمر، وفي الحقيقة فهي أيضاً إنما وصلت من الله تعالى، وذلك لأنه تعالى هو الخالق لتلك النعمة ، والخالق لذلك المنعم، والخالق لداعية الإنعام بتلك النعمة في قلب ذلك المنعم ، إلا أنه تعالى لما أجرى تلك النعمة على يد ذلك العبد كان ذلك العبد مشكوراً، ولاكن المشكور في الحقيقة هو الله تعالى ولهذا قال: ﴿أن اشكر لي ولو الديك إليّ المصير﴾ [لقمان:١٤] فبدأ بنفسه تنبيهاً على أن إنعام الخلق لا يتم إلا بإنعام الله ، وثالثها : نعم وصلت من الله إلينا بسبب طاعتنا، وهي أيضاً من الله تعالى ؛ لأنه لولا أن الله سبحانه وتعالى وفقنا للطاعات وأعاننا عليها وهدنا إليها وأزاح الأعذار عنا وإلا لما وصلنا إلى شيء منها ، فظهر بهذا التقرير أن جميع النعم في الحقيقة من الله تعالى.

الفرع الثاني: أن أول نعم الله على العبيد هو أن خلقهم أحياء ، ويدل عليه العقل والنقل أما العقل فهو أن الشيء لايكون نعمة إلا إذا كان بحيث يمكن الانتفاع به ، ولايمكن الانتفاع به إلا عند حصول الحياة ، فإن الجماد والميت لايمكنه أن ينتفع بشيء ، فثبت أن أصل جميع النعم هو الحياة ، وأما النقل فهو أنه تعالى قال : ﴿كيف تكفرون بالله وكنتم أمواتاً فأحياكم﴾ [البقرة:٢٨] ثم قال عقيبة :﴿هو الذي خلق لكم ما في الأرض جميعاً﴾[البقرة ٢٩] فبدأ بذكر الحياة ، وثنى بذكر الأشياء التي ينتفع بها ، وذلك يدل على أن أصل جميع النعم هو الحياة.

الفرع الثالث : اختلفوا في أنه هل لله تعالى نعمة على الكافر أم لا ؟ فقال

بعض أصحابنا: ليس لله تعالى على الكافر نعمة، وقالت المعتزلة: لله على الكافر نعمة دينية، ونعمة دنيوية واحتج الأصحاب على صحة قولهم بالقرآن والمعقول: أما القرآن فآيات. إحداها: قوله تعالى: ﴿صراط الذين أنعمت عليهم﴾ وذلك لأنه لو كان لله على الكافر نعمة لكانوا داخلين تحت قوله تعالى: ﴿أنعمت عليهم﴾ ولو كان كذلك لكان قوله: ﴿إهدنا الصراط المستقيم صراط الذين أنعمت عليهم﴾ طلباً لصراط الكفار، وذلك باطل، فثبت بهذه الآية أنه ليس لله نعمة على الكفار، فإن قالوا: إن قوله الصراط يدفع ذلك، قلنا: إن قوله: ﴿صراط الذين أنعمت عليهم﴾ بدل من قوله: ﴿الصراط المستقيم﴾ فكان التقدير إهدنا صراط الذين أنعمت عليهم، وحينئذ يعود المحذور المذكور. والآية الثانية: قوله تعالى: ﴿ولايحسبن الذين كفروا أنما نملي لهم خير لأنفسهم إنما نملي لهم ليزدادوا إثماً﴾ [آل عمران: ١٧٨] وأما المعقول فهو أن نعم الدنيا في مقابلة عذاب الآخرة على الدوام قليلة كالقطرة في البحر، ومثل هذا لايكون نعمة، بدليل أن من جعل السم في الحلواء لم يعد النفع الحاصل منه نعمة لأجل أن ذلك النفع حقير في مقابلة ذلك الضرر الكثير، فكذا ههنا.

وأما الذين قالوا إن لله على الكافر نعماً كثيرة فقد احتجوا بآيات: إحداها: قوله تعالى: ﴿يا أيهاالناس اعبدوا ربكم الذي خلقكم والذين من قبلكم لعلكم تتقون الذي جعل لكم الأرض فراشاً و السماء بناءً﴾ [البقرة: ٢١، ٢٢] فنبه على أنه يجب على الكل طاعة الله لمكان هذه النعم العظيمة. وثانيها: قوله: ﴿كيف تكفرون بالله وكنتم أمواتاً فأحياكم﴾ [البقرة: ٢٨] ذكر ذلك في معرض الامتنان وشرح النعم. وثالثها: قوله تعالى: ﴿يا بني إسرائيل اذكروا نعمتي التي أنعمت عليكم﴾ [البقرة: ٤٠] ورابعها: قوله تعالى: ﴿وقليل من عبادي الشكور﴾ [سبأ: ١٣] وقول إبليس: ﴿ولا تجد أكثرهم شاكرين﴾ [الأعراف: ١٧] ولو لم تحصل النعم لم يلزم الشكر. ولم يلزم من عدم إقدامهم على الشكر محذور؛ لأن الشكر لايمكن إلا عند حصول النعمة.

الفائدة الثانية: قوله: ﴿اهدنا الصراط المستقيم ـ صراط الذين أنعمت عليهم﴾ يدل على إمامة أبي بكر رضي الله عنه؛ لأنا ذكرنا أن تقدير الآية: إهدنا صراط الذين أنعمت عليهم والله تعالى قد بين في آية أخرى أن الذين أنعم الله

عليهم من هم فقال: ﴿ فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبين والصديقين﴾ [النساء:٦٩] الآية ولا شك أن رأس الصديقين ورئيسهم أبو بكر الصديق رضي الله عنه، فكان معنى الآية أن الله أمرنا أن نطلب الهداية التي كان عليها أبو بكر الصديق وسائر الصديقين، ولو كان أبو بكر ظالماً لما جاز الاقتداء به فثبت بما ذكرناه دلالة هذه الآية على إمامة أبي بكر رضي الله عنه.

الفائدة الثالثة: قوله: ﴿أنعمت عليهم﴾ يتناول كل من كان لله عليه نعمة، وهذه النعمة إما أن يكون المراد منها نعمة الدنيا أو نعمة الدين، ولما بطل الأول ثبت أن المراد منه نعمة الدين، فنقول: كل نعمة دينية سوى الإيمان فهي مشروطة بحصول الإيمان، وأما النعمة التي هي الإيمان فيمكن حصولها خالياً عن سائر النعم الدينية، وهذا يدل على أن المرد من قوله:﴿أنعمت عليهم﴾ هو نعمة الإيمان، فرجع حاصل القول في قوله: إهدنا الصراط المستقيم صراط الذين أنعمت عليهم أنه طلب لنعمة الإيمان، وإذا ثبت هذا الأصل فنقول: يتفرع عليه أحكام:

الحكم الأول: أنه لما ثبت أن المراد من هذه النعمة نعمة الإيمان، ولفظ الآية صريح في أن الله تعالى هو المنعم بهذه النعمة؛ ثبت أن خالق الإيمان والمعطي للإيمان هو الله تعالى، وذلك يدل على فساد قول المعتزلة، ولأن الإيمان أعظم النعم، فلو كان فاعله هو العبد لكان إنعام العبد أشرف وأعلى من إنعام الله، ولو كان كذلك لما حسن من الله أن يذكر إنعامه في معرض التعظيم.

الحكم الثاني يجب أن لايبقى المؤمن مخلداً في النار، لأن قوله: ﴿أنعمت عليهم﴾ مذكور في معرض التعظيم لهذا الإنعام، ولو لم يكن له أثر في دفع العقاب المؤبد لكان قليل الفائدة فما كان يحسن من الله تعالى ذكره في معرض التعظيم.

الحكم الثالث: دلت الآية على أنه لايجب على الله رعاية الصلاح والأصلح في الدين، لأنه لو كان الإرشاد واجباً على الله لم يكن ذلك إنعاماً؛ لأن أداء الواجب لايكون إنعاماً، وحيث سماه الله تعالى إنعاماً علمنا أنه غير واجب.

الحكم الرابع: لايجوز أن يكون المراد بالإنعام هو أن الله تعالى أقدر

المكلف عليه وأرشده إليه وأزاح أعذاره وعلله عنه ؛ لأن كل ذلك حاصل في حق الكفار ، فلما خص الله تعالى بعض المكلفين بهذا الإنعام مع أن هذا الأقدار وإزاحة العلل عام في حق الكل علمنا أن المراد من الإنعام ليس هو الأقدار عليه وإزاحة الموانع عنه .

تفسیر ابن کثیر (ص۳۰،۳۲)

اهدنا الصراط المستقيم

قراءة الجمهور بالصاد وقرئ السراط وقرئ بالزاي ، قال الفراء: وهي لغة بني عذرة وبني كلب لما تقدم الثناء على المسؤول تبارك وتعالى ناسب أن يعقب بالسؤال كما قال : " فنصفها لي ونصفها لعبدي ولعبدي ما سأل" وهذا أكمل أحوال السائل أن يمدح مسؤوله ثم يسأل حاجته وحاجة إخوانه المؤمنين بقوله : ﴿ اهدنا الصراط المستقيم ﴾ لأنه أنجح للحاجة وأنجع للإجابة ، ولهذا أرشد الله إليه لأنه الأكمل وقد يكون السؤال بالإخبار عن حال السائل واحتياجه كما قال موسى عليه السلام ﴿ رب إني لما أنزلت إلي من خير فقير ﴾ وقد تقدمه مع ذلك وصف مسؤول كقول ذي النون ﴿ لا إله إلا أنت سبحانك إني كنت من الظالمين ﴾ وقد يكون بمجرد الثناء على المسؤول كقول الشاعر :

أأذكر حاجتي أم قد كفاني حياؤك إن شيمتك الحياء
إذا أثنى عليك المرء يوماً كفاه من تعرضه الثناء

والهداية ههنا والإرشاد والتوفيق ، وقد تعدى الهداية بنفسها كما هنا ﴿ اهدنا الصراط المستقيم ﴾ فتضمن معنى ألهمنا أو وفقنا أو ارزقنا أو أعطنا ﴿ وهديناه النجدين ﴾ أي بينا له الخير والشر ، وقد تعدى بإلى كقوله تعالى: ﴿ اجتباه وهداه إلى صراط مستقيم ﴾ ﴿ فاهدوهم إلى صراط الجحيم ﴾ وذلك بمعنى الإرشاد والدلالة وكذلك قوله ﴿ وإنك لتهدي إلى صراط مستقيم ﴾ وقد تعدى باللام كقول أهل الجنة ﴿ الحمد لله الذي هدانا لهذا ﴾ أي وفقنا لهذا وجعلنا له أهلاً .

وأما الصراط المستقيم فقال الإمام أبو جعفر بن جرير: أجمعت الأمة من أهل التأويل جميعاً على أن الصراط المستقيم هو الطريق الواضح الذي لا

اعوجاج فيه وذلك في لغة العرب فمن ذلك قال جرير بن عطية الخطفي:

أمير المؤمنين على صراط   إذا اعوج الموارد مستقيم

قال والشواهد على ذلك أكثر من أن تحصر، قال ثم تستعير العرب الصراط فتستعمله في كل قول وعمل ووصف باستقامة أو اعوجاج فتصف المستقيم باستقامته والمعوج باعوجاجه . ثم اختلف عبارات المفسرين من السلف والخلف في تفسير الصراط ، وإن كان يرجع حاصلها إلى شيء واحد وهو المتابعة لله وللرسول، فروي أنه كتاب الله ، قال ابن أبي حاتم: حدثنا الحسن بن عرفة حدثني يحيى بن يمان عن حمزة الزيات عن سعيد وهو ابن المختار الطائي عن ابن أخي الحارث الأعور عن الحارث الأعور عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ "الصراط المستقيم كتاب الله "وكذلك رواه ابن جرير من حديث حمزة بن حبيب الزيات وقد تقدم في فضائل القرآن فيما رواه أحمد والترمذي من رواية الحارث الأعور عن علي مرفوعاً "وهو حبل الله المتين وهو الذكر الحكيم و هو الصراط المستقيم" وقد روي موقوفاً على علي رضي الله عنه وهو أشبه والله أعلم. وقال الثوري عن منصور عن أبي وائل عن عبد الله قال الصراط المستقيم كتاب الله ، وقيل هو الإسلام ، قال الضحاك عن ابن عباس قال: قال جبريل لمحمد عليهما السلام "قل يا محمد اهدنا الصراط المستقيم" يقول ألهمنا الطريق الهادي وهو دين الله الذي لااعوجاج فيه ، وقال ميمون بن مهران عن ابن عباس في قوله تعالى: ﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾ قال ذاك الإسلام ، وقال إسماعيل بن عبد الرحمن السدي الكبير عن أبي مالك وعن أبي صالح عن ابن عباس وعن مرة الهمداني عن ابن مسعود وعن ناس من أصحاب النبي ﷺ اهدنا الصراط المستقيم قالوا هو الإسلام ، وقال عبد الله بن محمد بن عقيل عن جابر اهدنا الصراط المستقيم قال هو الإسلام أوسع مما بين السماء والأرض وقال ابن الحنفية في قوله تعالى ﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾ قال هو دين الله الذي لايقبل من العباد غيره وقال عبد الرحمن بن زيد بن أسلم اهدنا الصراط المستقيم قال هو الإسلام وفي هذا الحديث الذي رواه

الإمام أحمد في مسنده حيث قال حدثنا الحسن بن سوار أبو العلاء حدثنا ليث يعني ابن سعد عن معاوية بن صالح أن عبد الرحمن بن جبير بن نفير حدثه عن أبيه عن النواس بن سمعان عن رسول الله ﷺ قال: "ضرب الله مثلاً صراطاً مستقيماً وعلى جنبتي الصراط سوران فيهما أبواب مفتحة وعلى الأبواب ستور مرخاة وعلى باب الصراط داع يقول يا أيها الناس ادخلوا الصراط جميعاً ولا تعوجوا، وداع يدعو من فوق الصراط فإذا أراد الإنسان أن يفتح شيئاً من تلك الأبواب قال ويحك لا تفتحه ـ فإنك إن فتحته تلجه ـ فالصراط الإسلام والسوران حدود الله والأبواب المفتحة محارم الله وذلك الداعي على رأس الصراط كتاب الله والداعي من فوق الصراط واعظ الله في قلب كل مسلم" وهكذا رواه ابن أبي حاتم وابن جرير من حديث الليث بن سعد به، ورواه الترمذي والنسائي جميعاً عن علي بن حجر عن بقية عن بحير بن سعد عن خالد بن معدان عن جبير بن نفير عن النواس بن سمعان به، وهو إسناد حسن صحيح والله أعلم. وقال مجاهد اهدنا الصراط المستقيم قال: الحق وهذا أشمل ولا منافاة بينه وبين ما تقدم، وروى ابن أبي حاتم وابن جرير من حديث أبي النضر هاشم بن القاسم حدثنا حمزة بن المغيرة عن عاصم الأحول عن أبي العالية ﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾ قال هو النبي ﷺ وصاحباه من بعده. قال عاصم فذكر ذلك للحسن فقال صدق أبو العالية ونصح. وكل هذه الأقوال صحيحة وهي متلازمة فإن من اتبع الإسلام فقد اتبع النبي ﷺ واقتدى باللذين من بعده أبي بكر وعمر فقد اتبع الحق ومن اتبع الحق فقد اتبع الإسلام ومن اتبع الإسلام فقد اتبع القرآن وهو كتاب الله وحبله المتين وصراطه المستقيم، فكلها صحيحة يصدق بعضها بعضاً، ولله الحمد. وقال الطبراني حدثنا محمد بن الفضل السقطي حدثنا إبراهيم بن مهدي المصيصي حدثنا يحيى بن زكريا بن أبي زائدة عن الأعمش عن أبي وائل عن عبد الله قال الصراط المستقيم الذي تركنا عليه رسول الله ﷺ. ولهذا قال الإمام أبو جعفر بن جرير رحمه الله: والذي هو أولى بتأويل هذه الآية عندي أعني ـ اهدنا الصراط المستقيم ـ أن يكون معنياً به

وفقنا للثبات على ما ارتضيته و وفقت له من أنعمت عليه من عبادك من قول وعمل ذلك هو الصراط المستقيم لأن من وفق لما وفق له من أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين فقد وفق للإسلام وتصديق الرسل والتمسك بالكتاب والعمل بما أمره الله به والانزجار عما زجره عنه واتباع منهاج النبي ﷺ ومنهاج الخلفاء الأربعة ، وكل عبد صالح وكل ذلك من الصراط المستقيم .

فإن قيل فكيف يسأل المؤ من الهداية في كل وقت من صلاة وغيرها وهو متصف بذلك ؟ فهل هذا من باب تحصيل الحاصل أم لا ؟

فالجواب أن لا، ولولا احتياجه ليلاً ونهاراً إلى سؤال الهداية لما أرشده الله تعالى إلى ذلك فإن العبد مفتقر في كل ساعة وحالة إلى الله تعالى في تثبيته على الهداية ورسوخه فيها وتبصره وازدياده منها واستمراره عليها فإن العبد لايملك لنفسه نفعاً ولا ضراً إلا ماشاء الله فأرشده تعالى إلى أن يسأله في كل وقت أن يمده بالمعونة والثبات والتوفيق فالسعيد من وفقه الله تعالى لسؤاله فإنه تعالى قد تكفل بإجابة الداعي إذا دعاه ولا سيما المضطر المحتاج المفتقر إليه آناء الليل وأطراف النهار، وقد قال تعالى : ﴿يا أيها الذين آمنوا آمنوا بالله ورسوله والكتاب الذي نزل على رسوله والكتاب الذي أنزل من قبل﴾ الآية : فقد أمر الذين آمنوا بالإيمان وليس ذلك من باب تحصيل الحاصل لأن المراد الثبات والاستمرار والمداومة على الأعمال المعينة على ذلك والله أعلم . وقال تعالى آمراً لعباده المؤمنين أن يقولوا: ﴿ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة إنك أنت الوهاب﴾ وقد كان الصديق رضي الله عنه يقرأ بهذه الآية في الركعة الثالثة من صلاة المغرب بعد الفاتحة سراً، فمعنى قوله تعالى ﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾ استمر بنا عليه ولا تعدل بنا إلى غيره .

صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ

وقد تقدم الحديث فيما إذا قال العبد ﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾ إلى آخرها أن الله يقول "هذا لعبدي ولعبدي ما سأل" وقوله تعالى:

﴿صراط الذين أنعمت عليهم﴾ مفسر للصراط المستقيم وهو بدل منه عند النحاة ويجوز أن يكون عطف بيان والله أعلم. والذين أنعم الله عليهم المذكورون في سورة النساء حيث قال تعالى: ﴿ومن يطع الله والرسول فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقاً ذلك الفضل من الله وكفى بالله عليماً﴾ وقال الضحاك عن ابن عباس: صراط الذين أنعمت عليهم بطاعتك وعبادتك من ملائكتك وانبيائك والصديقين والشهداء والصالحين. وذلك نظير ما قال ربنا تعالى: ﴿ومن يطع الله والرسول فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم﴾ الآية. وقال أبوجعفر الرازي عن الربيع بن أنس ﴿صراط الذين أنعمت عليهم﴾ قال هم النبيون وقال ابن جريج عن ابن عباس: هم المؤمنون، وكذا قال مجاهد وقال وكيع: هم المسلمون وقال عبد الرحمن بن زيد بن أسلم: هم النبي ﷺ ومن معه والتفسير المتقدم عن ابن عباس رضي الله عنهما أعم وأشمل والله أعلم.

آیت نمبر ۲ :۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ. (سورہ بقرہ : ۴)

ترجمہ :۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں۔"

خلاصہ :

اس آیت میں قرآن پاک سے فائدہ اٹھانے کی پانچویں اور چھٹی نمبر کی دو شرطیں بیان کی گئی ہیں۔ جس میں قرآن پاک اور انبیاء سابقین کی وحیوں، کتابوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ عالم آخرت یعنی موجودہ سلسلہ زندگی کے بعد پیش آنے والی زندگی پر ایمان و یقین رکھنے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ جملہ مفسرین و مجددین امت نے وضاحت کی ہے۔

لفظ آخرت کے مذکورہ بالا متفق علیہ معنی و مطلب میں آج تک سوائے قادیانیوں کے اور کسی نے تحریف نہیں کی۔ حتی کہ اپنی جھوٹی نبوت پر اس آیت سے مرزا قادیانی کو بھی استدلال کرنے کی نہ سوجھی، لیکن مرزا کے چیلے قرآن پاک کے ساتھ تحریف و تمسخر کا بازار گرم کرنے میں اُس سے کہیں چار قدم آگے نکلے۔ چنانچہ مرزا کے بیٹے بشیر الدین محمود نے اپنے ابا حضور کی نادانی اور غباوت پر مہر لگاتے ہوئے اس آیت سے اس کی باطل نبوت پر استدلال کیا ہے اور "آخرۃ" سے مرزا کی آخری وحی مراد لے کر اس نے اپنی آخرت تباہ کر لی۔

ملاحظہ فرمایئے پہلے مرزائی استدلال اور اس کے جوابات اس کے بعد حضرات مفسرین کی تفاسیر۔

قادیانی استدلال :۔

یعنی ان تینوں باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے کہ جو تجھ پر نازل ہوا اور جو تجھ سے

پہلے نازل ہوا اور جو آخیر تن یعنی تیرے بعد نازل ہوگا۔ بعض اصحاب کہتے ہیں کہ آخرت سے مراد قیامت ہے لیکن اس آیت کا قرینہ آخرۃ کے یہ معنی نہیں بتاتا کیوں کہ نازل ہونے کا ذکر ہے"۔ (احمدیہ پاکٹ بک ص ۲۳ و تفسیر مرزا بشیر الدین)

جواب نمبر ا۔

اس جگہ آخرت سے مراد قیامت ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ صراحۃً فرمایا گیا: وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ: (عنکبوت ۶۴) آخری زندگی ہی اصل زندگی ہے: خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ: (حج) دنیا و آخرت میں خائب و خاسر: الْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (سورہ) الحاصل قرآن مجید میں لفظ آخرۃ پچاس سے زائد مرتبہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ مراد جزا اور سزا کا دن ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر ابن جریر ص ۸۱ جلد اول، درمنثور کی جلد اول ص ۲۷ پر ہے: عن ابن عباسؓ (وبالآخرة) ای بالبعث والقیامة والجنة و النار والحساب والمیزان.

۲۔ تفسیر مرزا قادیانی

"طالب نجات وہ ہے جو خاتم النبیین پیغمبر آخرالزماں پر جو کچھ اتارا گیا ہے ایمان لائے "وبالآخرة هم یوقنون اور طالب نجات وہ ہے جو پچھلی آنے والی گھڑی یعنی قیامت پر یقین رکھے اور جزا اور سزا مانتا ہو"۔

(الحکم نمبر ۳۴، ۳۵، ج ۸، ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۴ء، دیکھو خزینۃ العرفان، مرزا قادیانی ص ۸۷ ج ۱) اسی طرح دیکھو الحکم نمبر ۲، ج ۱۰، ۱۷ جنوری ۱۹۰۹ ص ۵، کالم ۲، ۳)

اس میں مرزا قادیانی نے بالآخرة هم یوقنون کا ترجمہ، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، کیا ہے۔ اور پھر لکھتا ہے: قیامت پر یقین رکھتا ہوں۔ اب مرزائی بتائیں کہ مرزا قادیانی کو یہ "جہالت زدہ مرزائی قرینہ" کیوں یاد نہ رہا؟

۳۔ تفسیر از حکیم نورالدین خلیفہ قادیان:۔

"اور آخرت کی گھڑی پر یقین کرتے ہیں"۔ (ضمیمہ بدر مورخہ ۴ فروری ۱۹۰۹ء)

مرزائیوں کے مفسر اعلیٰ اور خلیفہ قادیان نے بھی مرزائی قرینے کا لحاظ نہیں کیا۔
اب مرزائی بتائیں کہ حکیم جی کی خلافت علم میں تھی، یا مرزا کی جہالت میں؟
معلوم ہوا کہ مرزائیوں کا "وبالآخرۃ ھُمْ یُوْقِنُوْن" کا معنیٰ آخری وحی کرنا تحریف وزندقہ ہے۔اور قرینہ سے استدلال جہالت ہے۔

بے اعتدالیوں سے سبک اور تم ہوئے
جتنی زیادہ بڑھ گئیں اتنے ہی کم ہوئے

۳۔ قادیانی علم ومعرفت سے معریٰ ہوتے ہیں۔

کیوں کہ خود مرزا قادیانی بھی جاہل محض تھا اسے بھی تذکیر وتانیث واحد وجمع کی کوئی تمیز نہ تھی۔ایسے ہی یہاں بھی ہے۔کہ الآخرۃ تو مونث ہے جبکہ لفظ وحی مذکر ہے۔ اسکی صفت مونث کیسے ہوگی؟ دیکھئے قرآن مجید میں ہے "اِنَّ الدَّارَ الآخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ" (عنکبوت ۶۴) دیکھئے دارالآخرۃ مونث واقع ہوئی ہے۔ ھِیَ کی مونث ضمیر آئی ہے اور لفظ وحی کیلئے وحی، یوحی، مذکر کا صیغہ مستعمل ہے، تو پھر کوئی سرپھرا، الآخرۃ کو آخری وحی قرار دے سکتا ہے؟ اسی طرح دوسرے کئی مقامات پر الآخرۃ کا لفظ قیامت کے لئے آیا ہے۔دیکھئے یہاں صرف قیامت ہی کا تذکرہ ہے۔جس کے لئے ھی ترکیب لائی گئی ہے۔قادیانی عقل ودانش اور علم وتمیز سے بالکل معریٰ ہوتے ہیں۔وہ اغراض فاسدہ کے حصول کے لئے اندھے بہرے ہوکر ہر قسم کی تحریف وتاویل اور جہالت وحماقت کا ارتکاب کر گزرتے ہیں۔کسی کہنے والے نے مرزا ہی کے بارے میں سچ کہا ہے۔

کچھ ہے تیرا عقیدہ کہیں اور کچھ کہیں، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے ہو تم
عقبیٰ کو اپنے ہاتھ سے تم نے کیا تباہ۔دنیائے بے ثبات پر مرتے رہے ہو تم

مغالطہ نمبر ا۔

مرزائیوں کو جب لفظ الآخرۃ سے اپنی آخرت کی تباہی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا تو

اب مغالطہ دینے پر اتر آئے۔ ملاحظہ فرمایئے ان کے مغالطے اور ہماری طرف سے انکے دنداں شکن جوابات۔

(۱) عدم ذکر سے عدم شئی لازم نہیں آتا۔ (پاکٹ بک: عبدالرحمن مرزائی، ص ۳۰۰)

جواب:۔

یہ ایک نرا مغالطہ ہے جو جہالت پر مبنی ہے کیونکہ عدم ذکر سے عدم شئی لازم نہ آنا ٹھیک ہے۔ لیکن وجود شئی کے لئے اس کا کہیں تو ذکر ہونا چاہیے تھا؟ جس شئی کا کہیں ذکر ہی نہ ہو اس کے وجود پر اس قاعدے سے استدلال کرنا اسی کا نام ہے مرزائی دجل وتلبیس۔ مرزائی پنڈت میں اگر شرم وحیا کا مادہ کچھ بھی تھا تو پہلے قرآن مجید سے "من بعدک" کا لفظ پیش کرنا چاہیے تھا، یا حضور علیہ السلام کے بعد وحی نبوت کے آنے اور کسی کو ملنے کا تذکرہ کسی آیت میں ہوتو پہلے اسے پیش کرنا چاہیے تھا، بعد میں اس قاعدہ سے استدلال! لیکن کوئی مرزائی نہ ایسا کبھی کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

مغالطہ نمبر۲۔

اور اس "ما انزل الیک" (قرآن مجید) میں متعدد مقامات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں اور غلاموں پر وحی الٰہی اور ملائکہ کے نزول کا ذکر موجود ہے اور بعد میں آنے والے امتی نبیوں کی بعثت کی خبر دے کر ان پر ایمان لانے کی تلقین کی گئی ہے جن کی کسی قدر تفصیل دلائل امکان نبوت میں دی گئی ہے۔" (تبلیغی پاکٹ بک ۳۰۰)

جواب:۱۔

ما انزل الیک، میں مرزا قادیانی کی وحی داخل کرنا ایک ایسی جسارت اور ڈھٹائی ہے جس کی جرات خود مرزا قادیانی بھی نہ کر سکا۔ سچ ہے۔ کفر والحاد کا زمانہ ہے ملحدین پر لگام کسنے والی حکومتیں بھی نہ رہیں، اب ملحدین جو چاہیں بکیں۔ کون ہے روکنے والا۔

کریں بھی بے حیا شرم وحیا، تو کب تلک ساقی
کہ وہ گلشن، نہ وہ خوشبو، نہ وہ دنیا رہی باقی

مرزائی ملحدین کی ہدایت کے لئے اتنا ضرور عرض ہے کہ یہ مرزائی پنڈت کا من گھڑت استدلال ہے۔ وہ اپنے اس باطل استدلال کی حمایت میں چودہ صدیوں میں سے کسی ایک مجدد، مفسر کا قول پیش نہیں کرسکتا، بلکہ گمراہ مفسرین کی بھی حمایت حاصل نہیں کرسکتا۔ فاتقوا النار التی اعدت للکافرین۔

۲۔ مرزا قادیانی کی تحریرات خود اس من گھڑت استدلال کی اجازت نہیں دیتیں۔ مرزائی پنڈت کہتا ہے کہ امتی نبی کی بعثت کی خبر قرآن میں ہے اور خود امتی نبی ہونے کا دعویدار مرزا قادیانی کہتا ہے کہ اس طرح کی کوئی خبر قرآن میں نہیں۔ بلکہ اس نے اپنے نبی ہونے کو اپنے الہامات سے سمجھا ہے نہ کہ قرآن سے۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) اب جبرئیل بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کے لئے وحی نبوت لانے سے منع کیا گیا۔ (ازالہ اوہام خ، ص ۴۱۲ ج ۳)

(۲) اور ظاہر ہے کہ یہ بات مستلزم محال ہے کہ خاتم النبیین کے بعد پھر جبرئیل علیہ السلام کی وحی رسالت کے ساتھ زمین پر آمد ورفت شروع ہوجائے .... اور جو امر مستلزم محال ہو وہ محال ہوتا ہے (ازالہ ۴۱۴ ج ۳)

(۳) حسب تصریح قرآن کریم رسول اسی کو کہتے ہیں جس نے احکام وعقائد دین جبرئیل کے ذریعہ سے حاصل کئے ہوں لیکن وحی نبوت پر تو تیرہ سو برس سے مہر لگ گئی ہے۔ (ازالہ ۳۸۷ ج ۳)

پہلے حوالہ سے معلوم ہوا کہ فرشتے اترتے ہیں لیکن وحی نبوت کے ساتھ نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے وحی نبوت بند ہے۔ دوسرے حوالہ سے معلوم ہوا کہ جبرئیل کا زمین پر آنا محال نہیں، ہاں! وحی نبوت لیکر آنا محال ہے۔ تیسرے حوالے میں مزید اطمینان کے لئے قرآن کریم سے شہادت پیش کردی۔ اور یہ ساری عبارتیں اس زمانے کی ہیں جبکہ مرزا مدعی الہام اور مدعی مسیحیت تھا، یعنی اس میں کسی غلطی یا ترمیم، تنسیخ کا اعلان مرزا کو گویا پاگل اور مخبوط الحواس بنانے کے مترادف ہوگا۔ گویا ان حوالوں سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ملائکہ کا نزول بند تو نہیں لیکن وحی نبوت کا آنا بند ہے لہٰذا مرزائیوں کو اب کسی مغالطے میں نہیں رہنا چاہئے۔ اور نہ کسی کو مغالطہ دینا چاہئے۔

رہی بات اس کی کہ "بعد میں آنے والے امتی نبیوں کی بعثت کی خبر دے کر ان پر ایمان لانے کی تلقین کی گئی ہے" تو جب رہی نبوت ہی نہیں تو نبی کیسا؟ اور اس پر ایمان لانے کی تلقین کا کیا مطلب؟ اور اگر مرزائیوں میں جرات و ہمت ہے تو قرآن میں کسی آیت سے "امتی نبی" کی وضاحت دکھلا دیں؟ یہ تو وہی باطل جسارت ہے جس کی جرات مرزا بھی نہ کر سکا؟ پھر آج کل کے جاہلوں کو کیا گھاس ڈالی جائے! اگر قرآن میں ساری باتیں تھیں تو سوال یہ ہے کہ مرزا نے اسے کیوں نہ سمجھا؟ اور نہ ہی آج تک کسی مفسر، مجدد، محدث نے سمجھا؟

الٰہی سمجھ کسی کو بھی ایسی خدا نہ دے
دے موت پر کسی کو بھی یہ کج ادا نہ دے

۳۔ مرزائی پنڈت کے قوت استدلال پر غور کیجئے! ایڑی چوٹی کا زور لگانے پر بھی بات صرف امکان کی حد تک رہی۔ ان جاہلوں نے نہ معلوم کہاں سے عقائد کے باب میں "امکان" سے استدلال کرنا سیکھا ہے۔ جس عقیدہ کو اپنی بے جا جسارت اور ڈھٹائی کے زور پر منوانا چاہتے ہیں، اس بات کے خود ہی اقراری ہیں کہ ان کے پاس اس پر پختہ کوئی دلیل نہیں، جو بھی دلائل ہیں وہ سب امکانی حد تک ہیں۔ جن کا وقوع نہ آج تک ہوا اور نہ ہوگا۔ پھر ایسے استدلال سے ان کا کیا فائدہ؟

مغالطہ نمبر ۳۔

> "تفسیر بیضاوی جلد ۲ صفحہ ۲۱۶ مطبع احمدی دہلوی و تفسیر قادری کی معروف بہ تفسیر حسینی جلد ۲ صفحہ ۳۸۰ مترجم اردو پر اسی آیت (اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ۔ الآیۃ) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مومنوں پر اسی دنیا میں الہام الٰہی کے نزول کا اس آیت میں وعدہ دیا گیا ہے" (تبلیغی پاکٹ بک ۳۰۱)

جواب:۔

یہ ایسا ہی سفید جھوٹ ہے جیسا مرزا قادیانی بولا اور لکھا کرتا تھا۔ مرزائی پوپ

جس معنی ومفہوم کا تاثر دینا چاہتا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے۔اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر یہ آیت مرزائیوں کے حق میں مفید تھی تو انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ حوالہ دینے کی بجائے من وعن ان کی عبارتیں نقل کردی جاتیں، پڑھنے والے خود فیصلہ کر لیتے کہ حق بات کیا ہے۔ مگر اس انصاف سے مرزائیوں کا کیا واسطہ؟ بہر کیف ناظرین اس آیت کا معنی ومطلب اور اس کی پوری صحیح تفصیل اسی کتاب کے آیت نمبر ۲۶۔اسی طرح آیت ''رفیعُ الدّرجاتِ ذُوالعرشِ'' کی تفصیل آیت نمبر ۲۷۔میں ملاحظہ فرمائیں!

مغالطہ نمبر۴۔

> علاوہ مندرجہ بالا نیز دیگر آیات قرآنی کے......احادیث نبویہ میں بھی اس وحی کی خبر دی گئی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسیح موعود اور امام مہدی پر نازل ہوگی
>
> (۳۰۲ پاکٹ بک)

مرزائی پنڈت نے اس کے لئے حافظ ابن حجرؒ کے حوالے سے دو ورق اس پر سیاہ کر ڈالے ہیں کہ حضور ﷺ کے بعد وحی کا نزول اور فرشتوں کا آنا ثابت ہے۔

جواب ا:۔

جی ہاں! وحی کا ہونا اور فرشتوں کا نزول حضور ﷺ کے بعد بھی ثابت ہے لیکن اس سے آپ کو کیا فائدہ؟ کیا وہ وحی مرزا جی جیسے کوڑھ مغز کو نبی بنانے کیلئے آتی ہے؟ مرزائیوں کا فائدہ تو جب ہوتا جب وہ کسی آیت یا کسی حدیث میں یہ دکھادیں کہ حضور ﷺ کے بعد جو فرشتے آتے ہیں وہ وحی نبوت لیکر آتے ہیں اور مرزا جیسے بدطینت انسان کو نبی بنا کے جاتے ہیں۔اگر ایسا نہیں جیسا کہ امر واقعہ یہی ہے تو پھر مرزا کا فتوی یاد رکھیں ''ایک عام لفظ کسی خاص معنی میں محدود کرنا صریح شرارت ہے'' (خ ص۳۳۳ج۹)

۲:۔ حافظ ابن حجرؒ نے جس عیسیٰ علیہ السلام پر وحی لیکر جبرئیل کے نازل ہونے کی بات کہی ہے ذرا غور تو کرو، وہ عیسیٰ خود پہلے کے نبی ہیں جن پر پہلے بھی جبرئیل وحی لیکر آچکے ہیں۔اور آئندہ ان پر جو وحی لیکر آئیں گے، اس پر ہمارا ایمان اس وجہ سے

ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے ہی اس پر ایمان لانے کی خبر دی ہے۔ یہ تو ایک طرح کی پیشن گوئی ہوئی جو پوری ہو کر رہے گی۔ اب وہ حضور ﷺ کے بعد نازل ہونے والی کوئی نئی وحی نہیں رہ گئی۔ بلکہ وہ تو شریعت محمدیہ کا ایک جزو بن گئی۔ لہٰذا اس سے مرزائیوں کو کیا لینا دینا؟ بلکہ ابن حجرؒ نے تو ہماری تائید فرمائی ہے۔ کہ مرزا ملعون جھوٹا دجال ہے۔ نہ اس نے دجال کو قتل کیا نہ وہ بنی اسرائیلی نبی عیسیٰ ابن مریم ہے۔ نہ اس پر اللہ نے جبرئیل کے ذریعہ سے کوئی وحی بھیجی! وہ تو انگریزوں کا پٹھو، مغل کا بچہ ہے، اس کو وحی والہام سے کیا واسطہ؟

گر ہما از جہاں شود معدوم
کس نیاید بزیر سایہ بوم۔

مسئلہ بھی نکل آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ اور آپ کی وحی آخری وحی۔ کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی بھی نازل ہونے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں پچھلی کتابوں اور وحی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا ذکر بھی ضروری ہوتا' بلکہ اس کی ضرورت زیادہ تھی' کیونکہ تورات و انجیل اور تمام کتب سابقہ پر ایمان لانا تو پہلے سے جاری اور معلوم تھا' اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی سلسلہ وحی اور نبوت جاری ہوتا تو ضرورت اس کی تھی کہ اس کتاب اور اس نبی کا ذکر زیادہ اہتمام سے کیا جاتا جو بعد میں آنے والے ہوں تاکہ کسی کو اشتباہ نہ رہے۔

مگر قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاء کا ذکر فرمایا۔ بعد میں آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں' پھر صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں یہ مضمون اول سے آخر تک مختلف مقامات میں چالیس پچاس آیتوں میں آیا ہے سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء پہلی وحی پہلی کتابوں کا ذکر ہے کسی ایک آیت میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ آئندہ بھی کوئی وحی یا نبی آنے والا ہے جس پر ایمان لانا ہے

مثلاً ارشاد ہے

۱- وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ: نحل۔ ۲- وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ: مومن۔ ۳- وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ رُسُلاً: روم۔ ۴- وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ: نساء ۵- وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْکَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِکَ: زمر۔ ۶- کَذٰلِکَ يُوْحِيْ اِلَيْکَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِکَ: شوریٰ۔ ۷- کَمَا کُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ: بقرہ۔ ۸- سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا (اسرائیل)

ان آیات میں اور انکی امثال دوسری آیات میں جہاں کہیں نبی یا رسول یا وحی و کتاب بھیجنے کا ذکر ہے سب کے ساتھ من قبل اور من قبلک کی قید لگی ہوئی ہے کہیں من بعدک کا اشارہ تک نہیں' اگر ختم نبوت اور انقطاع وحی کا دوسری آیات میں صراحۃ ذکر نہ ہوتا تو قرآن کا یہ طرز ہی اس مضمون کی شہادت کے لئے کافی تھا' مسئلہ ختم نبوت پر قرآنی

تصریحات اور احادیث متواترہ کی شہادت اور امت کا اجماع تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو میرا رسالہ "ختم نبوت" دیکھا جائے۔

متقین کی تفسیر میں صفت ایمان بالآخرۃ۔ اس آیت میں متقین کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' آخرت سے مراد وہ دار آخرت ہے جس کو قرآن میں دار القرار' دار الحیوان اور عقبیٰ کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے' اور پورا قرآن اس کے ذکر اور اس کے ہولناک حالات سے بھرا ہوا ہے۔

آخرت پر ایمان ایک انقلابی عقیدہ ہے۔ آخرت پر ایمان لانا اگرچہ ایمان بالغیب کے لفظ میں آچکا ہے' مگر اس کو پھر صراحۃً اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ اجزاء ایمان میں اس حیثیت سے سب میں اہم جزء ہے کہ مقتضاء ایمان پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا اسی کا اثر ہے'

اور اسلامی عقائد میں یہی وہ انقلابی عقیدہ ہے جس نے دنیا کی کایا پلٹ کر دی' اور جس نے آسمانی تعلیم پر عمل کرنے والوں کو پہلے اخلاق و اعمال میں اور پھر دنیا کی سیاست میں بھی تمام اقوام عالم کے مقابلے میں ایک امتیازی مقام عطا فرمایا' اور جو عقیدہ توحید و رسالت کی طرح تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلا آتا ہے وجہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے سامنے صرف دنیا کی زندگی اور اسی کی عیش و عشرت ان کا انتہائی مقصود ہے' اسی کی تکلیف سمجھتے ہیں' آخرت کی زندگی اور اعمال کے حساب و کتاب اور جزاء و سزا کو وہ نہیں مانتے' وہ جب جھوٹ سچ اور حرام و حلال کی تفریق کو اپنی عیش و عشرت میں خلل انداز ہوتے دیکھیں تو ان کو جرائم سے روکنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی' حکومت کے تعزیری قوانین قطعاً انسداد جرائم اور اصلاح اخلاق کے لئے کافی نہیں' عادی مجرم تو ان سزاؤں کے عادی ہو ہی جاتے ہیں' کوئی شریف انسان اگر تعزیری سزا کے خوف سے اپنی خواہشات کو ترک بھی کرے تو اسی حد تک کہ اس کو حکومت کی دار و گیر کا خطرہ ہو' خلوتوں میں اور راز دارانہ طریقوں پر جہاں حکومت کے قوانین کی رسائی نہیں' اسے کون مجبور کر سکتا ہے کہ اپنی عیش و عشرت کو چھوڑ کر پابندیوں کا طوق اپنے گلے میں ڈالے۔

ہاں وہ صرف عقیدۂ آخرت اور خوف خدا ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی ظاہری اور باطنی حالت جلوت و خلوت میں یکساں ہوتی ہے' وہ یقین رکھتا ہے کہ مکان کے

بند دروازوں اور ان پر پہرہ چوکیوں میں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کوئی دیکھنے والا مجھے دیکھ رہا ہے' کوئی لکھنے والا میرے اعمال کو لکھ رہا ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پورا عمل کرنے کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکباز معاشرہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی صورت دیکھ کر چال چلن دیکھ کر لوگ دل وجان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے' یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اس آیت میں بالآخرۃ کے ساتھ لفظ یؤمنون نہیں بلکہ یوقنون کا استعمال فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ ایمان کا مقابل تکذیب ہے' اور ایقان کا مقابل شک وتردد' اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی کی محض تصدیق کرنا مقصد کو پورا نہیں کرتا' بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو' متقین کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب' پھر جزاء وسزا کا نقشہ ہر وقت ان کے سامنے رہتا ہے۔

وہ شخص جو دوسروں کا حق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے لڑاتا ہے' جھوٹی گواہی دے رہا ہے' اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف حرام مال کمانے اور کھانے میں لگا ہوا ہے' یا دنیا کے ذلیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے خلاف شرع ذرائع اختیار کر رہا ہے' وہ ہزار بار آخرت پر ایمان لانے کا اقرار کرے اور ظاہر شریعت میں اس کو مومن کہا بھی جائے لیکن قرآن جس ایقان کا مطالبہ کرتا ہے وہ اسے حاصل نہیں' اور وہی انسان کی زندگی میں انقلاب لانے والی چیز ہے' اسی کے نتیجے میں متقین کو ہدایت اور کامیابی کا وہ انعام دیا گیا ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ کی پانچویں آیت میں ہے' اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یعنی بس یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے' اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب'

تفسیر ماجدی:

ترجمہ: وَبِالْاٰخِرَةِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ: اور آخرت پر بھی (وہ) پورا یقین رکھتے ہیں۔ ۱۳

تفسیر:۔

چھٹا اور آخری وصف ان متقین اہل ضمیر کا بیان ہوا، جو قرآن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ الآخرۃ سے مراد ہے دار الآخرۃ یا عالم آخرۃ۔ یعنی وہ عالم جو موجودہ سلسلہ زندگی کے بعد شروع ہوگا۔ اس کو آخرۃ کہا ہے اسی لحاظ سے جاتا ہے کہ وہ اس ناسوتی زندگی کے خاتمہ کے بعد پیش آئیگا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر کہیں صرف آخرۃ سے۔ ویعبر بالدار الآخرۃ عن النشأۃ الثانیۃ وربما ترک ذکر الدار (راغب) انما وصفت بذالک لمصیرھا آخرۃ لاولیٰ کانت قبلھا (ابن جریر) جزا و سزا کے لئے ایک مستقل آئندہ عالم پر یقین رکھنا دین صحیح کے لوازم میں سے ہے۔ یہیں سے تردید ہوگئی کہ ان باطل مذہبوں کی جو کہنے کو تو مذہب ہیں، لیکن یا تو سرے سے جزاء اعمال ہی کے قائل نہیں یا قائل تو ہیں لیکن اس جزا کا محل و مکان اسی عالم ناسوت کو سمجھتے ہیں۔ خواہ ایک ہی قالب میں یا کئی قالب میں۔ بعض جدید اہل باطل نے الآخرۃ کا ترجمہ کیا ہے ''زمانہ آخری وحی'' تا کہ اس سے ان کی خود ساختہ نبوت کا اجرا قرآن سے ثابت ہو۔ لیکن یہ نہ ترجمہ ہے نہ تفسیر یہ صرف تمسخر و تلعب ہے، قرآن مجید اور لغت عربی دونوں کے ساتھ۔ یوقنون۔ ایقان یا یقین کے معنی یہ نہیں کہ محض عقل سے کسی عقیدہ کو استدلالاً مان لے۔ یا با دل نخواستہ سکوت پر مجبور ہو جائے۔ یا دماغ اسکے مان لینے کا محض سرسری، رسمی، سطحی طور پر لفظی اقرار کر لے۔ جیسا کہ اکثر فلسفیانہ نظریوں کے ساتھ معاملہ رہتا ہے بلکہ یقین یہ ہے کہ اس مسئلہ پر دل و جان سے اعتقاد جم جائے، اور عقل، جذبات ارادہ سب پر وہی چھا جائے۔ یقین کی راہ شک، گمان، خیال سب سے الگ ہے الیقین ازاحۃ الشک (تاج) الیقین من صفۃ العلم فوق المعرفۃ والدرایۃ و اخواتھا (راغب) الایقان اتقان العلم بانتفاء الشک والشبھۃ عنہ (کشاف) الیقین العلم دون الشک (قرطبی) و بالآخرۃ ھم یوقنون۔ یقین کا مرتبہ یوں بھی محض علم سے قوی تر تھا، پھر فقرہ کی ترکیب یعنی فعل یُوقِنُوْنَ کا تاخر اور بِالْآخِرَۃِ کا تقدم اور ہم کے اضافہ نے قوت کئی درجہ اور بڑھا دی مطلب یہ ہوا کہ مومنین متقین کے نزدیک آخرۃ اس درجہ اہم ہے کہ گویا وہ بس اسی پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی عقیدہ ان کی زندگی میں رچا بسا رہتا ہے۔

ترجمہ کنز الایمان۔

ترجمہ: اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمھاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا ۸ اور آخرت پر یقین رکھیں ۹۔

تفسیر:۔

۸۔ اس آیت میں اہل کتاب سے وہ مومنین مراد ہیں جو اپنی کتاب اور تمام پچھلی آسمانی کتابوں ۹ یعنی دار آخرت اور جو کچھ اس میں ہے جزا و حساب وغیرہ سب پر ایسا یقین و اطمینان رکھتے ہیں کہ ذرا شک و شبہ نہیں اس میں اہل کتاب وغیرہ کفار پر تعریض ہے جنکے اعتقاد آخرت کے متعلق فاسد ہیں۔

تفسیر ثنائی۔

ترجمہ: یہی لوگ قیامت کو مانتے ہیں۔

تفسیر:۔

یہی لوگ قیامت کو مانتے ہیں۔ جو ہر وقت اسی کی یہی لوگ فکر میں لگے رہتے ہیں۔ جو کام کرتے ہیں قیامت کی عزت اور ذلت کا لحاظ اس میں پہلے کر لیتے ہیں۔

تفہیم القرآن۔ (ص ۵۱ ج ۱ مطبوعہ لاہور)

ترجمہ: جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں ۶ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۷

تفسیر:۔

۶۔ یہ پانچویں شرط ہے کہ آدمی اُن تمام کتابوں کو برحق تسلیم کرے جو وحی کے ذریعے سے خدا نے محمد ﷺ اور ان سے پہلے کے انبیاء پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں نازل کیں۔ اس شرط کی بنا پر قرآن کی ہدایت کا دروازہ ان سب لوگوں پر بند ہے جو سرے سے اس ضرورت ہی کے قائل نہ ہوں کہ انسان کو خدا کی طرف سے ہدایت ملنی

چاہیے، یا اس ضرورت کے قائل ہوں مگر اس کے لئے وحی و رسالت کی طرف رجوع کرنا غیر ضروری سمجھتے ہوں اور خود کچھ نظریات قائم کر کے انہیں کو خدائی ہدایت قرار دے بیٹھیں، یا آسمانی کتابوں کے لئے قائل ہوں، مگر صرف اس کتاب یا ان کتابوں پر ایمان لائیں جنہیں ان کے باپ دادا مانتے چلے آئے ہیں، رہیں اسی سرچشمے سے نکلی ہوئی دوسری ہدایات تو وہ ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسے سب لوگوں کو الگ کر کے قرآن اپنا چشمہ فیض صرف اُن لوگوں کے لئے کھولتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی ہدایت کا محتاج بھی مانتے ہوں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہوں کہ خدا کی یہ ہدایت ہر انسان کے پاس الگ الگ نہیں آتی بلکہ انبیاء اور کتب آسمانی کے ذریعے سے ہی خلق تک پہنچتی ہے، اور پھر وہ کسی نسلی و قومی تعصب میں بھی مبتلا نہ ہوں بلکہ خالص حق کے پرستار ہوں، اس لئے حق جہاں جہاں جس شکل میں بھی آیا ہے اس کے آگے سر جھکا دیں۔

۵۔ یہ چھٹی اور آخری شرط ہے۔ "آخرت" ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسب ذیل عقائد شامل ہیں۔

(۱) یہ کہ انسان اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں بلکہ اپنے تمام اعمال کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ (۲) یہ کہ دنیا کا موجودہ نظام ابدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر جسے صرف خدا ہی جانتا ہے اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔ (۳) یہ کہ اس عالم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائیگا اور اس میں پوری نوع انسانی کو جو ابتداء آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی بیک وقت دوبارہ پیدا کریگا اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ (۴) یہ کہ خدا کے اس فیصلے کی رو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ بد ٹھہریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ (۵) یہ کہ کامیابی اور ناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی و بدحالی نہیں بلکہ درحقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھہرے۔ اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

عقائد کے اس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو وہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے' کیوں کہ ان باتوں کا انکار تو درکنار اگر کسی کے دل میں ان کی طرف سے شک اور تذبذب کی کیفیت بھی ہو تو اس راستہ پر نہیں چل سکتا جو انسانی زندگی کے لئے قرآن نے تجویز کیا ہے۔

تفسیر جامع البیان طبری ۔ (ص ۱۵۵۔۱۵۶ ج ۱ بیروت)

﴿وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾

قال أبو جعفر: أما الآخرة، فإنها صفة للدار، كما قال جلّ ثناؤه: ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الآخِرَةَ لَهِيَ الحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ وإنما وصفت بذلك لمصيرها آخرة لأولى كانت قبلها كما تقول للرجل: أنعمت عليك مرة بعد أخرى فلم تشكر لي الأولى ولا الآخرة. وإنما صارت الآخرة آخرة للأولى، لتقدم الأولى أمامها، فكذلك الدار الآخرة سميت آخرة لتقدم الدار الأولى أمامها، فصارت التالية لها آخرة. وقد يجوز أن تكون سميت آخرة لتأخرها عن الخلق كما سميت الدنيا دنيا لدنوّها من الخلق. وأما الذي وصف الله جلّ ثناؤه به المؤمنين. بما أنزل الى نبيه محمد ﷺ، وما أنزل إلى من قبله من المرسلين. من إيقانهم به من أمر الآخرة، فهو إيقانهم بما كان المشركون به جاحدين، من البعث والنشر والثواب والعقاب والحساب والميزان، وغير ذلك مما أعد الله لخلقه يوم القيامة. كما:

٢٢١ـ حدثنا به محمد بن حميد، قال: حدثنا سلمة عن محمد بن إسحاق عن محمد بن أبي محمد مولى زيد بن ثابت، عن عكرمة، أو عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس: ﴿وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ أي بالبعث والقيامة والجنة والنار والحساب والميزان، أي لا هؤلاء الذين يزعمون أنهم آمنوا بما كان قبلك، ويكفرون بما جاءك من ربك.

وهذا التأويل من ابن عباس قد صرح عن أن السورة من أولها وإن كانت الآيات التي في أولها من نعت المؤمنين تعريض من الله عز وجلّ بذم

الكفار أهل الكتاب ، الذ ين زعموا أنهم بما جاء ت به رسول الله عز وجل الذين كانوا قبل محمد صلوات الله عليهم وعليه مصد قون وهم بمحمد عليه الصلواة و السلام مكذبو ن ، ولما جاء به من التنزيل جاحدون ، ويد عون مع جحودهم ذلک أنهم مهتدون وأنه لن يدخل الجنة إلا من كان هوداً أو نصارىٰ . فأكذ ب الله جلّ ثناؤه ذلک من قيلهم بقوله : ﴿الم ذٰلِکَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْکَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ وأخبر جلّ ثناؤه عباده أن هذا الكتاب هدى لأهل الايمان بمحمد ﷺ وبما جاء به المصدقين بما أنزل إليه وإلى من قبله من رسله من البينات والهدى خاصة ، دون من كذ ب بمحمد ﷺ وبما جاء به ، وادعى أنه مصدق بمن قبل محمد عليه الصلاة والسلام من الرسل وبما جاء به من الكتب . ثم أكد جلّ ثناؤه أمر المؤمنين من العرب ومن أهل الكتاب المصد قين بمحمد عليه الصلاة والسلام وبما أنزل إليه وإلىٰ من قبله من الرسل بقوله :﴿ أُوْلٰئِکَ عَلىٰ هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ أُوْلٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ فأخبر أنهم هم أهل الهدى والفلاح خاصة دون غيرهم، وأن غيرهم هم أهل الضلال والخسار .

تفسیر کشاف:۔

والآخرة تانيث الآخر الذى هو نقيض الاوّل ' وهي صفة الدار بدليل قوله تلک الدارالآخرة وهي من الصفات الغالبة وكذلک الدنيا وعن نافع انه خففهابان حذف الهمزة والقى حركتها علىٰ اللام كقوله . دابة الارض . وقرأ ابو حية النميرى يؤ قنون بالهمزة جعل الضمة فى جار الواو كانها فيه فقلبها قلب واو وجوه ووقتت ونحوه

لحب المؤقدان الىّ موسىٰ وجعدة اذ اضاء هما الوقود.

تفسیر معالم التنزیل۔ (ص ۳۷، ۳۸، لاہور)

قوله :﴿وَالَّذِ يْنَ يُؤْ مِنُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْکَ﴾ يعني: القرآن ، ﴿وَمَآ أُنْزِلَ

مِنْ قَبْلِکَ﴾: من التوراة والانجيل وسائرالكتب المنزلة على الأنبياء عليهم الصلاة والسلام ، ويترك ابوجعفر وابن كثير و قالون وأهل البصرة ويعقوب كل مدّ يقع بين كل كلمتين ، والآخرون يمد ونها ، وهذه الآية في المؤمنين من أهل الكتب.

قوله :﴿ وَبِالآخِرَةِ﴾ أي. بالدار الآخرة ، سُميت الد نيا: دنيا لد نوها من الآخرة ، وسُميت الآخرة :آخرة لتأخرها وكونها بعد الدنيا،﴿ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ أي : يستيقنون أنها كائنة ، من الإيقان وهو العلم ، وقيل : الإيقان واليقين علم عن استدلال ، ولذلك لا يُسمى الله موقناً ولا علمه يقيناً إذ ليس علمه عن استدلال .

تفسیر کبیر:۔(ص۲۷،ج۱)

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾

واعلم أن قوله:﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرة:۳] عام يتناول كل من آمن بمحمد ﷺ، سواء كان قبل ذلك مؤمناً بموسى وعيسى عليهما السلام ، أوماكان مؤمناً بهما ، ودلالة اللفظ العام على بعض ما دخل فيه التخصيص أضعف من دلالة اللفظ الخاص على ذلك البعض ، لأن العام يحتمل التخصيص و الخاص لا يحتمله ، فلما كانت هذه السورة مدنية ، وقد شرف الله تعالى المسلمين بقوله :﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرة:۳،۲] فذكر بعد ذلك أهل الكتاب الذين آمنوا بالرسول : كعبد الله بن سلام وأمثاله بقوله : ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ﴾ لأن في هذا التخصيص بالذكرمزيد تشريف لهم كما في قوله تعالى :﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكَالَ﴾ [البقرة:۹۸] ثم تخصيص عبدالله بن سلام وأمثاله بهذا التشريف ترغيب لأمثاله في الدين ، فهذا هو السبب في ذكر هذا الخاص بعد ذلك العام ، ثم نقول أما قوله : ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ﴾ ففيه مسائل :

المسألة الأولى : لا نزاع بين أصحابنا وبين المعتزلة في أن الإيمان إذا عدي بالباء فالمراد منه التصديق ، فإذا قلنا فلان آمن بكذا ، فالمراد أنه صدق به ولا يكون المراد أنه صام وصلى ، فالمراد بالإيمان ها هنا التصديق ، بالاتفاق لكن لابد معه من المعرفة لأن الإيمان ها هنا خرج مخرج المدح والمصدق مع الشك لا يأمن أن يكون كاذباً فهو إلى الذم أقرب .

المسألة الثانية: المراد من إنزال الوحي وكون القرآن منزلاً، ومنزلاً ومنزولاً به ، أن جبريل عليه السلام سمع في السماء كلام الله تعالىٰ فنزل على الرسول به ، وهذا كما يقال : نزلت رسالة الأمير من القصر، والرسالة لا تنزل لكن المستمع يسمع الرسالة من علو فينزل ويؤدي في سفل . وقوله الأمير لايفارق ذاته ، ولكن السامع يسمع فينزل ويؤدي بلفظ نفسه ، ويقال فلان ينقل الكلام إذا سمع في موضع وأداه في موضع آخر. فإن قيل كيف سمع جبريل كلام الله تعالىٰ ، وكلامه ليس من الحروف والأصوات عندكم ؟ قلنا يحتمل أن يخلق الله تعالىٰ له سمعاً لكلامه ثم أقدره على عبارة يعبربها عن ذلك الكلام القديم ، ويجوز أن يكون الله خلق في اللوح المحفوظ كتابة بهذا النظم المخصوص فقرأه جبريل عليه السلام فحفظه ، ويجوز أن يخلق الله اصواتاً مقطعة بهذا النظم المخصوص في جسم مخصوص فيتلقفه جبريل عليه السلام ويخلق له علماً ضرورياً بأنه هو العبارة المؤدية لمعنى ذلك الكلام القديم .

المسألة الثالثة:قوله :﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ إِلَيْكَ﴾ هذا الإيمان واجب ، لأنه قال في آخره : ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [البقرة:٥] فثبت أن من لم يكن له هذا الإيمان وجب أن لايكون مفلحاً ، وإذا ثبت أنه واجب وجب تحصيل العلم بما أنزل على محمد ﷺ على سبيل التفصيل ، لأن المرء لا يمكنه أن يقوم بما أوجبه الله عليه علماً وعملاً إلا اذا علمه على سبيل التفصيل ، ولأنه إن لم يعلمه كذلك امتنع عليه القيام به ، إلا أن تحصيل هذا العلم واجب على سبيل الكفاية ، فإن تحصيل العلم بالشرائع النازلة على محمد ﷺ على سبيل التفصيل غير واجب على العامة ، وأما قوله :﴿ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ فالمراد به ما أنزل على الأنبياء الذين

كانوا قبل محمد، والإيمان به واجب على الجملة، لأن الله تعالىٰ ما تعبدنا الآن به حتىٰ يلزمنا معرفته على التفصيل ، بل إن عرفنا شيئاً من تفاصيله فهناك يجب علينا الإيمان بتلك التفاصيل ، وأما قوله: ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ ففيه مسائل :

المسألة الأولى : الآخرة صفة الدار الآخرة ، وسميت بذلك لأنها متأخرة عن الدنيا وقيل للدنيا دنيا لأنها أدنىٰ من الآخرة .

المسألة الثانية :اليقين هو العلم بالشيء بعد أن كان صاحبه شاكاً فيه ، فلذلك لا يقول القائل : تيقنت وجود نفسي ، وتيقنت أن السماء فوقي لما أن العلم به غير مستدرك ، ويقال ذلك في العلم الحادث بالأمور سواء كان ذلك العلم ضرورياً أو استدلالياً ، فيقول القائل: تيقنت ما أردته بهذا الكلام وإن كان قد علم مراده بالاضطرار ، ويقول تيقنت أن الإله واحد وإن كان قد علمه بالاكتساب ، ولذلك لايوصف الله تعالىٰ بانه يتيقن الأشياء.

المسألة الثالثة : أن الله تعالىٰ مدحهم على كونهم متيقنين بالآخرة ، ومعلوم أنه لايمدح المرء بان يتيقن وجود الآخرة فقط ، بل لا يستحق المدح إلا إذا تيقن وجود الآخرة مع ما فيها من الحساب والسؤال وإدخال المؤمنين الجنة، والكافرين النار. روي عنه عليه السلام أنه قال :"يا عجباً كل العجب من الشاك في الله وهو يرى خلقه ، وعجباً ممن يعرف النشأة الأولىٰ ثم ينكر النشأة الآخرة ، وعجباً ممن ينكر البعث والنشور وهو في كل يوم وليلة يموت ويحيا . يعني النوم واليقظة . وعجباً ممن يؤمن بالجنة وما فيها من النعيم ثم يسعىٰ لدار الغرور ، وعجباً من المتكبر الفخور وهو يعلم أن أوله نطفة مذرة وآخره جيفة قذرة "

تفسیر ابن کثیر: (ص۴۲ ج ۱، بیروت)

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾.

قال ابن عباس وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

أي يصدقون بما جئت به من الله وما جاء به من قبلك من المرسلين لا يفرقون بينهم ولا يجحدون ما جاؤهم به من ربهم وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ أي بالبعث والقيامة والجنة والنار والحساب والميزان وانما سميت الآخرة لأنها بعد الدنيا وقد اختلفت المفسرون في الموصوفين هنا هل هم الموصوفون بما تقدم من قوله تعالى : ﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ ومن هم ؟ على ثلاثة اقوال حكاها ابن جرير أحدها أن الموصوفين أولا هم الموصوفون ثانياً وهم كل مؤمن مؤمنو العرب ومؤمنو اهل الكتاب وغيرهم قاله مجاهد وأبو العالية والربيع بن أنس وقتادة ، والثاني هما واحد وهم مؤمنو أهل الكتاب وعلى هذين تكون الواو عاطفة على صفاة كما قال تعالى : ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى . وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى . فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَى﴾ وكما قال الشاعر:

الى الملك القوم وابن الهمام وليث الكتيبة في المزدحم.

فعطف الصفات بعضها على بعض والموصوف واحد ، والثالث : أن الموصوفين أولا مؤمنو العرب والموصوفون ثانيا بقوله : ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ لمؤمني أهل الكتاب ونقله السدي في تفسيره عن ابن عباس وابن مسعود وأناس من الصحابة واختاره ابن جرير رحمه الله ويستشهد لما قال بقوله تعالى :﴿ وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ﴾ الآية وبقوله تعالى :﴿ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ هُم بِهِ يُؤْمِنُونَ وَإِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴾ وبما ثبت في الصحيحين من حديث الشعبي عن أبي بردة عن أبي موسى أن رسول الله ﷺ قال : " ثلاثة يؤتون اجرهم مرتين رجل من أهل الكتاب آمن بنبيه وآمن بي ورجل مملوك أدى حق الله وحق مواليه ورجل أدب جاريته فأحسن تأديبها ثم أعتقها وتزوجها" واما ابن جرير فما استشهد على صحة ماقال الا بمناسبة وهي أن الله وصف في أول هذه السورة المؤمنين والكافرين فكما أنه صنف الكافرين الى

صنفين كافر ومنافق فكذ لك المؤمنون صنفهم الى صنفين عربي و كتابي (قلت) والظاهر قول مجاهد فيما رواه الثوري عن رجل عن مجاهد ورواه غير واحد عن ابن أبي نجيح عن مجاهد أنه قال : اربع آيات من اول سورة البقرة في نعت المؤمنين وآيتان في نعت الكافرين وثلاثة عشر في المنافقين هذه الآيات الاربع عامات في كل مؤمن اتصف بها من عربي وعجمي وكتابي من انسي وجني وليس تصح واحدة من هذه الصفات بدون الاخرى بل كل واحدة مستلزمة للاخرى وشرط معها فلا يصح الايمان بالغيب واقام الصلاة والزكاة الا مع الايمان بما جاء به الرسول ﷺ وما جاء به من قبله من الرسل صلوات الله وسلامه عليهم اجمعين والأيقان بالآخرة كما أن هذا لا يصح الا بذاك وقد امرالله المؤمنين بذلك كما قال:﴿ يا أيها الذين آمنو آمنو بالله ورسوله والكتاب الذين نزل علي رسول والكتاب الذى انزل من قبل ﴾ الآية وقال تعالى :﴿ ولا تجادلوا أهل الكتاب الا بالتي هو أحسن الا الذ ين ظلمو منهم وقولوا آمنا بالذ ى أنزل الينا وانزل اليكم والهنا والهكم واحد ﴾ الآية وقال تعالى: ﴿يا أيها الذ ين أوتوا الكتاب آمنوا بما نزلنا مصدقاً لما معكم﴾ وقال تعالى ﴿ قل يا أهل الكتاب لستم على شيء حتي تقيموا التوراة والانجيل وما انزل اليكم من ربكم﴾ وأخبر تعالي عن المؤمنين كلهم بذ لك فقال تعالي: ﴿آمن الرسول بما انزل اليه من ربه والمؤمنون كل آمن بالله ملا ئكته وكتبه ورسله لا نفرق بين احد من رسله﴾ وقال تعا لي: ﴿والذين آمنوا بالله ورسله ولم يفرق بين أحد منهم ﴾ الي غير ذلك من الآيات الدالة على أمر جميع المؤمنين بالإيمان بالله ورسله وكتبه لكن لمؤمني أهل الكتاب خصوصية وذلك أنهم يؤمنون بما بايد هم مفصلا فاذا دخلوا في الاسلام وآمنوا به مفصلا كان لهم على ذلك الاجر مرتين واما غيرهم فانما يحصل له الايمان بما تقدم مجملاً كما جاء في الصحيح " إذا حد ثكم أهل الكتاب فلا تكذبوهم ولا تصد قوهم ولكن قولوا آمنا بالذى انزل الينا وانزل اليكم " ولكن يكون ايمان كثير من العرب بالاسلام الذى بعث به محمد ﷺ أتم واكمل واعم واشمل من ايمان من دخل منهم في الاسلام فهم وان حصل لهم اجران من تلك الحيثية فغيرهم يحصل له من التصديق ما ينيف ثوابه على الاجرين اللذ ين حصلا لهم والله اعلم.

آیت: (۳)

"وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ (بقرہ: ۱۲۴)

ترجمہ: اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں پھر اس نے وہ پوری کیں تب فرمایا میں تجھکو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا۔ بولا اور میری اولاد میں سے بھی فرمایا نہیں پہنچے گا میرا عہد ظالموں کو۔

خلاصہ:۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لئے گئے امتحانات، اور اس میں ان کی کامیابی اور اس کے صلہ میں دیئے جانے والے انعام کا ذکر کیا ہے۔ کہ آپ کی درخواست پر پیشوائی کا انعام آپ کی ذریت میں سے بعض فرمانبرداروں کو بھی ملے گا لیکن جو ظالم و نافرمان ہو گئے وہ اس انعام سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام کی ذریت بنی اسرائیل میں ایک عرصہ تک نبوت و پیشوائی رہی لیکن جب بنی اسرائیل بگڑ گئے اور نافرمان ہو گئے تو بنی اسماعیل میں منتقل ہو گئی اور محمد عربی ﷺ آخری نبی بن کر آئے۔ اور اب آپ ﷺ ہی قیامت تک کے لئے نبی ہیں۔ جو بنی اسماعیل میں سے ہیں۔ گویا نبوت آج بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی ذریت میں ہے، جو قیامت تک رہے گی۔ اب کوئی مغل بچہ نبی نہیں بن سکتا۔ اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

قادیانی استدلال:

اور جس وقت آزمایا ابراہیم علیہ السلام کو رب اس کے نے ساتھ کئی باتوں کے۔ پس پورا کیا ان کو۔ کہا تحقیق میں کرنے والا ہوں تجھ کو واسطے لوگوں کے امام اور کہا میری اولاد سے کہا نہ پہنچے گا عہد میرے ظالموں کو۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ عہد نبوت نسل ابراہیم علیہ السلام کے

ساتھ ضرور پورا ہو گا۔ وجہ یہ کہ جب نسل ابراہیمی ظالم ہو جائے گی تو ان سے نبوت چھین لی جائے گی۔ کیونکہ امت محمدیہ میں نبوت جاری نہیں۔ لہذا یہ امت ظالم ہو گئی اور اگر ظالم نہیں تو امت محمدیہ میں نبوت جاری ہے۔

جواب نمبرا:-

آیت کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جو ظالم ہو اس کو یہ نعمت نہ ملے مگر ہر غیر ظالم کے لئے نبوت جاری نہیں۔ ہاں اگر نبوت آنحضرت ﷺ کے بعد جاری ہوتی تو پھر غیر ظالموں کو مل سکتی تھی۔ مگر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان موجود ہے ''ما کان محمد ابا احد من رجالکم الی قولہ وخاتم النبیین'' مرزا قادیانی نے خود آیت ختم نبوت کا ترجمہ کیا ہے:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں۔ مگر وہ رسول اللہ ہے اور ختم کرنے والا ہے نبیوں کا۔ یہ آیت بھی صاف دلالت کر رہی ہے کہ بعد ہمارے نبی ﷺ کے کوئی رسول دنیا میں نہیں آئے گا۔'' (ازالہ اوہام ص ۶۱۴ خ ج ۳)

۲- حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ مگر دکھاؤ کہ آنحضرت ﷺ نے بھی ایسی دعا مانگی ہے۔ بلکہ آپ ﷺ نے صریح اور واضح الفاظ میں فرمایا: ''ان النبوۃ والرسالۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی'' (ترمذی شریف ص ۵۱ ج ۲) ثابت ہوا کہ نبوت جاری نہیں۔

۳- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں صاحب کتاب نبی بھی ہوتے ہیں۔ لہذا تمہارے قاعدے کے مطابق کوئی نبی صاحب کتاب بھی ضرور آنا چاہئے۔ حالانکہ تم اس کے خود قائل نہیں۔ جس دلیل سے صاحب کتاب نبی آنے کی ممانعت ہے وہی دلیل مطلقاً کسی نبی کے آنے سے مانع ہے۔

۴- اگر کہو کہ وہ جسے نبوت نہ ملے ظالم ہوتا ہے تو صحابہ کرامؓ اور تمام امت محمدیہ ﷺ اب تک ظالم ٹھہرتی ہے۔ اور مرزا غلام احمد قادیانی کی وفات کے بعد تمام قادیانی امت بھی ظالم ٹھہرتی ہے۔

۵- مذکورہ آیت تو یہ بتاتی ہے کہ جو لوگ آزمائشوں میں کامیاب ہوتے ہیں وہ دنیا میں امام بنائے جاتے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام اس امامت کے منصب سے پہلے بھی نبی بن چکے تھے۔ یہ امامت کس نوعیت کی تھی لکھا ہے کہ: ''خدا نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازے پر قابض ہوگی اور تیری نسل سے دنیا کی ساری قومیں برکت پائیں گی۔'' (پیدائش آیت ۱۷، ۱۸ باب ۲۲) پھر فرمایا: ''میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں۔''
(پیدائش آیت ۸ باب ۱۷)

الحاصل آیت کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی ذریت طیبہ کو دنیا میں سرفراز کرنے کا عہد تھا۔ جس کا اظہار سورۃ حدید کے آخر میں واضح کر دیا کہ ہم نے آپ کی اولاد میں کتاب اور نبوت کو مرتکز کر دیا۔ پھر اس کے بعد حضرت مسیح کا ذکر فرمایا جنہوں نے اس سلسلہ انبیاء کے آخری فرد کامل کا اعلان کر دیا۔ اس فرد کامل نے تشریف لا کر سلسلہ نبوت کا کلی اختتام و انقطاع کا اعلان فرما کر حقیقت واضح کر دی۔

مغالطہ:۔

> ''اور میرے نزدیک اس جگہ یہی ذکر ہے امامت کا مقام بنو اسحق کو نہیں ملے گا کیوں کہ وہ بحیثیت جماعت ظالم ہو جانے والے تھے۔ ہاں بنو اسماعیل کو ملے گا کیوں کہ وہ بحیثیت جماعت کبھی ظالم نہیں ہونگے۔ بلکہ ہر زمانہ میں ان میں ایسے لوگ ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی وجہ سے رسول کریم ﷺ کو تمام دنیا کا امام بنایا گیا۔ اور آپ کی امت میں سے اس زمانے میں حضرت مسیح (مرزا قادیانی۔ ناقل) کو یہ مقام بخشا گیا۔''
> (تفسیر کبیر: مرزا بشیر الدین ص ۱۶۲ ج ۲)

جواب ا۔

رسول کریم ﷺ کو تمام دنیا کا امام بنایا گیا اور قیامت تک کے لئے بنایا گیا ہے تو اب کسی مغل نادان بچے کو یہ مقام دینے کی ضرورت ہی کیا رہی۔ کیا مرزئیوں کو حضور ﷺ کی امامت کافی نہیں؟

۲- بقول تمھارے اب یہ عہدہ بنو اسماعیل کو ہی ملے گا یہاں تک کہ جس خاندان کو پہلے ملا کرتا تھا اب انھیں بھی نہیں ملے گا۔ تو کسی مغل بچہ کو یہ مقام کیسے ملے گا؟

۳- مرزا تو کسی طرح اس مقام کا حق دار ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ وہ باون برس تک حیات عیسیٰ کا عقیدہ رکھتا رہا جس کو وہ اپنی زبان سے شرک قرار دیتا ہے لہذا وہ مشرک ہوا۔ اسی طرح وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ ناحق، ظالم قوم انگریزوں کی حمایت کرتا رہا جو ہندوستان کی زمین پر ظلم وزیادتی سے قابض ہو گئے اور مسلمانوں سے حکومت غلط طور پر چھین لی تھی۔ مرزا ان ظالم انگریزوں کا جان مال سے تعاون کرتا رہا۔ لہذا سب سے بڑا ظالم تو مرزا ہی ہے پھر وہ یہ منصب ومقام کیسے پا سکتا ہے؟ علاوہ ازیں مرزا اسا جھوٹا تھا آج تک مرزائی اسے سچا اور شریف انسان تک ثابت نہ کر سکے تو اسے قرآنی آیت کا مصداق بنانا تحریف قرآن ہے جو اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی ابولہب اور ابوجہل کو اس آیت کا مصداق بنانے لگے۔

کیا لکھوں تیری غلط راہ وروش پر ظالم
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

کیا فرماتے ہیں مفسرین

معارف القرآن۔ (ص ۲۵۱-۲۵۹ ج ۱)

خلاصہ تفسیر از بیان القرآن۔

اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں (اپنے احکام میں) اور وہ ان کو پورے طور سے بجا لائے (اس وقت) حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا کہ میں تم کو (اس کے صلہ میں نبوت دے کر یا امت بڑھا کر) لوگوں کا مقتدا بناؤں گا' انھوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کسی کو (نبوت دیجئے) ارشاد ہوا کہ (آپ کی درخواست منظور ہے مگر اس کا ضابطہ سن لیجئے کہ) میرا (یہ) عہدہ (نبوت) خلاف ورزی (قانون) کرنے والوں کو نہ ملے گا (سو ایسے لوگوں کو تو صاف جواب ہے' البتہ کرنے والوں میں سے بعض کو نبوت دی جائے گی)

احکام و مسائل۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف امتحانات اور ان میں ان کی کامیابی پھر اس کے انعام وصلہ کا بیان ہے' اور پھر جب حضرت خلیل اللہ نے ازراہ شفقت اپنی اولاد کے لئے بھی اسی انعام کی درخواست کی' تو انعام پانے کا ایک ضابطہ ارشاد فرما دیا گیا' جس میں حضرت خلیل اللہ کی درخواست کی منظوری مشروط صورت میں دی گئی' کہ یہ انعام آپ کی ذریت کو بھی ملے گا' مگر جو لوگ ذریت میں سے نافرمان اور ظالم ہونگے وہ یہ انعام نہ پاسکیں گے'

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔

اول یہ کہ امتحان کسی شخص کی قابلیت معلوم کرنے کے لئے لیا جاتا ہے' اور اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہیں کسی بھی شخص کا کوئی حال یا کمال ان پر مخفی نہیں پھر اس امتحان کا مقصد کیا تھا؟

دوسرے یہ کہ امتحان کس کس عنوان سے لیا گیا
تیسرے یہ کہ کامیابی کس صورت اور کس نوعیت کی رہی
چوتھے یہ کہ انعام کیا دیا گیا اور اس کی حیثیت کیا ہے
پانچویں یہ کہ اس انعام کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس کی پوری تشریح و تفصیل
ان پانچوں سوالات کے جوابات بالتفصیل ملاحظہ فرمائیے:

پہلی بات کہ امتحان کا مقصد کیا تھا؟ قرآن کے ایک لفظ ربہ نے اس کو حل کر دیا ہے، جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس امتحان کے ممتحن خود اللہ جل شانہ ہیں اور ان کے اسماء حسنیٰ میں سے اس جگہ لفظ رب لا کر شان ربوبیت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو آہستہ آہستہ درجہ کمال تک پہونچانا،

مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ ابتلاء وامتحان کسی جرم کی پاداش میں یا نامعلوم قابلیت کا علم حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ شان تربیت وربوبیت اس کا منشاء ہے ان آزمائشوں کے ذریعہ اپنے خلیل کی تربیت کر کے ان کے درجات ومقامات تک پہونچانا مقصود ہے، پھر اس جملہ میں مفعول کو مقدم اور فاعل کو موخر کر کے یوں ارشاد ہوا وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جلالت شان کو اور نمایاں فرمایا گیا،

دوسرا سوال کہ امتحان کس عنوان سے لیا گیا؟ اس کے متعلق قرآن شریف میں تو صرف کلمات کا لفظ آیا ہے اور اس لفظ کی تفسیر وتشریح میں حضرات صحابہ وتابعین کے مختلف اقوال ہیں، کسی نے احکام الٰہیہ میں سے تیس چیزیں شمار کی ہیں، کسی نے دس بتلائی ہیں اور کسی نے اور کچھ کم وبیش دوسری چیزیں بتائی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اختلاف نہیں، وہ چیزیں سب کی سب ہی حضرت خلیل اللہ کے مضامین امتحان تھے، امام تفسیر ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ کی یہی رائے ہے۔

یہی مضامین امتحان جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی مدارس کے امتحانات کی طرح فنی مسائل اور ان کی تحقیقات نہیں بلکہ اخلاقی قدروں اور عملی ثابت قدمی کی جانچ ہے اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہ عزوجلال میں جس چیز کی قیمت ہے وہ علمی موشگافیاں نہیں بلکہ عملی اور اخلاقی برتری ہے، اب ان مضامین امتحان میں سے چند اہم چیزیں سنئے:

حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی خلت کا خلعت خاص عطا فرمایا جائے اس لئے ان کو سخت امتحانات سے گذارا گیا، پوری قوم کی قوم حتیٰ کہ اپنا خاندان سب کے سب بت پرستی میں مبتلا تھے سب کے عقائد و رسوم سے مختلف ایک دین حنیف ان کو عطا کیا گیا، اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طرف دعوت دینے کا بار گراں آپ پر ڈالا گیا، آپ نے پیغمبرانہ جرأت و ہمت کے ساتھ بے خوف و خطر قوم کو خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف بلایا، بت پرستی کی شرمناک رسم کی خرابیاں مختلف عنوانات سے بیان کیں، عملی طور پر بتوں کے خلاف جہاد کیا، پوری قوم کی قوم آمادۂ جنگ وجدال ہوگئی، بادشاہ وقت نمرود اور اسکی قوم نے آپ کو آگ میں ڈال کر زندہ جلا دینے کا فیصلہ کر لیا، اللہ کے خلیل نے اپنے مولیٰ کی رضامندی کے لئے ان سب بلاؤں پر راضی ہو کر اپنے آپ کو آگ میں ڈال دینے کے لئے پیش کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کو امتحان میں کامیاب پایا تو آگ کو حکم دیا

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ۔ ہم نے حکم دیدیا کہ اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور ذریعۂ سلامتی بن جا،

جس وقت یہ حکم خداوندی آتش نمرود کے متعلق آیا تو حکم کے الفاظ عام تھے، کسی خاص آگ کی تعیین کر کے حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے پوری دنیا میں جہاں کہیں آگ موجود تھی اس حکم خداوندی کے آتے ہی اپنی اپنی جگہ ہر آگ ٹھنڈی ہوگئی، اور نار نمرود بھی اس زمرہ کا فرد بن کر ٹھنڈی پڑ گئی، قرآن میں لفظ برداً کے ساتھ سلاماً کا اضافہ اس لئے فرمایا گیا کہ کسی چیز کی ٹھنڈک حد اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ بھی برف کی طرح تکلیف دہ بلکہ مہلک ہوجاتی ہے، اگر لفظ سلاماً ارشاد نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ آگ برف کی طرح ایسی ٹھنڈی ہوجاتی جو بجائے خود ایک عذاب بنجاتی جیسے جہنم میں ایک عذاب زمہریر کا بھی ہے،

اس امتحان سے فارغ ہوکر دوسرا امتحان یہ لیا گیا کہ اپنے اصلی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر جائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رضاء خداوندی کی تڑپ میں قوم و وطن کو بھی خیر باد کہہ دیا اور مع اہل وعیال ہجرت کر کے شام چلے آئے

آنکہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خاناں را چہ کند

اب قوم ووطن کو چھوڑ کر ملک شام میں قیام کیا ہی تھا کہ یہ حکم ملا کہ بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو ان کے شیرخوار بچے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر یہاں سے بھی کوچ کریں (ابن کثیر)

جبرئیل امین آئے اور دونوں کو ساتھ لے کر چلے' راستہ میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آتی تو حضرت خلیل فرماتے کہ یہیں ٹھہرا دیا جائے' جبرئیل فرماتے کہ یہاں کا حکم نہیں' منزل آگے ہے' جب وہ چٹیل میدان اور گرم ریگستان آ جاتا ہے جہاں آگے کسی وقت بیت اللہ کی تعمیر اور شہر مکہ کی بستی بسانا مقدر تھا' اس ریگستان میں آپ کو اتار دیا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کے خلیل اپنے پروردگار کی محبت میں مسرور وطن اسی چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل میں بی بی کو لے کر ٹھہر جاتے ہیں' لیکن یہ امتحان اسی پر ختم نہیں ہو جاتا' بلکہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملتا ہے کہ بی بی اور بچے کو یہیں چھوڑ دیں اور خود ملک شام کو واپس ہو جائیں' اللہ کا خلیل حکم پاتے ہی اس کی تعمیل میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے' اور شام کی طرف روانہ ہو جاتا ہے' تعمیل حکم میں اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کہ بی بی کو یہ اطلاع ہی دیدے کہ مجھے چونکہ خدا کا یہ حکم ملا ہے اس لئے میں جا رہا ہوں' حضرت ہاجرہ علیہا السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو پکارتی ہیں مگر آپ جواب نہیں دیتے' پھر پکارتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس لق ودق میدان میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو' اس کا جواب بھی نہیں دیتے' مگر وہ بی بی بھی خلیل اللہ کی بی بی تھیں سمجھ گئیں کہ ماجرا کیا ہے' اور کہنے لگیں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ملا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں' حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو بھی جب حکم خداوندی کا علم ہو گیا تو نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا کہ جائیے جس مالک نے آپ کو چلے جانے کا حکم فرمایا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا"

اب حضرت ہاجرہ اپنے شیرخوار بچہ کے ساتھ اس لق ودق جنگل میں وقت گزارنے

لگتی ہیں، پیاس کی شدت پانی کی تلاش پر مجبور کرتی ہے، بچہ کو کھلے میدان میں چھوڑ کر صفا ومروہ کی پہاڑیوں پر بار بار چڑھتی اترتی ہیں کہ کہیں پانی کے آثار نظر آ ئیں یا کوئی انسان نظر آ جائے جس سے کچھ معلومات حاصل کریں سات مرتبہ کی دوڑ دھوپ کے بعد مایوس ہوکر بچے کے پاس لوٹ آتی ہیں صفا ومروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑنا اسی کی یادگار کے طور پر قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے احکام حج میں ضروری قرار دیا گیا ہے حضرت ہاجرہ علیہا السلام اپنی دوڑ دھوپ ختم کرنے اور مایوس ہونے کے بعد جب بچے کے پاس آتی ہیں تو رحمت خداوندی ہوتی ہے، جبرئیل امین آتے ہیں اور اس خشک ریگستان کی زمین میں سے پانی کا ایک چشمہ نکال دیتے ہیں، جس کا نام آج زمزم ہے، پانی کو دیکھ کر اول جانور آ جاتے ہیں، پھر جانوروں کو دیکھ کر انسان پہنچتے ہیں اور مکہ کی آبادی کا سامان ہو جاتا ہے ضروریات زندگی کی کچھ آسانیاں مہیا ہو جاتی ہیں۔

نومولود بچہ جن کو آج حضرت اسماعیل علیہ السلام کہا جاتا ہے، نشوونما پاتے ہیں اور کام کاج کے قابل ہو جاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام باشارات ربانی گاہ گاہ تشریف لاتے ہیں اور بی بی و بچہ کو دیکھ جاتے ہیں اس وقت پھر اللہ تعالیٰ اپنے خلیل کا تیسرا امتحان لیتے ہیں، یہ بچہ اس بیکسی اور بے سروسامانی میں پروان چڑھا، اور بظاہر اسباب باپ کی تربیت اور شفقت سے بھی محروم رہا اب والد ماجد کو حکم ملتا ہے کہ اس بچے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کردو، ارشاد قرآنی ہے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ۔ جب بچہ اس قابل ہو گیا کہ باپ کے ساتھ کام کاج میں کچھ مدد دے سکے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اے بیٹے میں خواب میں یہ حکم خداوندی پاتا ہوں کہ تجھکو ذبح کردوں، تو بتلا کہ تیرا کیا خیال ہے؟ فرزند سعید نے عرض کیا کہ ابا جان آپ کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجیے آپ مجھے بھی اس کی تعمیل میں انشاء اللہ ثابت قدم پائیں گے

اس کے بعد کا واقعہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبزادہ کو ذبح کرنے کے لئے منیٰ کے جنگل میں لے گئے اور اپنی طرف سے حکم حق

جل وعلا شانہ کی پوری تعمیل کردی، مگر وہاں مقصود بیٹے کو ذبح کرانا نہیں بلکہ شفیق باپ کا امتحان کرنا تھا، واقعہ خواب کے الفاظ میں غور کیا جائے کہ اس میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ ذبح کردیا بلکہ ذبح کا عمل کرتے دیکھا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کر دکھایا اسی وجہ سے ارشاد ہوا کہ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا کہ خواب میں جو کچھ دیکھا تھا آپ نے اس کو پورا کردیا جس میں وہ پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے جنت سے اس کا فدیہ نازل فرما کر اس کی قربانی کا حکم دیدیا، اور یہ سنت ابراہیمی آنے والی دنیا کے لئے دائمی سنت بن گئی۔

یہ کڑے اور سخت امتحانات تھے جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو گزارا گیا، اس کے ساتھ ہی دوسرے بہت سے اعمال واحکام کی پابندیاں آپ پر عائد کی گئیں جن میں سے دس خصائل فطرت کے نام سے موسوم ہیں، جن کا تعلق بدن کی صفائی ستھرائی اور پاکی سے ہے، اور یہ خصائل فطرت آنیوالی تمام امتوں کے لئے بھی مستقل احکام بن گئے، حضرت خاتم الانبیاء ﷺ نے اپنی امت کو ان تمام امور کے لئے تاکیدی احکام دیئے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ پورا اسلام تیس حصوں میں دائر ہے، جس میں سے دس سورہ برأت میں مذکور ہیں اور دس سورہ احزاب میں اور دس سورہ مومنون میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کا پورا حق ادا کیا، اور ان سب امتحانات میں پورے اترے، اور کامیاب رہے۔

سورہ برأت میں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے مسلمان کی دس مخصوص علامات وصفات کا اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناهون عن المنکر والحافظون لحدود الله وبشر المؤمنین۔

(ترجمہ) وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع وسجدہ کرنے والے، نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے اور بری باتوں سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے، اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنا دیجئے۔

اور سورہ مومنون کی دس صفات یہ ہیں۔

قد افلح المؤمنون الذین هم فی صلوتهم خاشعون والذین هم عن

اللغو معرضون . والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون والذین ھم لفروجھم حافظون . الا علیٰ ازواجھم اوما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین ۔فمن ابتغیٰ وراء ذلک فاولٓئک ھم العادون . والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون . والذین ھم علیٰ صلوٰتھم یحافظون . اولٓئک ھم الوارثون . الذین یرثون الفردوس ھم فیھا خالدون .

(ترجمہ) یقیناً ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع خضوع کرنے والے ہیں اور جو لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں اور جو اپنے آپ کو پاک کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں ہاں جو اس کے علاوہ طلبگار ہوں ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنی عہد کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہونگے وہاں میں ہمیشہ رہیں گے۔

اور سورہ احزاب میں مذکورہ دس صفات یہ ہیں۔

ان المسلمین والمسلمٰت والمؤمنین والمؤمنٰت والقانتین والقانتٰت والصادقین والصٰدقٰت والصابرین والصابرٰت والخاشعین والخشعٰت والمتصدقین والمتصدقٰت والصائمین والصٰئمٰت والحافظین فروجھم والحٰفظٰت والذاکرین اللہ کثیراً والذاکرات اعدّ اللہ لھم مغفرۃً واجراً عظیماً

(ترجمہ) بیشک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنیوالے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راستباز مرد اور راستباز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں اور خشوع کرنیوالے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنیوالے مرد اور خیرات کرنیوالی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ

مسلمان کے لئے جتنی علمی، عملی، اخلاقی صفات مطلوب ہیں وہ ان تینوں سورتوں کی چند آیات میں جمع کر دی گئی ہیں، اور یہی صفات و کلمات ہیں جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا امتحان لیا گیا، اور یہ آیت واذ ابتلی ابراهیم ربه بکلمات میں انہیں صفات کی طرف اشارہ ہے۔

ان آیات سے متعلق قابل غور سوالات میں سے دو سوالوں کا جواب یہاں تک ہو گیا۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ اس امتحان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامیابی کا درجہ اور مقام کیا رہا؟ تو وہ خود قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں ان کو سند کامیابی عطا فرمائی، ارشاد ہوا وابراهیم الذی وفی (وہ ابراہیم جس نے پورا کر دکھایا)

اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر امتحان کی مکمل اور سو فیصدی کامیابی کا اعلان فرما دیا۔

چوتھا سوال کہ اس امتحان پر انعام کیا ملا؟ اس کا ذکر خود اسی آیت میں آچکا ہے، یعنی قال انی جاعلک للناس اماما امتحان کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آپ کو لوگوں کا امام اور پیشوا بنانے والا ہوں"

اس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو اس کامیابی کے صلہ میں امامت خلق اور پیشوائی کا انعام دیا گیا، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوا کہ خلق خدا کے امام اور مقتداء اور پیشوا بننے کے لئے جو امتحان درکار ہے وہ دنیا کے مدارس اور یونیورسٹیوں جیسا امتحان نہیں جس میں چند مسائل کے فنی تحقیق اور علمی موشگافی کو کامیابی کا اعلیٰ درجہ سمجھا جاتا ہے، اس عہدے کے حاصل کرنے کے لئے ان تمیں اخلاقی اور عملی صفات میں کامل اور مکمل ہونا شرط ہے، جن کا ذکر ابھی بحوالہ آیت آچکا ہے، قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بھی یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وجعلناهم ائمة یهدون بامرنا لما صبروا وکانوا بایتنا یوقنون ۔ یعنی ہم نے ان کو امام اور پیشوا بنا دیا کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں جب انہوں نے اپنے نفس کو خلاف شرع سے روکا اور ہماری آیتوں پر یقین کیا،

اس آیات میں امامت اور پیشوائی کے لئے ان تمیں ۳۰ صفات کا خلاصہ دو لفظوں میں کر دیا

گیا ہے یعنی صبر و یقین یقینی علمی اور اعتقادی کمال اور صبر عملی اور اخلاقی کمال ہے اور وہ میں صفات جن کا ذکر ابھی اوپر گذر چکا ہے سب کی سب انہیں دو وصفوں میں سموئی ہوئی ہیں۔

پانچواں سوال یہ تھا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کو منصب امامت اور پیشوائی دینے کے لئے جو یہ ضابطہ ارشاد ہوا ہے کہ فاسق اور ظالم لوگوں کو یہ منصب نہ ملے گا اس کا کیا مطلب ہے؟

اس کی توضیح یہ ہے کہ امامت اور پیشوائی ایک حیثیت سے اللہ جل شانہ کی خلافت ہے یہ کسی ایسے شخص کو نہیں دی جاسکتی جو اس کا باغی اور نافرمان ہو اسی لئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنا نمائندہ یا امیر کسی ایسے شخص کو مقرر نہ کریں جو اللہ تعالیٰ کا باغی یا نافرمان ہو۔

تفسیر ماجدی:۔

ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند امور میں آزمایا ﴿۴۴۴﴾ اور انہوں نے وہ انجام دیئے ﴿۴۴۵﴾ ارشاد ہوا کہ میں یقیناً تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں ﴿۴۴۶﴾ بولے اور میری نسل سے بھی ﴿۴۴۷﴾ ارشاد ہوا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا ﴿۴۴۸﴾

تفسیر:۔

ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور نبوت چونکہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصرانیوں کو بھی مسلم ہے۔ اس لئے ان قوموں کے علماء نے بھی آپ کے حالات کی تحقیق و جستجو میں کوئی درجہ کاوش کا اٹھا نہیں رکھا ہے۔ موجودہ محرف بائبل میں تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اکتا کر بعض "روشن خیال" محققین نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم نامی کوئی تاریخی شخصیت گزری ہی نہیں۔ بلکہ یہ محض نوعی نام تھا یا ہر شیخ قبیلہ کا لقب' لیکن اب پھر تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے پھر آپ کی تاریخی شخصیت کا پوری طرح قائل ہو جانا پڑا ہے۔ نسل

اسرائیلی اور نسل اسماعیلی دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک مدتوں سے چلی آرہی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں سلسلوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اللہ کی نعمت خاص الخاص یعنی توحید کی علمبرداری اب نسل اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھن کر ایک اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے اب ساری دنیا کے لئے عام ہورہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ابراہیمی شخصیت (اور ان کے ضمن میں اسماعیلی شخصیت) کی مرکزیت اور اہمیت سے دنیا کو روشناس کردیا جائے۔ چنانچہ یہاں یہی ہورہا ہے۔

(۴۴۴) (اور وہ چند امور احکام تھے اور امر و نواہی کے قسم کے) ابتلیٰ۔ آزمایا اپنی واقفیت کے لئے نہیں کہ وہ تو خود علیم کل ہے بلکہ یہی اظہار تاکہ دوسروں کو ان کے ایمان کامل کا مشاہدہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ کے سلسلہ میں آزمانے کا لفظ جب بھی استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے۔ و ابتلاء اللہ العباد لیس لیعلم احوالھم بالا بتلاء فانہ عالم بھم ولکن لیعلم العباد احوالھم (معالم) کلمات۔ یہ کلمات کیا تھے ان کی تعیین میں بڑا اختلاف ہے۔ قد اختلف العلماء فیھا اختلافا کثیرا (ابن عربی) لیکن تفصیل ان کی جو کچھ بھی ہو بہر حال تھے وہ احکام شرائع ہی۔ ای شرائع الاسلام (معالم عن ابن عباس) ای اختبارہ لہ بما کلفہ من الاوامر والنواھی (ابن کثیر)

(۴۴۵) یعنی آپ ان امتحانوں میں پورے اترے اور ان احکام کی تعمیل کردی۔ ای فاداھن (ابن جریر عن ابن عباس) ای عمل بھن (ابن جریر عن قتادۃ) روایات یہود میں بھی یہ ذکر آیا ہے ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔

(۴۴۶) کہ امور دین و شریعت میں تمہاری اقتدا کریں۔ ای یاتمون بک فی دینک (کبیر) ای یاتمون بک فی دینھم (مدارک) اماما۔ امام کہتے ہی اسے ہیں جس کی پیروی کی جائے۔ لغت میں بھی اور اصطلاح شریعت میں بھی۔ ھو اسم من یوتم بہ (مدارک) اسم الامام مستحق لمن یلزم اتباعہ والاقتداء بہ فی امور الدین او فی شیء منھا (جصاص) توریت میں بھی یہ وعدہ امامت ان الفاظ میں ملتا ہے "اور میں تجھکو ایک بڑی قوم بناؤنگا اور تجھکو مبارک اور تیرا نام بڑا کرونگا۔ اور تو ایک برکت ہوگا اور ان

کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دونگا اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کرونگا۔ اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے" (پیدائش ۱۲: ۱۔۴)۔ یہ دینی سرداری اور امامت پورے ایک عالم کی آج تک آپ کے حصہ میں چلی آرہی ہے۔ اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذاہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں یعنی یہودیت و نصرانیت وہ آپ علیہ السلام کی امامت پر متفق و متحد ہیں۔ ایک نامور فرنگی فاضل بیسویں صدی کے ثلث اول کے ختم پر آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے: "ابراہیم علیہ السلام کی ہستی کسی بدوی سردار کی نہ تھی کہ وہ لوٹ مار کرتے اور ملک گیری کرتے رہتے۔ ان کی اصلی اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے۔ وہ حقیقتاً مورث اعلیٰ کسی نسل کے نہیں' بانی و امام و مذہبی تحریک کے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح جو ان کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے' وہ ساری قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور توریت کے حسب روایت وہ اسرائیلی مذہب کے بانی تھے"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول صفحہ ۶۰ طبع چہاردہم) جن لفظوں کو یہاں ترجمہ میں جلی کر دیا گیا ہے' انہیں ایک بار پھر پڑھ لیا جائے۔ یورپ کی زبان سے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے خلیل علیہ السلام کے درمیان مماثلت کا یہ اعتراف! بس اللہ ہی کی شان ہے! آیت سے ایک نتیجہ فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ احکام کی تعمیل اور امتحان الٰہی میں کامیابی انسان کو دینی پیشوائی و سرداری کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اور انبیاء کرام کے بعد اولیاء امت اور علماء امت کی امامت' اپنے اپنے ظرف و حیثیت کے مطابق' اسی قانون کی مظہر ہے۔ فقیہ جصاص رازیؒ نے کہا ہے کہ **فالانبیاء علیهم السلام فی اعلیٰ مرتبة الامامة ثم خلفاء الراشدون بعد ذالک ثم العلماء والقضاة العدول ومن الزم الله تعالیٰ باقتدائهم ثم الامامة فی الصلوٰة ونحوها** (احکام القرآن) (امامت کے جو معنی بیان ہوئے اس کے لحاظ سے امامت کے اعلیٰ مرتبہ پر تو حضرات انبیاء فائز ہوتے ہیں۔ ان سے اتر کر خلفاء راشدین ہیں۔ پھر نمبر علماء اور عادل ججوں کا آتا ہے اور ان کا جن کی پیروی خدا نے لازم کر دی ہے' پھر امامت نماز ہے وغیرہا)

(۴۴۷) (امام ہوتے رہیں گے) امام کی پیشوائی سرداری و امامت کی بشارت پاکر ابراہیم علیہ السلام کا دل قدرتی طور پر باغ باغ ہوگیا اور اس جوش مسرت میں سوال کر بیٹھے کہ اس انعام میں میری نسل اور میری اولاد بھی شریک ہے نا؟ ذریۃ کے معنی ہیں اولاد اور اولاد در اولاد۔ اس میں سارا سلسلہ نسل آگیا۔ اور یہ سلسلہ ابراہیمی شاخ اسرائیلی اور شاخ اسمٰعیلی دونوں کو شامل ہے۔ اسرائیلیوں کو جو دعویٰ تخصیص تھا اس کی جڑ یہیں سے کٹ گئی۔ من ذریۃ میں من تبعیضیہ ہے اور فقرہ کی ترکیب نے اسے صاف کردیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعاء (سوال کے رنگ میں) اپنی ساری نسل سے متعلق نہیں اس کے ایک جزء سے متعلق تھی من تبعیضیہ ای و جاعل بعض ذریتی (ابو سعود) ومن ذریتی. یدل انه علیه السلام طلب ان یکون بعض ذریته ائمة للناس (کبیر) من ذریتی کا عطف جاعلک کے ک پر ہے۔ گویا تقدیر کلام یوں ہے۔ وجاعلک بعض من ذریتی۔ محاورہ عرب میں جب ساکرمک بولا جاتا ہے تو جواب استفہامی میں بجائے پورے فقرہ ساکرم زیداً کے صرف وزیداً کافی ہے (کشاف) گو یا صاحب بحر کے نزدیک یہ عطف یہاں صحیح نہیں۔ آیت سے معلوم ہوا کہ مسرت و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کرنا نہ صرف امر طبعی ہے بلکہ سنت انبیاء بھی ہے۔

(۴۴۸) یعنی برکت و فضل کا سلسلہ تمھاری نسل میں بھی ضرور رہے گا لیکن اس کے تحقق کے لیے محض ارث، نسب، نسل کافی نہیں۔ بلکہ ایمان و عمل صالح بھی حاصل کرنا ہوگا۔ گویا دعاء ابراہیمی اولاد صالح کے حق میں قبول ہوگئی دلّ علی انه ینالہ غیر الظالم (جلالین) اور حضرت کو خبر دے دی گئی کہ آپ کی نسل میں دونوں طرح کے لوگ ہونگے۔ کچھ صالح و مطیع اور کچھ ظالم و نافرمان۔ صالحین کو امامت کی بشارت مل گئی اور ظالم اس سے محروم کردیے گئے۔ تنبه علیٰ انه قد یکون من ذریته ظلمة وانهم لاینالون الإمامة وانما ینالها البررة الاتقیاء منهم (بیضاوی) عهدی۔ میرا وعدہ یعنی دینی منصب امامت و پیشوائی کا وعدہ۔ معنی العهد عهد الإمامة (ابن جریر عن مجاہد) هذا العهد هو الإمامة المذکورة فی ما قبل (کبیر) الظلمین۔ ظلم سے یہاں مراد کفر بھی لی گئی

ہے اور فسق بھی۔ کافر کو امامت دینی نہ ملنا بلکل ظاہر اور متفق علیہ ہے۔ بعض نے اس منصب سے محرومی کے لئے فسق بھی کافی سمجھا ہے۔ قد عسر الظلم ھھنا بالکفر وھو قول ابن جبیر وبظلم العاصی غیر الکفر وھو قول عطاء والسدی (کبیر) ای اھل الکفر (مدارک) اخبر ان امامۃ المسلمین لا بثبت لاھل الکفر (مدارک) المراد بالظالم الکافر ھھنا اذ ھو الظالم المطلق (مدارک) المتبادر من الظلم الکفر لانہ الفرد الکامل من افرادہ (روح) فقہاء امت نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ فاسق کی امامت کا انعقاد جائز نہیں۔ واحتج الجمہور علی ان الفاسق لا یصلح ان تقعدلہ الامامۃ بھذہ الآیۃ (کبیر) مرشد تھانوی نے آیت سے استنباط کیا کہ اختیاری بدعملی کے ساتھ فضل الٰہی وانعام خداوندی جمع نہیں ہوتے۔

ترجمہ کنزالایمان:۔

ترجمہ: اور جب (۲۲۳) ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا (۲۲۴) تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں (۲۲۵) فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ عرض کی اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا (۲۲۶)

تفسیر:۔

(۲۲۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سرزمین اہواز میں بمقام سوس ہوئی پھر آپ کے والد آپ کو بابل ملک نمرود میں لے آئے یہود ونصاریٰ ومشرکین عرب سب آپ کے فضل وشرف کے معترف اور آپ کی نسل میں ہونے پر فخر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے وہ حالات بیان فرمائے جن سے سب پر اسلام کا قبول کرنا لازم ہو جاتا ہے کیونکہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ پر واجب کیں وہ اسلام کے خصائص میں سے ہیں

(۲۲۴) خدائی آزمائش یہ ہے کہ بندے پر کوئی پابندی لازم فرما کر دوسروں پر اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا اظہار کر دے

(۲۲۵) جو باتیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آزمائش کے لئے

واجب کی تھیں ان میں مفسرین کے چند قول ہیں قتادہ کا قول ہے کہ وہ مناسک حج ہیں مجاہدؒ نے کہا اس سے وہ دس چیزیں مراد ہیں جو اگلی آیات میں مذکور ہیں حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ دس چیزیں یہ ہیں ا مونچھیں کتروانا ۲ کلی کرنا ۳ ناک میں صفائی کے لئے پانی استعمال کرنا ۴ مسواک کرنا ۵ سر میں مانگ نکالنا ۶ ناخن ترشوانا ۷ بغل کے بال دور کرنا ۸ موئے زیر ناف کی صفائی ۹ ختنہ ۱۰ پانی سے استنجا کرنا یہ سب چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر واجب تھیں اور ہم پر ان میں سے بعض واجب ہیں اور بعض سنت

(۲۲۴) مسئلہ یعنی آپ کی اولاد میں جو ظالم (کافر) ہیں وہ امامت کا منصب نہ پائیں گے۔ مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ کافر مسلمانوں کا پیشوا نہیں ہو سکتا اور مسلمانوں کو اس کا اتباع جائز نہیں۔

تفسیر ثنائی۔

ترجمہ: اور جب ابراہیم کو اس کے خدا نے چند باتوں کا حکم دیا پس اس نے ان سب کو پورا کیا (خدا نے) اسے کہا میں تجھے سب لوگوں کا امام بناؤں گا وہ بولا اور میری اولاد میں سے (بھی کسی کو نصیب کر) (خدا نے) کہا ظالموں کو میرا وعدہ نہیں پہنچیگا۔

تفسیر:۔

اور ابراہیم (علیہ السلام) کی حالت کو بھی بھول گئے جب کہ اس ابراہیم کو اس کے خدا نے چند باتوں کا حکم دیا پس اس بندہ کامل نے ان سب کو پورا کیا پھر اس کے انعام میں خدا نے اسے کہا میں تجھ کو سب لوگوں کا امام اور پیشوا بناؤنگا وہی لوگ نجات پاویں گے جو تیرے پیچھے چلیں گے وہ اپنے نیک ارادہ سے بولا یا اللہ مجھے بنا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کو نصیب کر کیونکہ اولاد کی لیاقت گویا آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ خدا نے کہا بیشک تیری اولاد سے بھی یہ مرتبہ بعض لوگوں کو ملے گا مگر چونکہ پانچوں انگلیاں بھی یکساں نہیں اسلئے ان میں بعض بدکردار بھی ہونگے جو آپس میں ظلم وستم کرینگے پس ایسے

ظالموں کو میرا یہ وعدہ نہیں پہنچے گا۔

تفہیم القرآن۔ (ص ۱۱۰ ج ۱)

ترجمہ: یاد کرو جب کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا ۱۲۴ اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں" ابراہیم نے عرض کیا اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔" ۱۲۵

تفسیر:۔

۱۲۴ قرآن میں مختلف مقامات پر ان تمام سخت آزمائشوں کی تفصیل بیان ہوئی' جن سے گذر کر حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کیا تھا کہ انہیں ہی نوع انسان کا امام و رہنما بنایا جائے جس وقت سے حق ان پر منکشف ہوا اس وقت سے لیکر مرتے دم تک ان کی پوری زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں' جن سے انسان محبت کرتا ہے' ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی' جس کو حضرت ابراہیم نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو۔ اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں' جن سے آدمی ڈرتا ہے' اُن میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا' جسے اُنھوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔

۱۲۵ یعنی یہ وعدہ تمھاری اولاد کے صرف اس حصے سے تعلق رکھتا ہے' جو صالح ہو' ان میں سے جو ظالم ہونگے اُن کے لئے یہ وعدہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے کہ گمراہ یہودی اور مشرک بنی اسماعیل اس وعدے کے مصداق نہیں ہیں۔

جامع البیان للطبری۔ (ص ۲۹ ۷۔ ۳۰ ۷ ج ۱)

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (بقرہ ۱۲۴)

يعني جل ثناؤه بقوله :﴿ وإذا ابتلى ﴾ وإذا اختبر، يقال منه : ابتليت فلانا ابتليه ابتلاء . ومنه قول الله عزّ وجلّ « وابتلوا اليتامى » يعني به : اختبروهم . وكان اختبار الله تعالى ذكره إبراهيم اختباراً بفرائض فرضها عليه ، وأمرٍ أمره به ، وذلك هو الكلمات التي أوحاهنّ إليه و كلفه العمل بهنّ امتحانا منه له واختبارا.

ثمّ اختلف أهل التأويل في صفة الكلمات التي ابتلى الله بها إبراهيم نبيّه وخليله صلوات الله عليه، فقال بعضهم : هي شرائع الإسلام وهي ثلاثون سهماً . ذكر من قال ذلك :

١٥٧٧ـحدثنا محمد بن المثنى ، قال : ثنا عبد الأعلى ، قال: ثنا داود ، عن عكرمة ، عن ابن عباس في قوله :﴿ وإذابتلى إبراهيم ربه بكلمٰت ﴾ قال : قال ابن عباس : لم يبتل أحد بهذا الدين فأقامه إلا إبراهيم ، ابتلاه الله بكلمات فأتمهنّ ، قال : فكتب الله له البراءة ، فقال :﴿وإبراهيم الذى وفّى﴾ قال : عشر منها في الأحزاب ، وعشر منها في البراءة ، و عشر منها في المؤمنين، وسأل سائل وقال : إن هذ الإسلام ثلاثون سهماً.

١٥٧٨ـحدثنا إسحاق بن شاهين ، قال: ثنا خالد الطحان. عن داود ، عن عكرمة ، عن ابن عباس ، قال : ما ابتلي أحد بهذا الدين فقام به كله غير إبراهيم ؛ ابتلي بالإسلام فأتمه ، فكتب الله له البراءة ، فقال :﴿ و إبراهيم الذى وفّى﴾ فذكر عشراً في براءة ، فقال:﴿ التائبون العٰبدون الحامدون﴾إلى آخر الآيات ، وعشراً في الأحزاب:﴿إنّ المسلمين والمسلمات﴾ وعشراً في سورة المؤمنين ، إلى قوله : ﴿والذين هم على صلوٰتهم يحافظون ﴾ وعشرا في سأل سائل :﴿والذين هم على صلاتهم يحافظون﴾

١٥٧٩ـ حدثنا عبيد الله بن أحمد بن شبرمه ، قال:ثنا عليّ بن الحسن ، قال : ثنا خارجة بن مصعب ، عن داود بن أبي هند ، عن عكرمة، عن ابن عباس ،قال: الإسلام ثلاثون سهما، وما ابتلي بهذا الدين أحد فأقامه إلا إبراهيم ، قال الله ﴿وإبراهيم الذى وفّى﴾ فكتب الله له براءة من النار.

وقال آخرون :هي خصال عشر من سنن الإسلام.ذكر من قال ذلك:

١٥٨٠ـحدثنا الحسن بن يحي ، قال: أخبرنا عبد الرزاق ، قال:

أخبرنا معمر عن ابن طاوس ، عن أبيه ، عن ابن عباس : ﴿ وَإِذِ ٱبۡتَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَٰتٍ ﴾ قال : ابتلاه الله بالطهارة ، خمس في الرأس ، و خمس في الجسد ، في الرأس قص الشارب ، والمضمضة ، و الاستنشاق والسواك ، وفرق الرأس ، وفي الجسد : تقليم الأظفار ، وحلق العانة ، والختان ، ونتف الإبط ، وغسل أثر الغائط والبول بالماء.

ـ وحدثني المثنى ، قال : ثنا إسحاق ، قال : ثنا عبدالرزاق ، عن معمر ، عن الحكم بن أبان ، عن القاسم بن أبي بزة ، عن ابن عباس بمثله ، ولم يذكر أثر البول.

١٥٨١ ـ حدثنا محمد بن بشار ، قال : ثنا سليمان ، قال : ثنا أبو هلال ، قال : ثنا قتادة ، في قوله : ﴿ وَإِذِ ٱبۡتَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَٰتٍ ﴾ قال : ابتلاه بالختان ، وحلق العانة ، وغسل القبل والدبر ، والسواك ، وقص الشارب ، وتقليم الأظافر ، ونتف الإبط ، قال أبو هلال : ونسيت خصلة.

١٥٨٢ ـ حدثت عن عمار ، قال : ثنا ابن أبي جعفر ، عن أبيه ، عن مطر ، عن أبي الخلد قال : ابتلي إبراهيم بعشرة أشياء هنّ في الإنسان : سنة الاستنشاق ، وقص الشارب ، والسواك ، ونتف الإبط ، وقلم الأظفار ، وغسل البراجم ، والختان وحلق العانة ، وغسل الدبر ، والفرج .

وقال بعضهم : بل الكلمات التي ابتلي بهن عشر خلال ، بعضهنّ في تطهير الجسد ، وبعضهنّ في مناسك الحج . ذكر من قال ذلك.

١٥٨٣ ـ حدثني المثنى ، قال : ثنا إسحاق ، قال : ثنا محمد بن حرب ، قال : ثنا ابن لهيعة ، عن ابن هبيرة ، عن حنش ، عن ابن عباس في قوله : ﴿ وَإِذِ ٱبۡتَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ﴾ قال : ستة في الإنسان ، وأربعة في المشاعر ؛ فالتي في الإنسان ، حلق العانة ، والختان ، ونتف الإبط ، وتقليم الأظفار ، وقص الشارب ، والغسل يوم الجمعة ، وأربعة في المشاعر : الطواف ، والسعي بين الصفا والمروة ، ورمي الجمار ، والإفاضة .

وقال آخرون : بل ذلك : إني جاعلك للناس إماماً في مناسك الحج . ذكر من قال ذلك :

۱۵۸۳ـ حدثنا أبوكريب ، قال : ثنا ابن إدريس ، قال : سمعت إسماعيل بن أبي خالد ، عن أبي صالح ، في قوله : ﴿ وإذابتلى ابراهيم ربه بكلمٰت فاتمّهن ﴾ فمنهن ﴿ اني جاعلك للناس اماما ﴾ و آيات النسك.

ـ حدثنا أبو السائب ، قال : ثنا ابن إدريس ، قال : سمعت إسماعيل بن أبي خالد ، عن أبي صالح مولى أم هانيء في قوله : ﴿وإذابتلى ابراهيم ربه بكلمٰت فاتمّهن ﴾ قال منهن : ﴿ اني جاعلك للناس اماما ﴾ ومنهن آيات النسك : ﴿وإذيرفع ابراهيم القواعد من البيت ﴾

۱۵۸۵ـ حدثنا محمد بن عمرو ، قال : ثنا أبو عاصم ، قال : ثنا عيسى ، عن ابن أبي نجيح ، عن مجاهد في قوله : ﴿ وإذابتلى ابراهيم ربه بكلمٰت فاتمّهن ﴾ قال الله لإبراهيم : إني مبتليك بأمر ، فما هو ؟ قال : تجعلني للناس إماماً قال : نعم ، قال : ومن ذريتي ؟ قال : لاينال عهدى الظالمين . قال : تجعل البيت مثابة للناس ؟ قال : نعم . وأمناً ؟ قال : نعم . وتجعلنا مسلمين لك ، ومن ذريتنا أمة مسلمة لك ؟ قال : نعم . وترينا مناسكنا وتتوب علينا ؟ قال : نعم قال : وتجعل هذاالبلد آمنا ؟ قال : نعم.قال : وترزق أهله من الثمرات من آمن منهم ؟ قال : نعم.

ـحدثني المثنى ، قال : ثنا أبوحذيفة ، قال : ثناشبل ، عن ابن أبي نجيح ، عن مجاهد مثله.

ـ حدثني المثنى ، قال : ثنا أبو حذيفة ، قال : ثناشبل ، عن ابن أبي نجيح ، أخبره به عن عكرمة فعرضته على مجاهد فلم ينكره.

ـحدثنا القاسم ، قال : ثناالحسين ، قال : حدثني حجاج ، عن ابن جريج ، عن مجاهد بنحوه . قال ابن جريج : فاجتمع على هذا القول مجاهد وعكرمة جميعاً

۱۵۸۶ـ حدثنا سفيان ، قال حدثني أبي ، عن سفيان ، عن ابن أبي نجيح ، عن مجاهد : ﴿ وإذابتلى إبراهيم ربه بكلمٰت فاتمّهن ﴾ قال ابتلي بالآيات التي بعدها : ﴿ اني جاعلك للناس اماما قال ومن ذريتي قال لاينال عهدى الظٰلمين ﴾.

۱۵۸۷ـحدثت عن عمار ، قال.ثنا ابن أبي جعفر.عن أبيه ،عن الربيع في قوله: ﴿وإذابتلى ابراهيم ربه بكلمٰت فاتمّهن ﴾ فالكلمات التي : ﴿ إني

جاعلک للناس إماما ﴾ و قوله :﴿ واتخذوا من مقام إبراهيم مصلى﴾ وقوله :﴿ وعهدنا إلى إبراهيم وإسماعيل ﴾ الآية ، وقوله :﴿ وإذ يرفع إبراهيم القواعد من البيت﴾ الآية ، قال : فذلک كلمة من الكلمات التي ابتلي بهن إبراهيم .

۱۵۸۸ـ حدثني محمد بن سعيد ، قال: حدثني أبي ، قال :حدثني عمي ، قال : حدثني أبي ، عن أبيه ، عن ابن عباس قوله :﴿ وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمت فأتمهن ﴾ فمنهن :﴿ إني جاعلک للناس إماما﴾ و منهن :﴿ وإذ يرفع إبراهيم القواعد من البيت﴾ ومنهن الآيات في شأن النسک ، والمقام الذي جعل لإبراهيم ، والرزق الذي رزق ساكنو البيت و محمد ﷺ في ذريتهما عليهما السلام .

وقال آخرون : بل ذلک مناسک الحج خاصة. ذكر من قال ذلک :

۱۵۸۹ـ حدثنا ابن بشار، قال : ثنا سلم بن قتيبة ، قال : ثنا عمرو بن نبهان ، عن قتادة ، عن ابن عباس في قوله :﴿ وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمت ﴾ قال : مناسک الحج .

ـ حدثنا بشر بن معاذ ، قال: ثنا يزيد بن زريع ، قال : ثنا سعيد ، عن قتادة ، قال: كان ابن عباس يقول في قوله: ﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمت ﴾ قال: المناسک .

ـ حدثنا الحسن بن يحي ، قال : أخبرنا عبد الرزاق ، قال : أخبرنا معمر ، عن قتادة ، قال : قال ابن عباس : ابتلاه بالمناسک .

ـ حدثت عن عمار بن الحسن ، قال: ثنا ابن أبي جعفر، عن أبيه ، قال: بلغنا عن ابن عباس أنه قال: إن الكلمات التي ابتلي بها إبراهيم : المناسک .

ـ حدثنا أحمد بن إسحاق ، قال : ثنا أبو أحمد الزبيري ، قال : ثنا شريک ، عن أبي إسحاق ، عن التميمي، عن ابن عباس قوله: ﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمت﴾ قال: مناسک الحج .

ـحدثني المثنى ، قال: ثنا الحماني ، قال : ثنا شريک ، عن أبي إسحاق ، عن التميمي ، عن ابن عباس في قوله : ﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمت ﴾ قال : منهن مناسک الحج.

وقال آخرون : هي أمور منهن الختان ، ذكر من قال ذلك:

۱۵۹۰ـ حدثني محمد بن بشار، قال: ثنا سلم بن قتيبة ، عن يونس بن أبي إسحاق، عن الشعبي:﴿ وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ ﴾ قال: منهن الختان.

ـحدثنا ابن حميد ، قال : ثنا يحي بن واضح ، قال : يونس بن أبي إسحاق ، قال : سمعت الشعبي يقول : فذكر مثله.

ـحدثنا أحمد بن إسحاق ، قال : ثناأبو أحمد ، قال : ثنايونس بن أبي إسحاق ، قال : سمعت الشعبي ، وسأله أبو إسحاق عن قول الله : ﴿ وإذ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ ﴾ قال : منهن الختان يا أبا إسحاق.

وقال آخرون : بل ذلك الخلال الست : الكوكب، والقمر، و الشمس ، والنار، والهجرة ، والختان ، التي ابتلي بهنّ فصبر عليهنّ. وذكر من قال ذلك:

۱۵۹۱ـحدثني يعقوب بن إبراهيم ، قال: ثنابن علية ، عن أبي رجاء، قال: قلت للحسن:﴿ وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ﴾ قال: ابتلاه بالكوكب فرضي عنه ، وابتلاه بالقمرفرضي عنه . وابتلاه بالشمس فرضي عنه ، وابتلاه بالنار فرضي عنه ، وابتلاه بالهجرة ، و ابتلاه بالختان.

۱۵۹۲ـحدثنابشر بن معاذ ، قال: ثنا يزيد بن زريع، قال: ثنا سعيد ، عن قتادة ، قال: كان الحسن يقول : إي والله ابتلاه بأمر فصبر عليه ، ابتلاه بالكوكب ، والشمس ، والقمر ، فأحسن في ذلك ، و عرف أن ربه دائم لا يزول ، فوجه وجهه للذي فطر السموات والأرض حنيفاً وما كان من المشركين ، ثم ابتلاه بالهجرة فخرج من بلاده وقومه حتى لحق بالشام مهاجراً إلى الله ، ثم ابتلاه بالنار قبل الهجرة فصبر على ذلك ، فابتلاه الله بذبح ابنه وبالختان فصبر على ذلك.

۱۵۹۳ـ حدثنا الحسن بن يحي، قال: أخبرنا عبد الرزاق ، قال: أخبرنا معمر، عمن سمع الحسن يقول في قوله: ﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بكلمات﴾ قال: ابتلاه الله بذبح ولده، وبالنار، وبالكوكب، والشمس ، والقمر

١٥٩٤ ـ حدثنا ابن بشار، قال: ثنا سلم بن قتيبة، قال: ثنا أبو هلال، عن الحسن: ﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ﴾ قال: ابتلاه بالكوكب، وبالشمس، والقمر، فوجده صابرا.

وقال آخرون بما:

١٥٩٥ ـ حدثنا به موسى بن هارون، قال: ثنا عمرو بن حماد، قال: ثنا أسباط، عن السدي: الكلمات التي ابتلى بهن إبراهيم ربه: ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾

والصواب من القول في ذلك عندنا أن يقال: إن الله عز وجل أخبر عباده أنه اختبر إبراهيم خليله بكلمات أوحاهن إليه، وأمره أن يعمل بهن وأتمهن، كما أخبر الله جل ثناؤه عنه أنه فعل. وجائز أن تكون تلك الكلمات جميع ما ذكره من ذكرنا قوله في تأويل الكلمات، وجائز أن تكون بعضه؛ لأن إبراهيم صلوات الله عليه قد كان امتحن فيما بلغنا بكل ذلك، فعمل به وقام فيه بطاعة الله وأمره الواجب عليه فيه. وإذا كان ذلك كذلك، فغير جائز لأحد أن يقول: عنى الله بالكلمات التي ابتلى بهن إبراهيم شيئا من ذلك بعينه دون شيء، ولا عنى به كل ذلك إلا بحجة يجب التسليم لها من خبر عن الرسول ﷺ، أو إجماع من الحجة؛ ولم يصح فيه شيء من ذلك خبر عن الرسول بنقل الواحد، ولا بنقل الجماعة التي يجب التسليم لما نقلته. غير أنه روي عن النبي ﷺ في نظير معنى ذلك خبران لو ثبتا، أو أحدهما، كان القول به في تأويل ذلك هو الصواب. أحدهما ما:

١٥٩٦ ـ حدثنا به أبو كريب، قال: ثنا راشد بن سعد، قال: حدثني ريان بن فائد، عن سهل بن معاذ بن أنس، عن أبيه، قال: كان النبي ﷺ يقول: "ألا أخبركم لم سمى الله إبراهيم خليله الذي وفى؟ لأنه كان يقول كلما أصبح وكلما أمسى: ﴿فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ﴾، حتى يختم الآية"

والآخر منهما ما:

١٥٩٧ ـ حدثنا به أبو كريب ، قال : ثنا الحسن بن عطية ، قال : ثنا إسرائيل ، عن جعفر بن الزبير ، عن القاسم ، عن أبي أمامة ، قال : قال رسول الله ﷺ : ﴿وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ قال : "أتدرون ما وفى "؟ قالوا : الله ورسوله أعلم . قال : "وفى عمل يومه أربع ركعات في النهار " فلو كان خبر سهل بن معاذ عن أبيه صحيحاً سنده ، كان بيناً أن الكلمات التي ابتلي بهن إبراهيم فقام بهن هو قوله كلما أصبح وأمسى :﴿فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ﴾ .أو كان خبر أبي أمامة عدولاً نقلته ، كان معلوماً أن الكلمات التي أوحين إلى إبراهيم فابتلي بالعمل بهنّ أن يصلي كل يوم أربع ركعات .غير أنهما خبران في أسانيدهما نظر .

والصواب من القول في معنى الكلمات التي أخبر الله أنه ابتلي بهنّ إبراهيم ما بينا آنفاً .

ولو قال قائل في ذلك : إن الذي قاله مجاهد وأبو صالح والربيع بن أنس أولى بالصواب من القول الذي قاله غيرهم ؛ كان مذهباً ، لأن قوله : ﴿ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ﴾ وقوله :﴿ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ ﴾ وسائر الآيات التي هي نظير ذلك كالبيان عن الكلمات التي ذكر الله أنه ابتلي بهنّ إبراهيم .

القول في تأويل قوله تعالى:﴿فَأَتَمَّهُنَّ﴾.

يعني جلّ ثناؤه بقوله : ﴿ فَأَتَمَّهُنَّ ﴾ فأتمّ إبراهيم الكلمات، وإتمامه إياهنّ إكماله إياهنّ ، بالقيام لله بما أوجب عليه فيهنّ وهو الوفاء الذي قال الله جلّ ثناؤه : ﴿ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ﴾ يعني وفى بما عهد إليه بالكلمات ، فأمره به من فرائضه ومحنه فيها .كما:

١٥٩٨ ـ حدثني محمد بن المثنى ، قال : ثنا عبد الأعلى ، قال : ثنا داود ، عن عكرمة ، عن ابن عباس : ﴿ فَأَتَمَّهُنَّ﴾ أي فأداهنّ .

١٥٩٩ ـ حدثنا بشر بن معاذ ، قال : ثنا يزيد بن زريع ، قال: ثنا سعيد ، عن قتادة : ﴿ فَأَتَمَّهُنَّ ﴾ أي عمل بهن ، فأتمهنّ .

١٦٠٠ ـ حدثت عن عمار ، قال: حدثنا ابن أبي جعفر ، عن أبيه ،

عن الربيع . ﴿فَأَتَمَّهُنَّ﴾ أي عمل بهن فأتمهن ،

القول في تأويل قوله تعالى:

﴿قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾

يعني جلّ ثناؤه بقوله :﴿ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ فقال الله : يا إبراهيم إني مصيرك للناس إماما يؤتم به ويقتدى به . كما :

١٦٠١ ـ حدثت عن عمار ، قال : ثنا ابن أبي جعفر ، عن أبيه ، عن الربيع :﴿ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ ليؤتم به ، ويقتدى به ؛ يقال منه: أممت القوم فأنا أؤمهم أما وإمامة إذا كنت إمامهم .

وإنما أراد جلّ ثناؤه بقوله لإبراهيم :﴿ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ إني مصيرك تؤم من بعدك من أهل الإيمان بي وبرسلي ، فتقدمهم أنت ، ويتبعون هديك ، ويستنون بسنتك التي تعمل بها بأمري إياك و وحيي إليك .

القول في تأويل قوله تعالى: ﴿ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾.

يعني جلّ ثناؤه بذلك ، قال إبراهيم لما رفع الله منزلته و كرّمه ، فأعلمه ما هو صانع به من تصييره إماماً في الخيرات لمن في عصره ولمن جاء بعده من ذريته وسائر الناس غيرهم يهتدي بهديه ويقتدي بأفعاله وأخلاقه: يا ربّ ومن ذريتي فاجعل أئمة يقتدي بهم كالذي جعلتني إماماً يؤتم به ويقتدى بي.مسألة له من إبراهيم ربه سأله إياها. كما:

١٦٠٢ ـ حدثت عن عمار ، قال : ثنا ابن أبي جعفر ، عن أبيه ، عن الربيع ، قال : قال إبراهيم : ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ﴾ يقول : فاجعل من ذريتي من يؤتم به و يقتدى به .

وقد زعم بعض الناس أن قول إبراهيم :﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ مسألة منه ربه لعقبه أن يكونوا على عهده ودينه ، كما قال :﴿وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ﴾ فأخبر الله جلّ ثناؤه أن في عقبه الظالم المخالف له في دينه بقوله: ﴿ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴾.

والظاهر من التنزيل يدل على غير الذي قاله صاحب هذه المقالة ؛ لأن قول إبراهيم صلوات الله عليه :﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ في إثر قول الله جلّ ثناؤه :

﴿إني جاعلك للناس إماما﴾ فمعلوم أن الذي سأله إبراهيم لذريته لو كان غير الذي أخبر ربه أنه أعطاه إياه لكان مبينا ؛ ولكن المسألة لما كانت مما جرى ذكره ، اكتفى بالذكر الذي قد مضى من تكريره وإعادته ، فقال: ﴿ ومن ذريتي﴾ بمعنى : ومن ذريتي فاجعل مثل الذي جعلتني به من الإمامة للناس.

القول في تأويل قوله تعالى: ﴿ لاينال عهدي الظلمين﴾

هذا خبر من الله جلّ ثناؤه عن أن الظالم لايكون إماما يقتدي به أهل الخير، وهو من الله جلّ ثناؤه جواب لما توهم في مسألته إياه أن يجعل من ذريته أئمة مثله ، فأخبر أنه فاعل ذلك إلا بمن كان من أهل الظلم منهم، فإنه غير مصيره كذلك ، ولا جاعله في محل أوليائه عنده بالتكرمة بالإمامة؛ لأن الإمامة إنما هي لأوليائه وأهل طاعته دون أعدائه والكافرين به.

واختلف أهل التأويل في العهد الذي حرم الله جلّ ثناؤه الظالمين أن ينالوه ، فقال بعضهم : ذلك العهد هو النبوة . ذكر من قال ذلك:

۲۰۳ ۱ـحدثني موسى ، قال: ثنا عمرو ، قال : ثناأسباط ، عن السدي، قال: ﴿ لاينال عهدي الظلمين﴾ يقول : عهدي ، نبوتي . فمعنى قائل هذ القول في تأويل الآية : لا ينال النبوة أهل الظلم والشرك .

وقال آخرون : معنى العهد عهدالإمامة ، فتأويل الآية على قولهم : لاأجعل من كان من ذريتك بأسرهم ظالماً إماما لعبادي يقتدى به. ذكر من قال ذلك :

۲۰۳ ۱ـحدثني محمد بن عمرو، قال: ثنا أبو عاصم ، قال : ثنا عيسى ، عن ابن أبي نجيح ، عن مجاهد : ﴿ قال لاينال عهدي الظلمين ﴾ قال : لايكون إمام ظالما.

ـحدثني المثنى، قال: ثنا أبوحذيفة ، قال:ثناشبل، عن ابن أبي نجيح ، عن مجاهد : ﴿ قال ﴾ الله : ﴿ لاينال عهدي الظلمين ﴾ قال : لايكون إمامٌ ظالماً .

۲۰۵ ۱ـ حدثني المثنى ، قال : ثنا أبو حذيفة ، قال : ثناشبل ، عن ابن أبي نجيح ، عن عكرمة ، بمثله.

ـ حدثنا ابن بشار ، قال : ثنا أبو عاصم ، قال : ثناسفيان ، عن منصور ، عن مجاهد في قوله ﴿ قالَ لَايَنَالُ عَهْدِى الظَّلِمِيْن ﴾ قال : لايكون إمام ظالم يقتدى به .

ـحدثنا أحمد بن إسحاق ، الأهوازي ، قال ثنا أبو أحمد الزبيري ، قال : ثناسفيان ، عن منصور ، عن مجاهد ، مثله .

ـحدثنا مسروق بن أبان الحطاب ، قال : ثنا وكيع ، عن سفيان ، عن خصيف ، عن مجاهد في قوله : ﴿ لَايَنَالُ عَهْدِى الظَّلِمِيْن﴾ قال: لا أجعل إماماً ظالماً يقتدى به.

ـ حدثنا محمد بن عبيد المحاربي،قال: ثنامسلم بن خالد الزنجي ، عن ابن أبي نجيح ، عن مجاهد في قوله:﴿ لَايَنَالُ عَهْدِى الظَّلِمِيْن ﴾ قال: لاأجعل إماماً ظالماً يقتدى به.

ـحدثنا القاسم ، قال: ثنا الحسين ، قال: حدثني حجاج ، عن ابن جريج ، عن مجاهد : ﴿ لَايَنَالُ عَهْدِى الظَّلِمِيْن﴾ قال : لا يكون إماماً ظالمٌ.

قال ابن جريج : وأما عطاء فإنه قال: ﴿ إِنِّى جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِى﴾ فأبى أن يجعل من ذريته ظالماً إماماً، قلت لعطاء : ما عَهْدُه ؟ قال : أمْرُه.

وقال آخرون : معنى ذلك أنه لا عهد عليك لظالم أن تطيعه في ظلمه . ذكر من قال ذلك:

١٢٠٢ـ حدثنا محمد بن سعد ، قال : حدثني أبي ، قال حدثني عمي قال : حدثني أبي ، عن أبيه ، عن ابن عباس قوله :﴿ لَايَنَالُ عَهْدِى الظَّلِمِيْن﴾ يعني لا عهد لظالم عليك في ظلمه أن تطيعه فيه.

ـحدثني المثنى، قال : ثنا إسحاق ، قال : ثنا عبد الرحمن بن عبد الله ، عن إسرائيل ، عن مسلم الأعور، عن مجاهد ، عن ابن عباس :﴿ قَالَ لَايَنَالُ عَهْدِى الظَّلِمِيْن﴾ قال : ليس للظالمين عهد ، وإن عاهدته فانقضه.

ـ حدثني القاسم ، قال: ثنا الحسين، قال حدثني حجاج ، عن سفيان، عن هارون بن عنترة ، عن أبيه ، عن ابن عباس ، قال : ليس لظالم عهد .

وقال آخرون : معنى العهد في هذا الموضع : الأمان .

فتأويل الكلام على معنى قولهم، قال الله: لاينال أماني أعدائي وأهل الظلم لعبادي ؛ أي لا أؤمنهم من عذابي في الآخرة. ذكر من قال ذلك:

۱۶۰۷ ـ حدثنا بشر بن معاذ، قال: ثنا يزيد بن زريع، قال: ثنا سعيد، عن قتادة: ﴿قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ ذلك عند الله يوم القيامة لا ينال عهده ظالم، فأما في الدنيا فقد نالوا عهد الله، فوارثوا به المسلمين وعادوهم وناكحوهم به. فلما كان يوم القيامة قصر الله عهده وكرامته على أوليائه.

۱۶۰۸ ـ حدثنا الحسن بن يحيى، قال: أخبرنا عبد الرزاق، قال: أخبرنا معمر، عن قتادة في قوله: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ قال: لاينال عهد الله في الآخرة الظالمون، فأما في الدنيا فقد ناله الظالم وأكل به وعاش.

۱۶۰۹ ـ حدثني المثنى، قال: ثنا إسحاق، قال: ثنا عبد الرحمن، عن إسرائيل عن منصور، عن إبراهيم: ﴿قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ قال: لاينال عهد الله في الآخرة الظالمون، فأما في الدنيا فقد ناله الظالم فأمن به وأكل وأبصر وعاش.

وقال آخرون: بل العهد الذي ذكره الله في هذا الموضع: دين الله، ذكر من قال ذلك:

۱۶۱۰ ـ حدثت عن عمار، قال: ثنا ابن أبي جعفر، عن أبيه عن الربيع، قال: قال الله لإبراهيم: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ فقال: عهد الله الذي عهد إلى عباده: دينه. يقول: لا ينال دينه الظالمين. ألاترى أنه قال: ﴿وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ﴾ يقول: ليس كل ذريتك يا إبراهيم على الحق.

۱۶۱۱ ـ حدثني يحيى بن جعفر، قال: أخبرنا يزيد، قال: أخبرنا جويبر، عن الضحاك في قوله: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ قال: لا ينال عهدي عدوّلي يعصيني، ولا أنحلها إلا وليا يطيعني.

وهذا الكلام وإن كان ظاهره خبرًا عن أنه لاينال من ولد إبراهيم صلوات الله عليه عهد الله الذي هو النبوّة والإمامة لأهل الخير، بمعنى الاقتداء به في الدنيا، والعهد الذي بالوفاء به ينجو في الآخرة، من وفى لله

به في الدنيا ، من كان منهم ظالماً متعدياً جائراً عن قصد سبيل الحق . فهو إعلام من الله تعالى ذكره لإبراهيم أن من ولده من يشرك به ويجوز عن قصد السبيل ، ويظلم نفسه وعباده . كالذي :

٢٠٤٦ - حدثني إسحاق بن إبراهيم بن حبيب بن الشهيد ، قال : ثنا عتاب بن بشر ، عن خصيف ، عن مجاهد في قوله : ﴿ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴾ قال : إنه سيكون في ذريتك ظالمون .

وأما نصب الظالمين ، فلأن العهد هو الذي لا ينال الظالمين . وذُكر أنه في قراءة ابن مسعود : " لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمُوْنَ " بمعنى أن الظالمين هم الذين لا ينالون عهد الله . وإنما جاز الرفع في الظالمين والنصب . وكذلك في العهد ، لأن كل ما نال المرء فقد ناله المرء ، كما يقال : نالني خيرُ فلان ونلت خيره ، فيوجه الفعل مرة إلى الخير ومرة إلى نفسه . وقد بينا معنى الظلم فيما مضى فكرهنا إعادته .

تفسیر کشاف :۔

﴿ابتلى إبراهيم ربه بكلمات﴾ اختبره بأوامر ونواه . واختبار الله عبده مجاز عن تمكينه عن اختيار احد الامرين مايريد الله ، ومايشتهيه العبد . كانه يمتحنه مايكون منه حتى يجازيه على حسب ذلك . وقرأ أبوحنيفة رضي الله عنه وهي قراءة ابن عباس رضي الله عنهما ﴿ إبراهيم ربه ﴾ رفع إبراهيم ونصب ربه . والمعنى انه دعاه بكلمات من الدعاء فعل المختبر هل يجيبه اليهن ام لا . فإن قلت . الفاعل في القراءة المشهورة يلي الفعل في التقدير فعلق الضمير به اضمار قبل الذكر . قلتُ . الاضمار قبل الذكران يقال ابتلى ربهُ إبراهيم ' فأما ابتلي إبراهيم اوابتلى ربه ' إبراهيم فليس واحد منهما باضمار قبل الذكر . أما الأول فقد ذكر فيه صاحب الضمير قبل الضمير ذكراً ظاهراً . وأما الثاني فإبراهيم فيه مقدم في المعنى وليس كذلك ابتلى ربهُ إبراهيم لإنّ الضمير فيه قد تقدم لفظاً ومعنىً فلاسبيل الى صحته . والمستكن في ﴿فأتمهن﴾ في احدى القراء تين لإبراهيم بمعنى فقام بهن حق القيام وأداهن احسن التأدية من غير تفريط وتوان ' ونحوه . وإبراهيم

الذي ولي . وفي الاخرى لله تعالى بمعنى فأعطاه ما طلبه لم ينقص منه شيئاً . ويعضده ما روى عن مقاتل أنه فسر الكلمات بما سأل إبراهيم ربه في قوله . ربّ اجعل هذا البلد آمناً . واجعلنا مسلمين لك . وابعث فيهم رسولاً منهم . ربنا تقبل منا . فإن قلتَ : ماالعامل في اذ : قلتُ : امّا مضمر نحو واذكر اذ ابتلى او واذ ابتلاه كان كيت وكيت ' واما قال اني جاعلك . فإن قلتَ : فما موقع قال ؟ قلتُ : هو على الاوّل استئناف كانه قيل : فماذا قال له ربه حين اتم الكلمات ؟ فقيل : قال اني جاعلك للناس اماماً . وعلى الثاني جملة معطوفة على ماقبلها. ويجوز ان يكون بياناً لقوله ابتلى وتفسيراً له' فيراد بالكلمات ماذكره من الإمامة و تطهير البيت ورفع قواعده والاسلام قبل ذلك في قوله اذ قال له ربه اسلم ' وقيل في الكلمات هن خمس في الرأس : الفرق وقص الشارب والسواك والمضمضة والاستنشاق ' وخمس في البدن : الختان والاستحداد والاستنجاء وتقليم الاظافر ونتف الابط ' وقيل ابتلاه من شرائع الاسلام بثلاثين سهما : عشر في براءة : التائبون العابدون

وعشر في الاحزاب : انّ المسلمين والمسلمات . وعشر في المؤمنون . وسأل سائل إلى قوله : والذين هم على صلاتهم يحافظون ؛ وقيل هي مناسك الحج كالطواف والسعي والرمي والاحرام والتعريف وغيرهن ' وقيل ابتلاه بالكواكب والقمر والشمس والختان وذبح ابنه والنار والهجرة والإمام اسم من يؤتم به على زنة الاٰلة كالازار لما يؤتزر به : اى يأتمون بك في دينهم ﴿ومن ذريتي﴾ عطف على الكاف كانه قال وجاعل بعض ذريتي ' كما يقال لك ساكرمك فتقول وزيداً . ﴿لاينال عهدى الظالمين﴾ وقرىء الظالمون : أى من كان ظالماً من ذريتك لا يناله استخلافي وعهدى إليه بالإمامة وأنما ينال من كان عادلاً بريئاً من الظلم ' وقالوا في هذا دليل على أنّ الفاسق لايصلح للإمامة ' وكيف يصلح لها من لايجوز حكمه وشهادته ولاتجب طاعته ولايقبل خبره ولايقدم للصلاة ؟ وكان ابو حنيفة رحمه الله يفتي سرا بوجوب نصرة زيد بن علي رضوان الله عليهما وحمل المال إليه والخروج معه على اللص المتغلب

المتسمي بالإمام والخليفة كالدوانيقي وأشباهه' وقالت له امرأة: أشرت على ابني بالخروج مع إبراهيم ومحمد ابني عبدالله بن الحسن حتى قتل' فقال ليتني مكان ابنك' وكان يقول في المنصور وأشياعه لو أرادوا بناء مسجد وأراد وني على عد أجره لما فعلت وعن ابن عيينة : لا يكون الظالم إماماً قط ' وكيف يجوز نصب الظالم للإمامة والإمام إنما لكف الظلمة' فإذا نصب من كان ظالما في نفسه فقدجاء المثل السائر:من استرعى الذئب ظلم

تفسیر معالم التنزیل:(ص۱۱۱ج۱،طبع ملتان)

﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰٓ إِبْرٰهِيمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ﴾: قرأ ابن عامر :إبراهام بالألف في بعض المواضع 'وهو ثلاثة وثلاثون موضعاً'جملته تسعة وتسعون موضعاً ' وهو اسم أعجمي ولذلك لايجري عليه الصرف ' وهو إبراهيم بن تارخ هو آزربن ناخور' وكان مولده بالسوس من أرض الأهواز، وقيل : بابل' وقيل: كوثى' وقيل : كسكر' وقيل : حران ، ولكن أباه نقله إلى أرض بابل بأرض نمروز بن كنعان'ومعنى الابتلاء: الاختبار و الامتحان والأمر، وابتلاء الله العباد ليس ليعلم أحوالهم بالابتلاء لأنه عالم بهم ' ولكن ليعلم العبادَ أحوالَهم حتى يعرف بعضهم بعضاً ' واختلفوافي الكلمات التي ابتلى الله بها إبراهيم ' فقال عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنهما :هي ثلاثون سهماً ' شرائع الإسلام لم يُبتل بها أحد فأقامها كلّها إبراهيمُ' فكتب له البراءة ' فقال : ﴿وإبراهيم الذي وفّىٰ﴾ عشر في براءة: ﴿التائبون العابدون﴾ إلى آخرها 'وعشر في الأحزاب ﴿إن المسلمين والمسلمات﴾ إلى آخرها، وعشر في سورة المؤمنين في قوله ﴿قدأفلح المؤمنون ﴾ الآيات'وقوله :﴿إلا المصلين﴾'في سأل سائل 'وقال طاوس عن ابن عباس رضي الله عنهما : ابتلاه الله تعالىٰ بعشرة أشياء 'وهي الفطرة خمس في الرأس :قصُّ الشارب والمضمضة والاستنشاق و السواك وفرق الرأس 'وخمس في البدن : تقليم الأظفار ونتفُ الإبط و حلق العانة والختانُ والاستنجاء بالماء 'وفي الخبر أن إبراهيم عليه السلام اوّل من

قص الشارب ، وأوّل من اختتن ،وأوّل من قلم الأظافر ،وأوّل من رأى الشيب ،فلما رآه قال : يارب ما هذا ؟ قال :الوقار. قال : يارب زدني وقاراً ، قال مجاهد :هي الآيات الّتي بعدها في قوله عزّ رجلّ :﴿إنّي جاعلك للنّاسِ إماماً ﴾ إلى آخر القصة ،وقال الربيع وقتادة : مناسك الحج ، وقال الحسن : ابتلاه الله بسبعة أشياء : بالكواكب والقمر والشمس فأحسن فيها النظر ،وعلم أن ربه دائم لايزول ، وبالنار فصبر عليها ، وبالهجرة وبذبح ابنه وبالختان فصبر عليها ، قال سعيدبن جبير : هوقول إبراهيم وإسماعيل إذيرفعان البيت : ﴿ربنا تقبل منا ﴾ الآية ، فرفعاه بسبحان الله والحمد لله ولاإله إلا الله والله أكبر، قال يمان بن رباب : هنّ محاجة قومه ، قال الله تعالى :﴿وحاجّه قومُه﴾إلى قوله تعالى :﴿وتلك حجّتنا آتيناها إبراهيم ﴾ ، وقيل: هي قوله :﴿الذي خلقني فهو يهدين﴾ ، إلى آخر الآيات، فأتمهنّ، قال قتادة أدّا هنّ قال الضحاك : قام بهنّ، وقال يمان : عمل بهنّ، قال الله تعالى :﴿قال إني جاعلك للناس إماما﴾ يُقتدى بك في الخير ﴿قال﴾ إبراهيم:﴿ومن ذريتي﴾ أي : ومن أولادي أيضاً فجعل أئمة يقتدى بهم ﴿قال﴾الله تعالى :﴿لاينال ﴾: لايصيب ﴿عهدي الظالمين ﴾ ، قرأحمزة وحفص بإسكان الياء والباقون بفتحها ، أي : مَن كان منهم ظالماً لا يصيبه ، قال عطاء بن أبي رباح : عهدي رحمتي، وقال السدي : نبوتي ، وقيل : الإمامة ، قال مجاهد : ليس لظالم أن يُطاع في ظُلمه ، ومعنى الآية : لاينال ماعهدتُ إليك من النبوة والإمامة من كان ظالماً من وَلَدِك ،وقيل : أرادبالعهدالأمان من النار ، وبالظالم المشرك ، كقوله تعالى : ﴿الذين آمنوا ولم يلبسُوا إيمانهم بظلم أولئك لهم الأمن ﴾

تفسير كبير: (ص٣٠-٣٩ ج٢)

واعلم أنه سبحانه وتعالى لما استقصى في شرح وجوه نعمه على بني إسرائيل ثم في شرح قبائحهم في أديانهم وأعمالهم وختم هذا الفصل بما بدأبه وهو قوله ﴿يا بني إسرائيل اذكروا نعمتي ﴾ إلى قوله ﴿ولا هم

ينصرون﴾ شرع سبحانه ههنا في نوع آخر من البيان وهو أن ذكر قصة إبراهيم عليه السلام وكيفية أحواله ، والحكمة فيه أن إبراهيم عليه السلام شخص يعترف بفضله جميع الطوائف والملل، فالمشركين كانوا معترفين بفضله متشرفين بأنهم من أولاده ومن ساكني حرمه وخادمي بيته.وأهل الكتاب من اليهود والنصارى كانوا أيضامقرين بفضله متشرفين بأنهم من أولاده ، فحكى الله سبحانه وتعالىٰ عن إبراهيم عليه السلام أموراً توجب على المشركين وعلى اليهود والنصارى قبول قول محمد ﷺ والاعتراف بدينه والانقياد لشرعه ، وبيانه من وجوه :

أحدها: أنه تعالى لما أمره ببعض التكاليف فلما وفي بها وخرج عن عهد تها لاجرم نال النبوة والإمامة وهذا مما ينبه اليهود والنصارى والمشركين على أن الخير لا يحصل في الدنيا والآخرة إلا بترك التمرد والعناد والانقياد لحكم الله تعالىٰ وتكاليفه . وثانيها: أنه تعالىٰ حكى عنه أنه طلب الإمامة لأولاده فقال الله تعالى:﴿ لاينال عهدي الظالمين ﴾ فدل ذلک على أن منصب الإمامة والرياسة في الدين لا يصل إلى الظالمين، فهؤلاءِ متى أرادوا وجدان هذا المنصب وجب عليهم ترک اللجاج والتعصب للباطل . وثالثها : أن الحج من خصائص دين محمد ﷺ فحكى الله تعالى ذلک عن إبراهيم ليكون ذلک كا لحجة على اليهود والنصارى في وجوب الانقياد لذالک. ورابعها: أن القبلة لما حولت إلى الكعبة شق ذالک على اليهود والنصارى ، فبين الله تعالىٰ أن هذا البيت قبلة إبراهيم الذي يعترفون بتعظيمه و وجوب الاقتداء به فكان ذالک مما يوجب زوال ذالک الغضب عن قلوبهم . وخامسها : أن من المفسرين من فسر الكلمات التي ابتلى الله تعالىٰ إبراهيم بها بأمور يرجع حاصلها إلى تنظيف البدن وذالک مما يوجب على المشركين اختيار هذه الطريقة لأن هم كانوا معترفين بفضل إبراهيم عليه السلام ويوجب عليهم ترک ما كانوا عليه من التلطخ بالدماء وترک النظافة ومن المفسرين من فسر تلک الكلمات بما أن إبراهيم عليه السلام صبر على ما ابتلى به في دين الله تعالى وهو النظر في الكواكب والقمر والشمس ومناظرة عبدة الأوثان،

ثم الانقياد لأحكام الله تعالىٰ في ذبح الولد والإلقاء في النار ، وهذا يوجب على هؤلاءِ اليهود والنصارى والمشركين الذين يعترفون بفضله أن يتشبهوا به في ذالک ويسلكوا طريقته في ترک الحسد والحمية وكراهة الانقياد لمحمد ﷺ فهذه الوجوه الّتي لأجلها ذكر الله تعالىٰ قصة إبراهيم عليه السلام .

واعلم أنه تعالىٰ حكى عن إبراهيم عليه السلام أموراً يرجع بعضها إلى الأمور الشاقة الّتي كلفه بها ، وبعضها يرجع إلى التشريفات العظيمة الّتي خصه الله بها ، ونحن نأتي على تفسيرها إن شاء الله تعالىٰ، وهذه الآية دالّة على تكليف حصل بعده تشريف.

أما التكليف فقوله تعالىٰ:﴿ وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾ وفيه مسائل :

المسألة الأولىٰ : قال صاحب الكشاف : العامل في ﴿ إذ﴾ إما مضمر نحو: واذكر إذابتلى إبراهيم أوإذ ابتلاه كان كيْتَ كيت وإما ﴿قال إني جاعلک ﴾.

المسألة الثانية: أنه تعالىٰ وصف تكليفه إياه ببلوى توسعاً لأن مثل هذا يكون منا على جهة البلوى والتجربة والمحنة من حيث لا يعرف ما يكون ممن يأمره، فلما كثر ذلک في العرف بيننا جاز أن يصف الله تعالىٰ أمره ونهيه بذلک مجازاً لأنه تعالىٰ لا يجوز عليه الاختبار والامتحان لأنه تعالىٰ عالم بجميع المعلومات التي لا نهاية لها على سبيل التفصيل من الأزل إلى الأبد ، وقال هشام بن الحكم : إنه تعالىٰ كان في الأزل عالماً بحقائق الأشياء وماهياتها فقط ، فأما حدوث تلک الماهيات و دخولها في الوجود فهو تعالىٰ لا يعلمها إلا عند وقوعها واحتج عليه بالآية والمعقول ، أما الآية فهي هذه الآية،قال : إنه تعالىٰ صرح بأن يبتلي عباده ويختبرهم وذكر نظيره في سائر الآيات كقوله تعالىٰ: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ﴾ [محمد:٣١] وقال:﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً ﴾ [هود:٧] وقال في هذه السورة بعد ذلک:﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ﴾[البقرة:١٥٥] ، وذكر أيضاً ما يؤكد هذا

المذهب نحو قوله: ﴿ فقولا له قولاً ليناً لعلّه يتذكر أويخشى﴾ (طه:٤٤) وكلمة ﴿لعل﴾ للترجي وقال: ﴿ يا أيها الناسُ اعبدُوا ربَّكم الذي خلقَكُم وَالذِينَ مِن قَبلِكم لَعَلّكُم تتقون﴾ (البقرة:٢١) فهذه الآيات ونظائرها دالة على أنه سبحانه وتعالى لا يعلم وقوع الكائنات قبل وقوعها، أما العقل فدل على وجوه. أحدها: أنه تعالىٰ لو كان عالماً بوقوع الأشياء قبل وقوعها لزم نفي القدرة عن الخالق وعن الخلق، وذلك محال فما أدى إليه مثله بيان الملازمة: أن ما علم الله تعالىٰ وقوعه استحال أن لا يقع لأن العلم بوقوع الشيء و بلا وقوع ذلك الشيء متضادان والجمع بين الضدين محال، وكذلك ما علم الله أنه لا يقع كان وقوعه محالاً لعين هذه الدلالة، فلو كان الباري تعالىٰ عالماً بجميع الأشياء الجزئية قبل وقوعها لكان بعضها واجب الوقوع وبعضها ممتنع الوقوع، ولا قدرة ألبتة لا على الواجب ولا على الممتنع فيلزم نفي القدرة على هذه الأشياء عن الخالق تعالىٰ وعن الخلق وإنما قلنا: إنّ ذلك محال أما في حق الخالق فلأنه ثبت أن العالم محدث وله مؤثر وذلك المؤثر يجب أن يكون قادراً إذ لو كان موجباً لذاته لزم من قدمه قدم العالم أو من حدوث العالم من حدوثه، وأما في حق الخلق فلأنا نجد من أنفسنا وجداناً ضرورياً كوننا متمكنين من الفعل والترك، على معنى أنا إن شئنا الفعل قدرنا عليه، وإن شئنا الترك قدرنا على الترك، فلو كان أحدهما واجباً والآخر ممتنعاً لما حصلت هذه المكنةالتي يعرف ثبوتها بالضرورة .وثانيها: أن تعلق العلم بأحد المعلومين مغائر لتعلقه بالمعلوم الآخر، ولذلك فإنه يصل منا تعقل أحد التعلقين مع الذهول عن التعلق الآخر، ولو كان التعلقان تعلقاً واحداً لاستحال ذلك، لأن الشيء الواحد يستحيل أن يكون معلوماً مذهولاً عنه، وإذا ثبت هذا فنقول: و لو كان تعالىٰ عالماً بجميع هذه الجزئيات، لكان له تعالىٰ علوم غير متناهية، أو كان لعلمه تعلقات غير متناهية، وعلى التقديرين فيلزم حصول موجودات غير متناهية دفعة واحدة وذلك محال، لأن مجموع تلك الأشياء أزيد من ذلك المجموع بعينه عند نقصان عشرة منه، فالناقص متناه، والزائد زاد على المتناهي

بتلك العشرة ، والمتناهي اذا ضم إليه غير المتناهي كان الكل متناهياً ، فإذاً وجود أمور غير متناهيه محال ، فإن قيل : الموجود هو العلم فأما تلك التعلقات فهي أمور نسبية لا وجود لها في الأعيان ، قلنا : العلم إنما يكون علماً لو كان متعلقاً بالمعلوم ، فلو لم يكن ذلك التعلق حاصلاً في نفس الأمر لزم أن لايكون العلم علماً في نفس الأمر و ذلك محال ، وثالثها : أن هذه المعلومات التي لانهاية لها ، هل يعلم الله عددها أو لا يعلم ، فإن علم عددها فهي متناهية ، لأن كل ما له عدد معين فهو متناه ، وإن لم يعلم الله تعالىٰ عددها لم يكن عالماً بها على سبيل التفصيل ، وكلامنا ليس إلا في العلم التفصيلي . ورابعها : أن كل معلوم فهو متميز في الذهن عما عداه ، وكل متميز عما عداه فإن ما عداه خارج عنه ، وكل ما خرج عنه فهو متناه ، فإذن كل معلوم فهو متناه ، فإذن كل ما هو غير متناه استحال أن يكون معلوماً . وخامسها : أن الشيء إنما يكون معلوماً لو كان العلم تعلق به ونسبة إليه وانتساب الشيء إلى الشيء يعتبر تحققه في نفسه ، فإنه إذا لم يكن للشيء في نفسه تعين استحال أن يكون لغيره إليه من حيث هو هو نسبة ، والشيء المشخص قبل دخوله في الوجود لم يكن مشخصاً ألبتة ، فاستحال كونه متعلق العلم ، فإن قيل : يبطل هذا بالمحالات والمركبات قبل دخولها في الوجود ، فإنا نعلمها وإن لم يكن لها تعينات ألبتة ، قلنا : هذا الذي أوردتموه نقض على كلامنا ، وليس جواباً عن كلامنا ، وذلك مما لايزيل الشك والشبهة ، قال هشام : فهذه الوجوه العقلية تدل على أنه لاحاجة إلى صرف هذه الآيات عن ظواهرها ، واعلم أن هشاماً كان رئيس الرافضة ، فلذلك ذهب قدماء الرافضة إلى القول بالبداء ، أما الجمهور من المسلمين فإنهم اتفقوا على أنه سبحانه و تعالىٰ يعلم الجزئيات قبل وقوعها ، واحتجوا عليها بأنها قبل وقوعها تصح أن تكون معلومة لله تعالىٰ إنما قلنا أنها تصح أن تكون معلومة لأنا نعلمها قبل وقوعها فإنا نعلم أن الشمس غداً تطلع من مشرقها ، والوقوع يدل على الإمكان ، وإنما قلنا : أنه لما صح أن تكون معلومة وجب أن تكون معلومة لله تعالىٰ لأن تعلق علم الله تعالىٰ بالمعلوم أمر ثبت له لذاته ، فليس

تعلقه ببعض ما يصح أن يعلم أولى من تعلقه بغيره ، فلو حصل التخصيص لافتقر إلى مخصص ، وذلك محال ، فوجب أن لا يتعلق بشيء من المعلومات أصلاً وإن تعلق بالبعض فإنه يتعلق بكلها وهو المطلوب.

أما الشبهة الأولى: فالجواب عنها أن العلم بالوقوع تبع للوقوع ، و الوقوع تبع للقدرة ، فالتابع لاينافي المتبوع ، فالعلم لازم لايغني عن القدرة.

وأما الشبهة الثانية: فالجواب عنها: أنها منقوضة بمراتب الأعداد التي لا نهاية لها.

وأما الشبهة الثالثة: فالجواب عنها : أن الله تعالى لا يعلم عددها ، ولايلزم منه إثبات الجهل ، لأن الجهل هوأن يكون لها عدد معين ، ثم أن الله تعالى لا يعلم عددها ، فأما إذا لم يكن في نفسها عدد ، لم يلزم من قولنا : أن الله تعالى لا يعلم عددها إثبات الجهل.

وأما الشبهة الرابعة :فالجواب عنها : أنه ليس من شرط المعلوم أن يعلم العلم تميزه عن غيره ، لأن العلم بتميزه عن غيره يتوقف على العلم بذلك الغير ، فلو كان توقف العلم بالشيء على العلم بتميزه عن غيره ، وثبت أن العلم بتميزه عن غيره يوقف على العلم بغيره ، لزم أن لا يعلم الإنسان شيئاً واحداً إلا إذا علم أموراً لا نهاية لها.

وأما الشبهة الخامسة: فالجواب عنها بالنقض الذي ذكرناه ، وإذا انتقضت الشبهة سقطت ، فيبقي ما ذكرناه من الدلالة على عموم عالمية الله تعالىٰ سالماً عن المعارض ، وبالله التوفيق .

المسألة الثالثة : اعلم أن الضمير لابد وأن يكون عائداً إلى مذكور سابق ، فالضميرإما أن يكون متقدماً على المذكورلفظاً ومعنى ، وإما أن يكون متأخراً عنه لفظاً ومعنى ، وإما أن يكون متقدماً لفظاً ومتأخراً معنى ، وإما أن يكون بالعكس منه . أما القسم الأول : وهو أن يكون متقدماً لفظاً ومعنى ، فالمشهور عندالنحويين أنه غير جائز، وقال ابن جني بجوازه ، واحتج عليه بالشعر والمعقول ، أما الشعر فقوله :

جزى ربه عني عدي بن حاتم جزاء الكلاب العاويات وقد فعل.

وأما المعقول فلأن الفاعل مؤثر والمفعول قابل وتعلق الفعل بهما

شديد ، فلا يبعد تقديم أي واحد منهما كان على الآخر في اللفظ ، ثم أجمعنا على أنه لو قدم المنصوب على المرفوع في اللفظ فإنه جائز ، فكذا إذا لم يقدم مع أن ذلك التقديم جائز. القسم الثاني: وهو أن يكون الضمير متأخراً لفظاً ومعنى ، وهذا لا نزاع في صحته ، كقولك : ضرب زيد غلامه . القسم الثالث: أن يكون الضمير متقدماً في اللفظ متأخراً في المعنى وهو كقولك: ضرب غلامه زيد ، فههنا الضمير وإن كان متقدماً في اللفظ لكنه متأخر في المعنى ، لأن المنصوب متأخر عن المرفوع في التقدير، فيصير كأنك قلت: زيد ضرب غلامه فلا جرم كان جائزاً . القسم الرابع : أن يكون الضمير متقدماً في المعنى متأخراً في اللفظ ، وهو كقوله تعالى :﴿ وإذ ابتلى إبراهيم ربه﴾ فإن المرفوع مقدم في المعنى على المنصوب ، فيصير التقدير : وإذابتلى ربه إبراهيم ، إلا أن الأمر وإن كان كذلك بحسب المعنى لكن لما لم يكن الضمير متقدماً في اللفظ بل كان متأخراً لا جرم كان جائزاً حسناً.

المسألة الرابعة : قرأ ابن عامر﴿إبراهام﴾ بألف بين الهاء والميم ، والباقون (إبراهيم)وهما لغتان ، وقرأابن عباس وأبو حيوة رضي الله عنه ﴿إبراهيم ربه ﴾ برفع إبراهيم ونصب ربه ، والمعنى أنه دعاه بكلمات من الدعاء فعل المختبر هل يجيبه الله تعالىٰ إليهن أم لا .

المسألة الخامسة : اختلف المفسرون في أن ظاهر اللفظ هل يدل على تلك الكلمات أم لا ؟ فقال بعضهم : اللفظ يدل عليها وهي التي ذكرها الله تعالىٰ من الإمامة وتطهير البيت ورفع قواعده والدعاء بابعاث محمد ﷺ ، فإن هذه الأشياء أمور شاقة ، أما الإمامة فلأن المراد منها ههنا هو النبوة ، وهذا التكليف يتضمن مشاق عظيمة ، لأن النبي ﷺ يلزمه أن يتحمل جميع المشاق والمتاعب في تبليغ الرسالة ، وأن لا يخون في أداء شيء منها ، ولولزمه القتل بسبب ذلك ولا شك أن ذلك من أعظم المشاق ، ولهذا قلنا : إنّ ثواب النبي أعظم من ثواب غيره ، وأما بناء البيت وتطهيره ورفع قواعده ، فمن وقف على ما روي في كيفية بنائه عرف شدة البلوى فيه،ثم أنه يتضمن إقامة المناسك ، وقد

امتحن الله الخليل عليه الصلاة والسلام بالشيطان في الموقف لرمي الجمار وغيره ، وأما اشتغاله بالدعاء في أن يبعث الله تعالىٰ محمداً ﷺ في آخر الزمان ، فهذا مما يحتاج إليه اخلاص العمل لله تعالى، وازالة الحسد عن القلب بالكلية، فثبت أن الأمور المذكورة عقيب هذه الآية : تكاليف شاقة شديدة ، فأمكن أن يكون المراد من ابتلاء الله تعالى إياه بالكلمات هو ذلك ، ثم الذي يدل على أن المراد ذلك أنه عقبه بذكره من غير فصل بحرف من حروف العطف فلم يقل ، وقال: إني جاعلك للناس إماماً ، بل قال: ﴿إنّي جاعلُك﴾ فدل هذا على أن ذلك الابتلاء ليس إلاالتكليف بهذه الأمورالمذكورة ، واعترض القاضي على هذا القول فقال : هذا إنما يجوز لوقال الله تعالى : وإذا ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمها إبراهيم ، ثم أنه تعالىٰ قال له بعد ذلك : إني جاعلك للناس إماماً فأتمهن ، إلا أنه ليس كذلك ، بل ذكر قوله : ﴿ إنّي جاعِلُكَ لِلنّاسِ إماماً ﴾ بعد قوله :﴿فَأَتَمَّهُنَّ﴾ وهذايدلّ على أنه تعالىٰ امتحنه بالكلمات وأتمها إبراهيم ، ثم أنه تعالى قال له بعد ذلك : ﴿ إنّي جاعِلُكَ لِلنّاسِ إماماً ﴾ ويمكن أن يجاب عنه بأنه ليس المراد من الكلمات الإمامة فقط، بل الإمامة وبناء البيت وتطهيره والدعاء في بعثة محمد ﷺ ، كأن الله تعالىٰ ابتلاه بمجموع هذه الأشياء ، فأخبر الله تعالىٰ عنه أنه ابتلاه بأمورعلى الإجمال ، ثم أخبرعنه أنه أتمها، ثم عقب ذلك بالشرح والتفصيل ، وهذامما لا بعد فيه . القول الثاني:أن ظاهر الآية لا دلالة فيه ،على المراد بهذه الكلمات وهذاالقول يحتمل وجهين ، أحدهما : بكلمات كلفه الله بهن ، وهي أوامره ونواهيه فكأنه تعالىٰ قال:﴿ وَإذْ ابْتَلىٰ إبْراهيمَ رَبُّه بِكَلِماتٍ﴾ مما شاء كلفه بالأمر بها. والوجه الثاني: بكلمات تكون من ابراهيم يكلم بها قومه ، أي يبلغهم إياها ، والقائلون بالوجه الأوّل اختلفوا في أن ذلك التكليف بأي شيء كان على أقوال .أحدها: قال ابن عباس هي عشر خصال كانت فرضاً في شرعه

وهي سنة في شرعنا ، خمس في الرأس وخمس في الجسد ، أما التي في الرأس. فالمضمضة ، والإستنشاق ، وفرق الرأس ، وقص الشارب ، و السواک ، وأما التي في البدن : فالختان وحلق العانة ، ونتف الإبط ، وتقليم الأظفار ، والاستنجاء بالماء ، وثانيها : قال بعضهم : ابتلاه بثلاثين خصلة من خصال الإسلام ، عشرمنها في سورة براء ة :﴿ التائبون العابدون﴾ [التوبة:۱۱۲] إلى آخر الآية ، وعشرمنها في سورة الأحزاب : ﴿إن المسلمين والمسلمات﴾ [الاحزاب:۳۵]إلى آخر الآية ، وعشرمنها في المؤمنون:﴿قدأفلح المؤمنون﴾ [المؤمنون:۱]إلى قوله :﴿ أولئک هم الوارثون﴾ [المؤمنون:۱۰]وروي عشر في : ﴿سأل سائل﴾ [المعارج:۱] إلى قوله : ﴿والذين هم على صلاتهم يحافظون﴾ [المعارج:۳۴] فجعلها أربعين سهماً عن ابن عباس . وثالثها : أمره بمناسک الحج ، كالطواف والسعي والرمي والإحرام وهو قول قتادة وابن عباس. ورابعها: ابتلاه بسبعة أشياء: بالشمس ،والقمر ، والكواكب ، والختان على الكبر، والنار، وذبح الولد والهجرة ، فوفى بالكل فلهذا قال الله تعالى: ﴿ وإبراهيم الذي وفى ﴾ [النجم:۳۷]عن الحسن . وخامسها : أن المراد ما ذكره في قوله:﴿إذ قال له ربه أسلم قال أسلمت لرب العالمين﴾ [البقرة:۱۳۱]. و سادسها : المناظرات الكثيرة في التوحيد مع أبيه وقومه ومع نمروذ والصلاة والزكاة والصوم ، وقسم الغنائم ، و الضيافة ، والصبرعليها ، قال القفال رحمه الله : وجملة القول أن الابتلاء يتناول إلزام كل ما في فعله كلفة شدة ومشقة ، فاللفظ يتناول مجموع هذه الأشياء ويتناول كل واحد منها، فلو ثبت الرواية في الكل وجب القول بالكل ، ولوثبتت الرواية في البعض دون البعض فحينئذ يقع التعارض بين هذه الروايات ، فوجب التوقف والله اعلم.

المسألة السادسة: قال القاضي: هذا الابتلاء إنما كان قبل النبوة ، لأن الله تعالى نبه على أن قيامه عليه الصلاة والسلام بهن كا لسبب لأن

يجعله الله إماماً ، والسبب مقدم على المسبب ، فوجب كون هذا الابتلاء متقدماً في الوجود على صيرورته إماماً وهذا أيضا ملائم لقضايا العقول، وذلك لأن الوفاء من شرائط النبوة لا يحصل إلا بالإعراض عن جميع ملاذ الدنيا وشهواتهاوترك المداهنة مع الخلق وتقبيح ما هم عليه من الأديان الباطلة والعقائد الفاسدة ، وتحمل الأذى من جميع أصناف الخلق ، ولا شك أن هذا المعنى من أعظم المشاق وأجل المتاعب ، ولهذا السبب يكون الرسول عليه الصلاة والسلام أعظم اجراً من أمته ، وإذا كان كذلك فالله تعالىٰ ابتلاه بالتكاليف الشاقة ، فلما وفى عليه الصلاة والسلام بها لا جرم أعطاه خلعة النبوة والرسالة ، وقال آخرون : إنه بعد النبوة لأنه عليه الصلاة والسلام لا يعلم كونه مكلفاً بتلك التكاليف إلا من الوحي ، فلا بد من تقدم الوحي على معرفته بكونه كذلك ، أجاب القاضي عنه بأنه يحتمل أنه تعالىٰ اوحىٰ إليه على لسان جبريل عليه السلام بهذه التكاليف الشاقة ، فلما تمم ذلك جعله نبياًمبعوثاً إلى الخلق ، إذا عرفت هذه المسألة فنقول قال القاضي: يجوز أن يكون المراد بالكلمات، ما ذكره الحسن من حديث الكوكب والشمس والقمر ، فإنه عليه الصلاه والسلام ابتلاه الله بذلك قبل النبوة ، أما ذبح الولد والهجرة والنار فكل ذلك كان بعد النبوة ، كذا الختان ، فإنه عليه السلام يروي أنه ختن نفسه وكان سنه مائة وعشرين سنة ، ثم قال: فإن قامت الدلالة السمعية القاهرة على أن المراد من الكلمات هذه الأشياء كان المراد من قوله: ﴿ أتمهن﴾ أنه سبحانه علم من حاله أنه يتمهنّ ويقوم بهنّ بعد النبوة فلاجرم أعطاه خلعة الإمامة والنبوة.

المسألة السابعة: الضمير المستكن في ﴿ فأتمهنّ﴾ في إحدى القرائتين لإبراهيم بمعنى فقام بهنّ حق القيام ، واداهن أحسن التأدية ، من غير تفريط وتوان. ونحوه:﴿وإبراهيم الذي وفى﴾ وفي الأخرى لله تعالىٰ بمعنى : فأعطاه ما طلبه لم ينقص منه شيئا.

أما قوله تعالى:﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ فالإمام اسم من يؤتم به كالإزارلما يؤتزر به ، أي يأتمون بك في دينك . وفيه مسائل :

المسألة الأولىٰ : قال أهل التحقيق : المراد من الإمام ههنا النبي ويدل عليه وجوه.أحدها : أن قوله: ﴿ للناس إماما﴾ يدلّ على أنه تعالىٰ جعله إماماً لكل الناس والذي يكون كذلك لا بدّ وأن يكون رسولاً من عند الله مستقلاً بالشرع لأنه لو كان تبعاً لرسول آخرلكان مأموماً لذلك الرسول لا إماماً له،فحينئذ يبطل العموم. وثانيها : أن اللفظ يدلّ على أنه إمام في كل شيء والذي يكون كذلك لا بدّ وأن يكون نبياً.وثالثها : أن الأنبياء عليهم السلام أئمة من حيث يجب على الخلق اتباعهم ، قال الله تعالىٰ:﴿وجعلناهم أئمة يهدون بأمرنا﴾ [الأنبياء:٧٣] والخلفاء أيضاً أئمة لأنهم رتبوافي المحل الذي يجب على الناس اتباعهم وقبول قولهم وأحكامهم والقضاة والفقهاء أيضاً أئمة لهذا المعني ، والذي يصلي بالناس يسمى أيضاً إماماً لأن من دخل في صلاته لزمه الائتمام به . قال عليه الصلاة والسلام :"إنما جعل الإمام إماماً ليؤتم به فإذا ركع فاركعوا وإذا سجد فاسجدوا ولا تختلفوا على إمامكم " فثبت بهذا أن اسم الإمام لمن استحق الاقتداء به في الدين وقد يسمى بذلك أيضاً من يؤتم به في الباطل ، قال الله تعالىٰ: ﴿وجعلناهم أئمة يدعون إلى النار﴾ [القصص:٤١] إلاأن اسم الإمام لايتناوله على الإطلاق بل لا يستعمل فيه إلا مقيداً ، فإنه لما ذكر أئمة الضلال قيده بقوله تعالىٰ : ﴿يدعون إلى النار﴾ كما أن اسم الإله لايتناول إلا المعبود الحق ، فأما المعبود الباطل فإنما يطلق عليه اسم الإله مع القيد ، قال الله تعالىٰ : ﴿ فما أغنت عنهم آلهتهم التي يدعون من دون الله من شيء﴾ [هود:١٠١] وقال :﴿وانظر إلى إلهك الذي ظلت عليه عاكفا﴾[طه:٩٧]إذا ثبت أن اسم الإمام يتناول ما ذكرناه ، وثبت أن الأنبياء في أعلى مراتب الإمامة وجب حمل اللفظ ههنا عليه ، لأن الله تعالىٰ ذكر لفظ الإمام ههنا في معرض الامتنان ، فلا بدّ وأن تكون تلك النعمة من أعظم النعم ليحسن نسبة الامتنان فوجب حمل هذه الإمامة على النبوة.

المسألة الثانية : أن الله تعالىٰ لما وعده بأن يجعله إماماً للناس حقق الله تعالىٰ ذلك الوعد فيه إلى قيام الساعة ، فإن أهل الأديان على شدة اختلافها ونهاية تنافيها يعظمون إبراهيم عليه الصلاة والسلام ويتشرفون

بالانتساب إليه إما في النسب وإما في الدين والشريعة حتى إن عبدة الأوثان كانوا معظمين لإبراهيم عليه السلام ، وقال الله تعالى في كتابه: ﴿ثم أوحينا اليك أن اتبع ملة إبراهيم حنيفاً﴾ [النحل: ١٢٣] وقال: ﴿ومن يرغب عن ملة إبراهيم إلا من سفه نفسه﴾ [البقرة: ١٣٠] وقال في آخر سورة الحج: ﴿ملة أبيكم إبراهيم هو سماكم المسلمين من قبل﴾ [الحج ٧٨] وجميع أمة محمد عليه الصلاة والسلام يقولون في آخر الصلاة وارحم محمداً وآل محمد كما صليت وباركت وترحمت على إبراهيم وعلى آل إبراهيم .

المسألة الثالثة: القائلون بأن الإمام لا يصير إماماً إلا بالنص تمسكوا بهذه الآية فقالوا : إنه تعالى بين أنه إنما صار إماماً بسبب التنصيص على إمامته ونظيره قوله تعالى: ﴿إني جاعل في الارض خليفة﴾ [البقرة: ٣٠] فبين أنه لا يحصل له منصب الخلافة إلا بالتنصيص عليه وهذا ضعيف لأ نا بينا أن المراد بالإمامة ههنا النبوة ثم إن سلمنا أن المراد منها مطلق الإمامة لكن الآية تدل على أن النص طريق الإمامة وذلك لا نزاع فيه ، إنما النزاع في أنه هل تثبت الإمامة بغير النص ، وليس في هذه الآية تعرض لهذه المسألة لا بالنفي ولا بالإثبات.

المسألة الرابعة : قوله : ﴿إني جاعلك للناس إماماً﴾ يدل على أنه عليه السلام كان معصوماً عن جميع الذنوب لأن الإمام هو الذي يؤتم به ويقتدى ، فلو صدرت المعصية منه لوجب علينا الاقتداء به في ذلك ، فيلزم أن يجب علينا فعل المعصية وذلك محال لأن كونه معصية عبارة عن كونه ممنوعاً من فعله وكونه واجباً عبارة عن كونه ممنوعاً من تركه والجميع محال.

أما قوله: ﴿من ذريتي﴾ ففيه مسائل:

المسألة الأولى : الذرية: الأولاد وأولاد الأولاد للرجل وهو من ذرأ الله الخلق وتركوا همزها للخفة كما تركوا في البرية وفيه وجه آخر وهو أن تكون منسوبة إلى الذر.

المسألة الثانية: قوله : ﴿ومن ذريتي﴾ عطف على الكاف كأنه قال : وجاعل بعض ذريتي كما يقال لك : سأكرمك ، فتقول : وزيداً.

المسألة الثالثة : قال بعضهم : إنه تعالىٰ أعلمه أن في ذريته أنبياء فأراد أن يعلم هل يكون ذلك في كلهم أو في بعضهم وهل يصلح جميعهم لهذا الأمر؟ فأعلمه الله تعالىٰ أن فيهم ظالماً لا يصلح لذلك وقال آخرون : إنه عليه السلام ذكر ذلك على سبيل الاستعلام ولما لم يعلم على وجه المسألة،فأجابه الله تعالىٰ صريحاً بأن النبوة لا تنال الظالمين منهم ، فإن قيل : هل كان إبراهيم عليه السلام مأذوناً في قوله : ﴿ومن ذريتي﴾أو لم يكن مأذوناً فيه ؟ فإن أذن الله تعالىٰ في هذا الدعاء فلم رد دعاءه ؟ وإن لم يأذن له فيه كان ذلك ذنباً، قلنا : قوله: ﴿ و من ذريتي﴾ يدل على أنه عليه السلام طلب أن يكون بعض ذريته أئمة للناس، وقد حقق الله تعالىٰ إجابة دعائه في المؤمنين من ذريته كاسماعيل وإسحاق ويعقوب ويوسف وموسىٰ وهارون وداود وسليمان وأيوب ويونس وزكريا ويحي وعيسىٰ وجعل آخرهم محمداً ﷺ من ذريته الذي هو أفضل الأنبياء والأئمة عليهم السلام.

أما قوله تعالىٰ : ﴿قال لا ينال عهدي الظالمين﴾ ففيه مسائل :

المسألة الأولىٰ : قرأ حمزة وحفص عن عاصم :﴿عهدي﴾ بإسكان الياء ، والباقون بفتحها ، وقرأ بعضهم : ﴿لاينال عهدي الظالمون ﴾ أي من كان ظالماً من ذريتك فإنه لا ينال عهدي.

المسألة الثانية : ذكروا في العهد وجوهاً أحدها : أن هذا العهد هو الإمامة المذكورة فيما قبل ، فإن كان المراد من تلك الإمامة هو النبوة فكذا وإلا فلا.وثانيها:﴿عهدي﴾ أي رحمتي عن عطاء . وثالثها: طاعتي عن الضحاك . ورابعها: أماني عن أبي عبيد ، والقول الأول أولىٰ لأن قوله : ﴿ ومن ذريتي﴾ طلب لتلك الإمامة التي وعده بهابقوله : ﴿إني جاعلك للناس إماما﴾ فقوله: ﴿ لا ينال عهدي الظالمين﴾ لا يكون جواباً عن ذلك السؤال إلا إذا كان المراد بهذا العهد تلك الإمامة.

المسألة الثالثة: الآية دالة على أنه تعالىٰ سيعطي بعض ولده ما سأل، ولو لا ذلك لكان الجواب : لا ، أو يقول : لا ينال عهدي ذريتك ، فإن قيل: أفما كان إبراهيم عليه السلام عالماً بأن النبوة لا تليق بالظالمين ، قلنا:

بلي،ولكن لم يعلم حال ذريته ، فبين الله تعالىٰ أن فيهم من هذا حاله وأن النبوة إنما تحصل لمن ليس بظالم.

المسألة الرابعة:الروافض احتجوا بهذه الآية على القدح في إمامة أبي بكروعمر رضي الله عنهما من ثلاثة اوجه. الأول : أن أبابكر و عمر كانا كافرين ، فقد كانا حال كفرهما ظالمين، فوجب أن يصدق عليهما في تلك الحالة أنهما لا ينالان عهد الإمامة ألبتة ، وإذاصدق عليهما في ذلك الوقت أنهما لا ينالان عهد الإمامة ألبتة ولا في شيء من الأوقات ثبت أنهما لايصلحان للإمامة. الثاني : أن من كان مذنبا في الباطن كان من الظالمين ، فإذن مالم يعرف أن أبابكروعمرما كانا من الظالمين المذنبين ظاهراً وباطناً وجب أن لا يحكم بإمامتهما وذلك إنما يثبت في حق من تثبت عصمته ولما لم يكونا معصومين بالا تفاق وجب أن لا تتحقق إمامتهما ألبتة .الثالث: قالوا: كانا مشركين ، وكل مشرك ظالم والظالم لايناله عهد الإمامة فيلزم أن لا ينالهما عهد الإمامة،أما أنهما كانا مشركين فبالاتفاق،وأما أن المشرك ظالم فلقوله تعالى:﴿إن الشرك لظلم عظيم﴾ (لقمان:١٣) وأما أن الظالم لاينال عهد الإمامة فلهذه الآية ، لا يقال إنهما كانا ظالمين حال كفرهما ، فبعد زوال الكفر لايبقى هذا الاسم لأنا نقول الظالم من وجد منه الظلم ، وقولنا : وجد منه الظلم أعم من قولنا وجد منه الظلم في الماضي أو في الحال بدليل أن هذا المفهوم يمكن تقسيمه إلى هذين القسمين ، ومورد التقسيم بالتقسيم بالقسمين مشترك بين القسمين وما كان مشتركاً بين القسمين لا يلزم انتفاؤه لانتفاء أحد القسمين ، فلا يلزم من نفي كونه ظالما في الحال نفي كونه ظالماً والذي يدل عليه نظراً إلى الدلائل الشرعية أن النائم يسمى مؤمناً والإيمان هو التصديق والتصديق غير حاصل حال كونه نائماً ، فدل على أنه يسمي مؤمناً لأن الإيمان كان حاصلاً قبل ، وإذا ثبت هذا وجب أن يكون ظالماً لظلم وجد من قبل ، وأيضاً فالكلام عبارة عن حروف متوالية ، والمشي عبارة عن حصولات متوالية في أحياز متعاقبة ، فمجموع تلك الأشياء ألبتة لاوجود لها ، فلوكان حصول المشتق منه شرطاً في كون الإسم

المشتق حقيقة وجب أن يكون اسم المتكلم والماشي وأمثالهما حقيقة في شيء أصلاً ، وأنه باطل قطعاً فدل هذا على أن حصول المشتق منه ليس شرطاً لكون الاسم المشتق حقيقة ؟ والجواب كل ما ذكرتموه معارض ، بما أنه لو حلف لايسلم على كافر فسلم على إنسان مؤمن في الحال إلا أنه كان كافراً قبل بسنين متطاولة فإنه لا يحنث ، فدل على ما قلناه ، ولأن التائب عن الكفر لا يسمى كافراً والتائب عن المعصية لا يسمى عاصيا ، فكذا القول في نظائره ، ألا ترى إلى قوله :﴿ ولا تركنوا إلى الذين ظلموا﴾ [هود:١١٣] فإنه نهي عن الركون إليهم حال إقامتهم على الظلم ، وقوله : ﴿ماعلى المحسنين من سبيل﴾[التوبة:٩١] معناه : ما أقاموا على الإحسان ، على أنا بينا أن المراد من الإمامة في هذه الآية : النبوة ، فمن كفر بالله طرفة عين فإنه لايصلح للنبوة.

المسألة الخامسة: قال الجمهور من الفقهاء والمتكلمين: الفاسق حال فسقه لا يجوز عقد الإمامة له، واختلفوا في أن الفسق الطارىء هل يبطل الإمامة أم لا ؟ واحتج الجمهور على أن الفاسق لا يصلح أن تعقد له الإمامة بهذه الآية،ووجه الاستدلال بها من وجهين.الأوّل:ما بينا أن قوله : ﴿لا ينال عهدي الظالمين﴾جواب لقوله:﴿ومن ذريتي ﴾ وقوله :﴿ومن ذريتي﴾طلب للإمامة التي ذكرها الله تعالى ، فوجب أن يكون المراد بهذا العهد هو الإمامة، ليكون الجواب مطابقاً للسؤال ، فتصير الآية كأنه تعالى قال : لا ينال الإمامة الظالمين، وكل عاص فإنه ظالم لنفسه ، فكانت الآية دالة على ما قلناه ، فإن قيل: ظاهر الآية يقتضي انتفاء كونهم ظالمين ظاهراً وباطناً ولا يصح ذلك في الأئمة والقضاة ، قلنا:أما الشيعة فيستدلون بهذه الآية على صحة قولهم في وجوب العصمة ظاهراً وباطناً ، وأما نحن فنقول: مقتضى الآية ذلك ، إلا أنا تركنا اعتبار الباطن فتبقى العدالة الظاهرة معتبرة ، فإن قيل: أليس أن يونس عليه السلام قال:﴿سبحانك إني كنت من الظالمين﴾ [الأنبياء: ٨٧] وقال آدم:﴿ربنا ظلمنا أنفسنا﴾ [الأعراف:٢٣]قلنا: المذكور في الآية هو الظلم المطلق ، وهذا غير موجود في آدم ويونس عليهما السلام . الوجه

الثاني : أن العهد قد يستعمل في كتاب الله بمعنى الأمر ، قال الله تعالىٰ : ﴿ألم أعهد إليكم يا بني آدم أن لا تعبدوا الشيطان﴾ [يس: ٦٠] يعني ألم آمركم بهذا ، وقال الله تعالىٰ : ﴿قالوا إن الله عهد إلينا﴾ [آل عمران: ١٨٣] يعني أمرنا ، ومنه عهود الخلفاء إلى أمرائهم وقضاتهم إذا ثبت أن عهد الله هو أمره فنقول : لا يخلو قوله : ﴿لا ينال عهدي الظالمين﴾ من أن يريد أن الظالمين غير مامورين، وأن الظالمين لا يجوز أن يكونوا بمحل من يقبل منهم أوامر الله تعالىٰ ، ولما بطل الوجه الأوّل لا تفاق المسلمين على أن أوامر الله تعالىٰ لازمة للظالمين كلزومها لغيرهم ثبت الوجه الآخر ، وهو أنهم غير مؤتمنين على أوامر الله تعالىٰ وغير مقتدى بهم فيها فلا يكونون أئمة في الدين ، فثبت بدلالة الآية بطلان إمامة الفاسق ، قال عليه السلام : "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق" ودل أيضاً على أن الفاسق لا يكون حاكماً ، وأن أحكامه لا تنفذ إذا ولي الحكم ، وكذلك لا تقبل شهادته ولا خبره عن النبي ﷺ ، ولا فتياه إذا أفتى ، ولا يقدم للصلاة وإن كان هو بحيث لو اقتدي به فإنه لا تفسد صلاته ، قال أبو بكر الرازي : ومن الناس من يظن أن مذهب أبي حنيفة أنه يجوز كون الفاسق إماماً وخليفةً ، ولا يجوز كون الفاسق قاضياً ، قال : وهذا خطأ ، ولم يفرق أبو حنيفة بين الخليفة والحاكم في أن شرط كل واحد منهما العدالة ، وكيف يكون خليفة وروايته غير مقبولة ، وأحكامه غير نافذة ، وكيف يجوز أن يدعي ذلك على أبي حنيفة وقد أكرهه ابن هبيرة في أيام بني أمية على القضاء ، وضربه فامتنع من ذلك فحبس ، فلح ابن هبيرة وجعل يضربه كل يوم أسواطاً ، فلما خيف عليه ، قال له الفقهاء : تول له شيئاً من عمله أي شيء كان حتى يزول عنك الضرب ، فتولى له عد أحمال التبن التي تدخل فخلاه ، ثم دعاه المنصور إلى مثل ذلك حتى عد له اللبن الذي كان يضرب لسور مدينة المنصور إلى مثل ذلك وقصته في أمر زيد بن علي مشهورة ، وفي حمله المال إليه وفتياه الناس سراً في وجوب نصرته والقتال معه ، وكذلك أمره مع محمد وإبراهيم ابني عبد الله بن الحسن ، ثم قال : وإنما غلط من غلط في هذه الرواية أن

قول أبي حنيفة : أن القاضي إذا كان عدلاً في نفسه ، وتولى القضاء من إمام جائر فإن أحكامه نافذة ، والصلاة خلفه جائزة ، لأن القاضي إذا كان عدلا في نفسه ويمكنه تنفيذ الأحكام كانت أحكامه نافذة ، فلا اعتبار في ذلك بمن ولاه ، لأن الذي ولاه بمنزلة سائر اعوانه ، وليس شرط اعوان القاضي أن يكون عدولا الا ترى أن أهل بلد لا سلطان عليهم لو اجتمعوا على الرضا بتولية رجل عدل منهم القضاء حتى يكونوا أعوانا له على من امتنع من قبول أحكامه لكان قضاؤه نافذاً وأن لم يكن له ولاية من جهة إمام ولا سلطان والله اعلم .

المسألة السادسة : الآية تدل على عصمة الأنبياء من وجهين .
الأول: أنه قد ثبت أن المراد من هذا العهد : الإمامة . ولا شك أن كل نبي إمام ، فإن الإمام هو الذي يؤتم به ، والنبي أولى الناس، وإذا دلت الآية على أن الإمام لا يكون فاسقاً ، فبأن تدل على أن الرسول لا يجوز أن يكون فاسقاً فاعلاً للذنب والمعصية أولى . الثاني : قال : ﴿ لاينال عهدي الظالمين﴾ فهذا العهد إن كان هو النبوة ؛ وجب أن تكون لاينالها أحد من الظالمين وإن كان هو الإمامة ، فكذلك لأن كل نبي لابد وأن يكون إماماً يؤتم به ، وكل فاسق ظالم لنفسه فوجب أن لا تحصل النبوة لأحد من الفاسقين والله أعلم.

(مزید بحث، بحث سابقہ کتاب میں ملاحظہ فرمائیے۔ موضوع سے خارج سمجھ کر ہم نے ترک کر دیا ہے)

تفسیر ابن کثیر: (ص ۲۱۷-۲۲۲ ج ۱)

﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمت فأتمهن قال إني جاعلك للناس إماماً قال ومن ذريتي قال لا ينال عهدي الظالمين﴾

يقول تعالىٰ منبهاً على شرف إبراهيم خليله عليه السلام وأن الله تعالىٰ جعله إماماً للناس يقتدى به في التوحيد حين قام بما كلفه الله تعالىٰ به من الأوامر والنواهي ولهذا قال: ﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمت﴾ أي : اذكر يامحمد لهؤلاء المشركين وأهل الكتابين الذين ينتحلون ملة إبراهيم وليسوا عليها وإنما الذي هو عليها مستقيم فأنت والذين معك

من المؤمنين ، اذكر لهؤلاء ابتلاء الله إبراهيم أي : اختباره له بما كلفه به من لأوامر والنواهي﴿ فأتمهن ﴾ أي : قام بهن كلهن كما قال تعالى: ﴿وإبرهيم الذي وفى﴾ أي : وفى جميع ماشرع له فعمل به صلوت الله عليه وقال تعا لى:﴿ إن إبرهيم كان أمة قانتا لله حنيفا ولم يك من المشر كين . شاكرا لأنعمه اجتباه وهداه إلى صراط مستقيم . وأ تيناه في الدنيا حسنة وإنه في الا آخرة لمن الصالحين . ثم اوحينا إ ليك ان ا تبع ملة ابرا هيم حنيفاً وما كان من المشر كين﴾ وقال تعا لي :﴿ قل إنني هداني ربي إلى صراط مستقيم . ديناً قيماً ملة إبراهيم حنيفا وما كان من المشر كين﴾ وقال تعالى:﴿ ماكان إبراهيم يهو دياً ولانصرانياً ولكن كان حنيفاً مسلماً وماكان من المشر كين . إن اولى الناس با برهيم للذين اتبعوه وهذالنبي والذين آمنوا والله ولي المؤمنين ﴾ ، قوله تعا لى :﴿ بكلمات﴾ أي : بشرائع وأوامرونواه ، فإ ن الكلمات تطلق ، ويراد بها الكلمات القد رية كقوله تعا لى عن مريم عليها السلام : ﴿وصد قت بكلمات ربها وكتبه وكانت من القانتين﴾ وتطلق ، يراد بها الشرعية ، كقوله تعا لى :﴿وتمت كلمت ربك صدقاً وعدلاً ﴾ أي : كلما ته الشرعية ، وهي إما خبر صدق، وإماطلب عدل إن كان أمراً أونهياً ، ومن ذلك هذه الآية الكريمة: ﴿وإذابتلى إبرهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾،أي : قام بهن قال: ﴿ إني جاعلك للناس إماما ﴾ أي :جزاء علي مافعل، كما قام بالأوامر وترك الزواجر جعله الله للناس قدوة ، وإماماً يقتدى به ويحتذى حذ وه !

وقد اختلف في تعيين الكلمات التي اختبرالله بها إبرهيم الخليل عليه السلام ، فروي عن ابن عباس في ذلك روايات ، فقال عبد الرزاق ، عن معمر عن قتادة قال ابن عباس : ابتلاه الله بالمناسك ، وكذارواه أبوإسحاق السبيعي عن التميمي عن ابن عباس : وقال عبدالرزاق أيضا، أخبرنامعمر عن ابن طاوس عن أبيه عن ابن عباس ﴿وإذابتلى إبراهيم ربه بكلمات﴾ ، قال: ابتلاه بالطهارة خمس في الرأس وخمس في الجسد ، في الرأس قص الشارب والمضمضة والاستنشاق والسواك وفوق الرأس، وفي الجسد تقليم الأظفار وحلق العانة والختان ونتف الإ بط وغسل

أثر الغائط والبول بالماء ، قال ابن أبي حاتم : وروي عن سعيد ابن المسيب ومجاهد والشعبي والنخعي ، وأبي صالح وأبي الجلد نحو ذلك. (قلت): وقريب من هذا ما ثبت في صحيح مسلم عن عائشة رضي الله عنها ، قالت : قال رسول الله ﷺ: " عشر من الفطرة : قص الشارب وإعفاء اللحية والسواك واستنشاق الماء وقص الأظفار وغسل البراجم ونتف الإبط وحلق العانة وانتقاص الماء ، ونسيت العاشرة إلا أن تكون المضمضة ! قال وكيع : انتقاص الماء يعني الاستنجاء ، وفي الصحيحين عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال:" الفطرة خمس: الختانان والاستحداد وقص الشارب وتقليم الأظفار ونتف الإبط"،ولفظ لمسلم. وقال ابن أبي حاتم : أنبأنا يونس بن عبد الأعلى قراءة ، أخبرنا ابن وهب، أخبرني ابن لهيعة عن ابن هبيرة عن حنش بن عبدالله الصنعاني عن ابن عباس أنه كان يقول في تفسير هذه الآية: ﴿وإذابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾ قال: عشر ست في الإنسان وأربع في المشاعر، فأما التي في الإنسان حلق العانة، ونتف الإبط والختان ، وكان ابن هبيرة يقول : هؤلاء الثلاثة واحدة ، وتقليم الأظفار ، وقص الشارب والسواك وغسل يوم الجمعة ، والأربعة التي في المشاعر: والطواف والسعي بين الصفا والمروة رمي الجمار والإفاضة . وقال داود بن أبي هند عن عكرمة عن ابن عباس أنه قال: ماابتلي بهذا الدين أحد فقام كله إلا إبراهيم ، قال الله تعالى: ﴿وإذابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾ قلت له: وما الكلمات التي ابتلى الله إبراهيم بهن فأتمهن ؟ قال : الإسلام ثلاثون سهماً منها عشر آيات في براءة ﴿التائبون العابدون﴾ إلى آخر الآية ، وعشر آيات في اول سورة: ﴿قدأفلح المؤمنون﴾ و﴿سأل سائل بعذاب واقع﴾ وعشر آيات في الأحزاب:﴿إن المسلمين والمسلمات﴾ إلى آخر الآية فأتمهن كلهن فكتبت له في براءة ، قال الله :﴿وإبراهيم الذي وفى﴾ وهكذا رواه الحاكم وأبو جعفربن جرير وأبومحمد بن أبي حاتم بأسانيدهم إلى داود بن أبي هند وهذالفظ بن أبي حاتم ، وقال محمد بن إسحاق عن محمد بن أبي محمدعن سعيد أوعكرمة عن ابن عباس قال: الكلمات التي ابتلى الله

بهن إبراهيم فأتمهن ، فراق قومه في الله حين أمر بمفارقتهم ، ومحاجته نمروذ في الله حين وقفه على ما وقفه عليه من خطر الأمر الذي فيه خلافه ، وصبره على قذفه إياه في النار ليحرقوه في الله على هول ذلك من أمرهم، والهجرة بعد ذلك من وطنه و بلاده في الله حين أمره بالخروج عنهم وماأمره به من الضيافة والصبر عليها بنفسه وماله ، وماابتلي به من ذبح ابنه حين أمره بذبحه فلما مضى على ذلك من الله كله وأخلصه للبلاء ، قال الله له: ﴿أسلم قال أسلمت لرب العالمين﴾ على ما كان من خلاف الناس وفراقهم .

وقال ابن أبي حاتم: أخبرنا أبو سعيد الأشج أخبرنا إسماعيل بن علية عن أبي رجاء عن الحسن ، يعني البصري ﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾ قال ابتلاه بالكوكب فرضي عنه ، وابتلاه بالقمر فرضي عنه ، وابتلاه بالشمس فرضي عنه ، وابتلاه بالهجرة فرضي عنه ، وابتلاه بالختان فرضي عنه ، وابتلاه با بنه فرضي عنه . وقال ابن جرير : أخبرنا بشر بن معاذ أخبرنا يزيد بن زريع، أخبرنا سعيد عن قتادة قال : كان الحسن يقول: أي والله لقد ابتلاه بأمر فصبر عليه ، ابتلاه بالكوكب والشمس والقمر، فأحسن في ذلك وعرف أن ربه دائم لايزول ، فوجه وجهه للذي فطر السموات والأرض حنيفاً ، وماكان من المشركين ، ثم ابتلاه بالهجرة ، فخرج من بلاده وقومه ، حتى لحق بالشام مهاجراً إلى الله ، ثم ابتلاه بالنار قبل الهجرة ، فصبر على ذلك ، وابتلاه بذبح ابنه والختان ، فصبر على ذلك ، وقال عبدالرزاق:أخبرنا معمر عمن سمع الحسن يقول في قوله :﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾، قال ابتلاه الله بذبح ولده وبالنار والكوكب والشمس والقمر ، وقال بن أبوجعفر بن جرير :أخبرنا إبن بشار أخبرنا مسلم بن قتيبة،أخبرنا أبو هلال عن الحسن ﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾ ، قال : ابتلاه بالكوكب والشمس والقمر، فوجده صابراً، وقال العوفي في تفسيره عن ابن عباس:﴿وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن ﴾ فمنهن ﴿قال إني جاعلك للناس إماما ﴾ ومنهن ﴿وإذ يرفع ابراهيم القواعد من البيت وإسماعيل﴾ ومنهن الأيات في شأن المنسك والمقام الذي جعل لأبراهيم والرزق الذي رزق ساكنوا

البيت ، و محمد بعث في ديتهما .وقال ابن أبي حاتم : أخبرنا الحسن بن محمد بن الصباح ، أخبرنا شبابة عن ورقاء عن ابن أبي نجيح عن مجاهد، في قوله تعالى ﴿وإذابتلي إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾ قال الله لإبراهيم : إني مبتليک بأمر فماهو؟ قال:تجعلني للناس إماماً؟ قال: نعم، قال: ومن ذريتي ؟قال:﴿لاينال عهدي الظالمين ﴾،قال: تجعل البيت مثابة للناس؟ قال :نعم ، قال: وأمنا ؟ قال:نعم،قال :وتجعلنا مسلمين لک ومن ذريتنا أمة مسلمة لک ؟ قال : نعم ، قال : وأمناً ؟ قال نعم ، قال: وتجعلنا مسلمين لک ومن ذريتنا أمة مسلمة لک ؟ قال : نعم ؟ وترزق أهله من الثمرات من آمن منهم با لله ؟ قال : نعم ، قال ابن نجيح : سمعته عن عكرمة فعرضته على مجاهد فلم ينكره ، وهكذارواه ابن جرير من غير وجه عن ابن أبي نجيح عن مجاهد ، وقال سفيان الثوري عن ابن أبي نجيح عن مجاهد ، ﴿وإذابتلي إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن﴾ قال: ابتلي بالآيات التي بعدها﴿إني جاعلک للناس إماماً قال ومن ذريتي قال لاينال عهدي الظالمين﴾ وقال : أبوجعفرالرازي عن الربيع بن انس: ﴿وإذابتلي إبراهيم ربه بكلمات﴾قال:الكلمات﴿ إني جاعلک للناس إماما ﴾ و قوله : ﴿وإذجعلنا البيت مثابة للناس و أمناً ﴾ وقوله : ﴿واتخذوامن مقام إبراهيم مصلى﴾وقوله :﴿وعهدناإلي إبراهيم وإسماعيل ﴾ الآية ، و قوله : ﴿وإذيرفع إبراهيم القواعد من البيت وإسماعيل﴾،الآية قال: فذلک كله من الكلمات التي ابتلي بهن إبراهيم ، وقال السدي : الكلمات التي ابتلي بهن إبراهيم ربه : ﴿ربنا تقبل منا إنک أنت السميع العليم﴾ ربنا وجعلنا مسلمين لک ومن ذريتنا أمة مسلمة لک﴾﴿ربنا وابعث فيهم رسولاً منهم﴾ وقال القرطبي : وفي الموطا وغيره ، عن يحيي بن سعيد أنه سمع سعيد بن المسيب يقول : إبراهيم عليه السلام أول من اختتن وأول من ضاف الضيف ، وأول من قلم أظفاره، وأول من قص الشارب ، وأول من شاب فلمارأى الشيب، قال:ماهذا؟ قال:وقار، قال:يارب زدني وقاراً، وأذكرابن أبي شيبة عن سعد بن إبراهيم عن أبيه قال :أول من خطب على المنابر إبراهيم عليه السلام ، قال غيره : وأول من برّد البريد وأول من

ضرب بالسيف ، وأول من استاک، وأول من استجى بالماء، وأول من لبس السراويل، وروى عن معاذبن جبل قال: قال رسول الله ﷺ : "إن اتخذ المنبر فقد اتخذه أبى إبراهيم ، وإن إتخذ العصا فقد إتخذها أبى إبراهيم"(قلت:)هذ احديث لايثبت ، والله اعلم . ثم شرع القرطبي يتكلم على مايتعلق به الأشياء من الأحكام الشرعية.

قال أبو جعفر بن جرير ما حاصله : أنه يجوز أن يكون المراد بالكلمات جميع ما ذكر وجائز أن يكون بعض ذلک ولا يجوز الجزم بشيء منها أنه مراد على التعيين إلا بحديث أو إجماع ، قال : ولم يصح في ذلک خبر بنقل الواحد ولا بنقل الجماعة الذي يجب التسليم له . قال: غير أنه قد روي عن النبي ﷺ في نظير معنى ذلک خبران أحد هما ما حدثنا به أبو كريب أخبرنا رشد ين بن سعد حد ثني زبان بن فائد عن سهل بن معاذ بن انس قال :كان النبي ﷺ يقول : "ألا أخبر كم لم سمى الله إبراهيم خليله ، الذي وفي؟ لأنه كان يقول كلما أصبح وكلما أمسى: ﴿سبحان الله حين تمسون وحين تصبحون ﴾ ﴿وله الحمد في السموات والأرض وعشياً وحين تظهرون﴾إلى آخر الآية : قال : والآخر منهما : ما حدثنا به أبو كريب ، أخبرنا الحسن عن عطية ، أخبرنا إسرائيل عن جعفر بن الزبير عن القاسم عن أبي أمامة قال: قال رسول الله ﷺ: ﴿وإبراهيم الذي وفى﴾ قال :"أتدرون ما وفي؟ "قالوا:الله ورسوله أعلم. قال: "وفى عمل يومه أربع ركعات في النهار " ورواه آدم في تفسيره عن حماد بن سلمة وعبد بن حميد عن يونس بن محمد عن حماد بن سلمة عن جعفر بن الزبيربه ، ثم شرع ابن جرير يضعف هذين الحديثين.وهو كما قال: فإنه لايجوز روايتهما إلا ببيان ضعفهما ، وضعفهما من وجوه عديدة ، فإن كلاً من السند ين مشتمل على غير واحد من الضعفاء مع ما في متن الحديث مما يدل على ضعفه ، والله أعلم . ثم قال ابن جرير : ولو قال قائل: إن الذي قاله مجاهد وأبو صالح والربيع بن انس أولىٰ بالصواب من القول الذي قاله غيرهم كان مذهباً لأن قوله :﴿إني جاعلک للناس إماما﴾ وقوله: ﴿وعهدنا إلى إبراهيم واسماعيل أن طهرا بيتي للطائفين﴾ الآية ، وسائر

الآيات التي هي نظير ذلک کالبيا ن عن الکلمات التي ذکر الله أنه ابتلی بهن إبراهيم، (قلت): والذي قاله أولاً من أن الکلمات تشمل جميع ما ذکر أقوی من هذالذي جوزه من قول مجاهد ومن قاله مثله لأن السياق يعطي غير ما قالوه، والله أعلم.

وقوله قال: ﴿ومن ذريتي﴾قال:﴿لا ينال عهدي الظا لمين﴾ لما جعل الله إبراهيم إماماً سأل الله أن تکون الأئمة من بعده من ذريته فأجيب إلی ذلک وأخبر أنه سيکون من ذريته ظالمون وأنه لا ينالهم عهد الله و لايکونون أئمة فلا يقتدی بهم، والدليل علی أنه أجيب إلی طلبته قوله تعالی في سورة العنکبوت:﴿وجعلنا في ذريته النبوة والکتاب﴾ فکل نبي أرسله الله، وکل کتاب أنزله الله بعد إبراهيم ففي ذريته صلوات الله وسلامه عليه، وأما قوله تعالی:﴿قال لا ينال عهدي الظالمين﴾ فقد اختلفوا في ذلک .فقال خصيف عن مجاهد ﴿قال لا ينال عهدی الظالمين﴾ قال: إنه سيکون في ذريتک ظالمون، وقال ابن أبي نجيح عن مجاهد ﴿قال لاينال عهدي الظالمين﴾قال:لا يکون لی إمام ظالم، وفي رواية: لا أجعل إماماً ظالماً يقتدي به . وقال سفيان عن منصورعن مجاهد في قوله تعالی: ﴿قال لا ينال عهدي الظالمين﴾ قال : لا يکون إمام ظالم يقتدی به . وقال ابن أبی حاتم أخبرنا أبی أخبرنا مالک بن إسماعيل أخبرنا شريک عن منصور عن مجاهد في قوله: ﴿ومن ذريتي﴾ قال أما من کان منهم صالحاً فأجعله إماماً يقتدي به، وأمامن کان ظالماً فلا ولانعمة عين . وقال سعيد بن جبير﴿لاينال عهد ي الظالمين﴾ المراد به المشرک لايکون إمام ظالم، يقول لايکون إمام مشرک، وقال ابن جريج عن عطاء قال:﴿إني جاعلک للناس إماماً﴾ قال ومن ذريتي فأبی أن يجعل من ذريته إماماً ظالماً، قلت لعطاء ما عهده؟ قال أمره وقال ابن أبي حاتم أخبرنا عمر وبن ثورالقيساري فيما کتب إلي أخبرنا الفريابي حدثنا إسماعيل حدثنا سماک بن حرب عن عکرمة عن ابن عباس، قال: قال الله لإبراهيم إني جاعلک للناس إماماً قال ومن ذريتي فأبی أن يفعل ثم قال﴿لاينال عهدي‌الظالمين﴾ وقال محمد ابن إسحاق عن محمد بن أبي محمد عن سعيد أوعکرمة عن ابن عباس ﴿ قا ل ومن ذريتي قال لاينال

عهدي الظالمين﴾ يخبره أنه كائن في ذريته ظالم لاينال عهده ولاينبغي أن يوليه شيئاً من أمره وإن كان من ذرية خليله ، ومحسن ستنفذ فيه دعوته وتبلغ له فيه ماأراد من مسألته . وقال العوفي عن ابن عباس ﴿لاينال عهدي الظالمين﴾ قال يعني: لاعهد لظالم عليک في ظلمه أن تطيعه فيه، وقال ابن جرير حدثنا إسحاق أخبرنا عبدالرحمن بن عبدالله عن إسرائيل عن مسلم الأعور عن مجاهد عن ابن عباس قال ﴿لاينال عهدي الظالمين﴾ قال ليس للظالمين عهد وإن عاهدته أنقضه وروي عن مجاهد وعطاء ومقاتل بن حيان نحو ذلک ، وقال الثوري عن هارون بن عنترة عن أبيه قال ليس لظالم عهد ، وقال عبدالرزاق أخبرنا معمر عن قتادة في قوله: ﴿لا ينال عهدي الظالمين﴾ قال لاينال عهد الله في الآخرة الظالمين فأمافي الدنيا فقد ناله الظا لم فآمن به وأكل وعاش، وكذا قال إبراهيم النخعي وعطاء والحسن و عكرمة ، وقال الربيع بن أنس عهد الله الذي عهد إلى عباده دينه يقول لاينال دينه الظالمين ، ألا ترى أنه قال: ﴿وباركنا عليه وعلى إسحاق ومن ذريتهما محسن وظالم لنفسه مبين﴾ يقول ليس كل ذريتک ياإبراهيم على الحق ، وكذا روي عن أبي العالية وعطاء ومقاتل بن حيان وقال جويبر عن الضحاک لاينال طاعتي عدوّلي يعصيني ولاأنحلها إلاوليا يطيعني. وقال الحافظ أبوبكر بن مردوية: أخبرنا عبد الرحمن بن محمد بن حامد أخبرنا أحمد بن عبدالله بن سعيد الأسدي ، حدثنا سليم بن سعيد الدامغاني، أخبرنا وكيع عن الأعمش عن سعيد بن عبيدة عن أبي عبدالرحمن السلمي عن علي بن أبي طالب عن النبي ﷺ قال: ﴿ لاينال عهدي الظالمين ﴾ قال لاطاعة إلافي المعروف ، وقال السدي: ﴿لاينال عهدي الظالمين﴾ يقول عهدي نبوتي. فهذه أقوال مفسري السلف في هذه الآية ، على مانقله ابن جرير وابن أبي حاتم رحمهما الله تعالى واختار ابن جرير أن هذه الآية وإن كانت ظاهرة فالخبر ، أنه لاينال عهد الله بالإمامة ظالما ، ففيها إعلام من الله لإبراهيم الخليل عليه السلام ، أنه سيوجد من ذريتک من هو ظالم لنفسه كماتقدم مجاهد وغيره. والله أعلم . وقال ابن خويز منداد المالكي: الظالم لايصلح أن يكون خليفة ولاحاكماً ولامفتيا ولاشاهدا ولاراويا.

آیت:(۴)

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْآ اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْھَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ

(آل عمران ۸۱)

ترجمہ: اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم، پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتاوے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا۔ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں

خلاصہ:

جملہ مفسرین نے اس آیت کا مصداق حضور پاک ﷺ کو ٹھہرایا ہے کہ آپ ﷺ کے متعلق تمام انبیاء سے عہد لیا گیا کہ اگر وہ آپ کا زمانہ پائیں تو خود بھی ایمان لائیں اور اپنی امت کو بھی ایمان لانے کی ہدایت کریں۔ جیسا کہ یہی تفسیر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

چنانچہ اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے لیکن آپ ﷺ نے اپنی امت کو اپنے بعد پیدا ہونے والے کسی نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی کبھی ہدایت نہیں فرمائی۔ مگر حضور ﷺ کی محبت کے نام پر قادیانی کس طرح آپ ﷺ پر حملہ کرتے ہیں اور امکان کا سہارا لیکر کس طرح یہ فضیلت مرزا قادیانی کو دینا چاہتے ہیں ملاحظہ ہو۔

قادیانی استدلال:۔

۔جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جب تمکو کتاب اور حکمت دیکر بھیجا جائے اور تمہارے پاس ہمارا رسول آئے تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی امداد

کرنا...... اب سوال یہ ہے کہ کیا آنحضرت ﷺ سے بھی یہ عہد لیا گیا یا نہیں۔ قرآن مجید میں ہے "وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَھُمْ وَمِنْکَ وَمِنْ نُّوْحٍ (احزاب ۷)۔ جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا تو آپ سے بھی لیا۔

اگر آپ کے بعد نبوت بند تھی تو آنحضرت ﷺ سے یہ عہد نہیں لینا چاہئے تھا مگر آپ سے بھی اس عہد کا لینا امکان نبوت کی دلیل ہے۔ (۲۶۷ تبلیغی پاکٹ بک)

جواب نمبر ۱۔

ہر دو آیات میں جس چیز کا خدا تعالیٰ انبیاء سے وعدہ لے رہے ہیں وہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ پہلی آیت میں تو ایک بہت عظیم الشان نبی کی تصدیق کا وعدہ لیا جا رہا ہے جو آیت بتلا رہی ہے کہ وہ نبی اعلیٰ منصب رکھتا ہوگا۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ انبیاء کرام سے تاکیدی طور پر اس پر ایمان لانے کا وعدہ لے رہے ہیں۔ اور جس کی امداد کے لئے سخت تاکید فرمائی جارہی ہے۔ وہ تو آنحضرت ﷺ ہی ہو سکتے ہیں۔ مرزا قادیانی جیسے دجال کو اس میثاق و وعدہ کا مصداق ٹھہرانا جس قدر بعید از عقل و نقل ہے اس قدر دنیا میں اور کوئی ظلم ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر خود مرزا قادیانی بھی اس ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ سے مراد آنحضرت ﷺ کو سمجھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "اور یاد کر جب خدا نے تمام رسولوں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت دوں گا۔ اور پھر تمہارے پاس آخری زمانہ میں میرا رسول آئیگا جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرے گا۔ تمہیں اس پر ایمان لانا ہوگا۔ اور اس کی مدد کرنی ہوگی...... اب ظاہر ہے کہ انبیاء تو اپنے اپنے وقت پر فوت ہو گئے تھے یہ حکم ہر نبی کی امت کے لئے ہے کہ جب وہ رسول ظاہر ہو تو اس پر ایمان لاؤ ورنہ مواخذہ ہوگا۔...... بتلا دیں میاں عبدالحکیم...... خدا تعالیٰ ایسے لوگوں سے کیوں مواخذہ کریگا جو گو آنحضرت ﷺ پر ایمان نہیں لاتے مگر توحید باری کے قائل ہیں۔ (حقیقت الوحی ص ۱۳۱،۱۳۲ خزائن ص ۱۳۳،۱۳۴ ج ۲۲)

جب مرزا قادیانی نے اس کا مصداق رحمت دو عالم ﷺ کی ذات اقدس کو قرار دیا اور مرزائیوں کی لن ترانی کو مرزا نے درخور اعتنا نہیں سمجھا تو پھر ہم مرزائیوں کو کیوں گھاس ڈالیں؟۔

دوسری آیت میں تبلیغ واشاعت احکامات الٰہیہ پر وعدہ لئے جانے کا تذکرہ ہے۔

۲۔ ثم جاء کم، کے الفاظ غور طلب ہیں۔ ان میں نبی کریم ﷺ کا تمام انبیاء کرام کے بعد تشریف لانے کو ثم کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ جو لغت عرب میں تراخی کیلئے آتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ جاء نی القوم ثم عمر' تو لغت عرب میں اس کا یہی مفہوم ومعنی سمجھا جاتا ہے کہ پہلے تمام قوم آگئی پھر کچھ تراخی یعنی مہلت کے بعد سب کے آخر میں عمر آیا۔ لہذا ثُمَّ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ کے یہ معنی ہونگے کہ تمام انبیاء کے آنے کے بعد سب سے آخر میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے۔ یہ تو ختم نبوت کی دلیل ہوئی اور قادیانیت کیلئے نشتر جان!

۳۔ تمام مفسرین کرام نے "ثُمَّ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ" سے مراد رحمت دو عالم ﷺ کو لیا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر اور جامع البیان میں حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے اس کی تفسیر یہ منقول ہے۔

"مابعث الله نبیا من الانبیاء الا اخذ علیه المیثاق لئن بعث الله محمداوھو حی لیؤ منن به ولینصرنه وآمره ان یاخذ المیثاق علی امة لئن بعث محمد وھم احیاء لیؤ منن به ولینصرنه"

(ابن کثیر ص ۳۷۶ ، جامع البیان ص ۵۵)

الله رب العزت نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا اس سے یہ عہد لیا کہ اگر تمہاری زندگی میں اللہ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث کیا تو ان پر ضرور ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر اس نبی کو (جسے مبعوث کیا) حکم دیا کہ آپ اپنی امت سے پختہ عہد لیں کہ اگر اس امت کے ہوتے ہوئے وہ نبی (آخرالزماں) تشریف لائیں تو وہ امت ضرور ان پر ایمان لائے۔ اور ان کی نصرت کرے۔

رسول کا لفظ نکرہ تھا مگر حضرت علیؓ وابن عباسؓ نے اس کی تخصیص کر کے اس سے انکار کی گنجائش باقی نہ چھوڑی۔

۴۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً . هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً . لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ . قَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَسُوْلاً .

ان آیات میں بھی رسول نکرہ ہے۔ اگر ان کی تخصیص کر کے ان کا مصداق محمد عربی ﷺ کو لیا جاتا ہے تو "جاء کم رسول" میں کیوں نہیں لیا جاتا؟

مغالطہ:۔

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ فحاصل الکلام انه تعالیٰ اوجب علی جمیع الانبیاء الایمان بکل رسول جاء مصدقاً لما معهم (تفسیر کبیر جلد ۸ص ۲۶، نچلی طرف سے آٹھویں سطر مطبوعہ مصر) یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر یہ بات واجب کر دی کہ وہ ہر اس رسول پر ایمان لائیں جو ان کی اپنی نبوت کا مصدق ہو۔ (تبلیغی پاکٹ بک ۲۶۷)

جواب:۔ مرزائی وکیل کو نیچے سے اوپر کی آٹھویں سطر تو نظر آئی، مگر آٹھویں سطر سے نیچے کی عبارت نظر نہ آئی اور نہ ہی اس آیت کی پہلی سطر نظر آئی۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ،

ناظرین کرام! امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں پہلی سطر سے لیکر اخیر تک اس آیت کا مصداق محمد ﷺ کو ہی گردانا ہے۔ مگر مرزئیوں کی ڈھٹائی دیکھئے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی آنکھ میں دھول جھونک رہے ہیں۔ سچ ہے "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد" امام صاحبؒ نے اس سلسلہ میں دو قول بیان کئے ہیں پہلا یہ کہ یہ عہد ہر نبی سے دوسرے نبی کے بارے میں لیا گیا ہے یعنی یہ کہ بعض بعض کی تصدیق کرے اور اس سلسلہ میں جو دلائل ذکر کئے ہیں اس میں سے تیسری دلیل یہ ہے۔

الحجة الثالثة: ما نقل عن علي رضي الله عنه أنه قال: ان الله تعالى ما بعث آدم ومن بعده من الأنبياء عليهم الصلاة والسلام الا أخذ عليه العهد لئن بعث محمد عليه الصلاة والسلام وهو حي ليؤمنن به ولينصرنه،

کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے محمد ﷺ کے بارے میں یہ عہد لیا ہے کہ اگر ان کی اپنی زندگی میں محمد ﷺ مبعوث ہوں تو اُن پر ایمان لائیں۔

اور دوسرا احتمال امام رازی نے یہ ذکر کیا ہے کہ انبیاء نے یہ عہد اپنے امتیوں سے لیا ہے کہ جب محمد ﷺ مبعوث ہوں تو اُن پر ایمان لائیں۔ اور اس احتمال کو کثیر علماء کا قول بتا کر چار دلیلیں ذکر کی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

الاحتمال الثاني: ان المراد من الآية ان الأنبياء عليهم الصلاة والسلام كانوا يأخذون الميثاق من امهم بانه اذا بعث محمد ﷺ فانه يجب عليهم أن يؤمنوا به وأن ينصروه، وهذا قول كثير من العلماء، وقد بينا ان اللفظ محتمل له وقد احتجوا على صحته بوجوه.

معلوم ہوا مرزائی پنڈت نے اپنے نبی کی طرح جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے کی قسم کھا رکھی ہے یہی شیطانی روش ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے: ''لاغوینهم اجمعین'' بہرکیف امام رازی کی تفسیر آپ تفصیل سے آخیر میں ملاحظہ فرمالیں

کیا فرماتے ہیں مفسرین

معارف القرآن۔ (ج ۴ ص ۹۷)

بیان القرآن:۔

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا (حضرات) انبیاء (علیہم السلام) سے کہ جو کچھ تم کو کتاب اور علم (شریعت) دوں (اور) پھر تمہارے پاس کوئی (اور) پیغمبر آوے جو مصداق (اور موافق) ہو اس (علامت) کا جو تمہارے پاس (کی کتاب اور شریعت میں) ہے (یعنی دلائل معتبرہ عندالشرع سے اس کی رسالت ثابت ہو) تو تم ضرور اس رسول (کی رسالت) پر (دل سے) اعتقاد بھی لانا اور (ہاتھ پاؤں سے) اس کی مدد بھی کرنا (پھر یہ عہد بیان کر کے ارشاد) فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور لیا اس (مضمون) پر میرا عہد (اور حکم قبول کیا) وہ بولے کہ ہم نے اقرار کیا، ارشاد فرمایا تو (اپنے اس اقرار پر) گواہ بھی رہنا (کیوں کہ گواہی سے پھرنے کو ہر شخص ہر حال میں برا سمجھتا ہے، بخلاف اقرار کرنے والے کے کہ بوجہ صاحب غرض ہونے کے اس کا پھر جانا زیادہ مستبعد نہیں ہوتا، اسی طرح تم صرف اقراری نہیں بلکہ گواہ کی طرح اس پر قائم رہنا) اور میں (بھی) اس (مضمون) پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے (یعنی واقعہ کی اطلاع اور علم رکھنے والا) ہوں

معارف و مسائل:

اللہ تعالیٰ کے تین عہد:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین طرح کے عہد لئے ہیں، ایک کا ذکر سورۂ اعراف میں "الست بربکم،، کے تحت کیا گیا ہے، اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے کیونکہ مذہب کی ساری عمارت

اسی سنگ بنیاد پر ہے، جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی، اسکی مزید تفصیل انشاءاللہ اپنے مقام پر آئیگی،

دوسرے کا ذکر واذ اخذ اللّٰہ میثاق الذین اوتوا الکتٰب لتبیننہ للناس ولا تکتمونہ الخ سے کیا گیا، یہ عہد صرف اہل کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، بلکہ صاف اور واضح طور پر بیان کریں،

تیسرے عہد کا بیان واذاخذاللّٰہ میثاق النبیین لما اتیتکم من کتاب وحکمۃ سے کیا گیا ہے اسکی تفصیل آگے آئے گی (تفسیر احمدی)

میثاق سے کیا مراد ہے اور کہاں ہوا:

میثاق کہاں ہوا؟ یا تو عالم ارواح میں ہوا یا دنیا میں بذریعہ وحی ہوا، دونوں احتمال ہیں، (بیان القرآن)

میثاق کیا ہے؟ اس کی تصریح تو قرآن نے کر دی ہے، لیکن یہ میثاق کس چیز کے بارہ میں لیا گیا ہے؟ اس میں اقوال مختلف ہیں، حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نبی علیہ السلام ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ عہد تمام انبیاء سے صرف محمد ﷺ کے بارے میں لیا گیا تھا کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی تائید ونصرت کریں اور اپنی اپنی امتوں کو بھی یہی ہدایت کر جائیں،

حضرت طاؤس، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ میثاق انبیاء سے اس لئے لیا گیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی تائید ونصرت کریں (تفسیر ابن کثیر)

اس دوسرے قول کی تائید اللہ تعالیٰ کے قول "واذ اخذنا من النبین میثاقھم ومنک ومن نوح و ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ابن مریم واخذنا منھم میثاقاً غلیظاً (احزاب) سے بھی کی جاسکتی، کیونکہ یہ عہد ایک دوسرے کی تائید وتصدیق کے لئے لیا گیا تھا (تفسیر احمدی)

درحقیقت مذکورہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں ہے اس لئے دونوں ہی مراد لی جاسکتی ہیں (تفسیر ابن کثیر)

تمام انبیاء سے ایمان کے مطالبہ کا فائدہ:

بظاہر یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم وخبیر ہیں ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ محمد ﷺ کسی نبی کی موجودگی میں تشریف نہیں لائیں گے تو پھر انبیاء کے ایمان لانے کا کیا فائدہ؟

ذرا غور کیا جائے تو فائدہ بلکل ظاہر معلوم ہوگا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر محمد ﷺ کی ذات والا صفات پر ایمان قبول کرنے کا پختہ ارادہ کریں گے تو اسی وقت سے ثواب پائیں گے (صاوی بحوالہ جلالین)

حضور اکرم ﷺ کی نبوت عامہ:

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ۔الآیۃ ان آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ پختہ عہد لیا کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرا نبی آئے جو یقیناً پہلے انبیاء اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہوگا تو پہلے نبی کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے نبی کی سچائی اور نبوت پر ایمان خود بھی لائے اور دوسروں کو بھی اس کی ہدایت کرے قرآن کے اس قاعدہ کلی سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کے بارے میں بھی اسی طرح کا عہد انبیاء سے لیا ہوگا جیسا کہ علامہ سبکیؒ اپنے رسالہ "التعظیم فی لتؤ منن به ولتنصرنه" میں فرماتے ہیں کہ آیت میں رسول سے مراد محمد ﷺ ہیں اور کوئی نبی بھی ایسا نہیں گذرا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات والا صفات کے بارے میں تائید ونصرت اور آپ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد نہ لیا ہو اور کوئی بھی ایسا نبی نہیں گذرا جس نے اپنی امت کو آپ ﷺ پر ایمان لانے اور تائید ونصرت کی وصیت نہ کی ہو، اور اگر حضور اکرم ﷺ کی بعثت انبیاء کے زمانے میں ہوتی تو ان سب کے نبی آپ ﷺ ہی ہوتے اور وہ تمام انبیاء آپ ﷺ کی امت میں شمار ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی شان محض نبی الامت ہی کی نہیں ہے بلکہ نبی الانبیاء کی بھی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آپ ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں

کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا، اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونگے تو وہ بھی قرآن حکیم اور تمہارے نبی ﷺ ہی کے احکام پر عمل کریں گے (تفسیر ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی نبوت "عامہ اور شاملہ" ہے اور آپ ﷺ کی شریعت میں سابقہ تمام شریعتیں مدغم ہیں اس بیان سے آپ ﷺ کے ارشاد "بعثت الی الناس کافۃ" کا صحیح مفہوم بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھنا کہ آپ ﷺ کی نبوت آپ ﷺ کے زمانے سے قیامت تک کے لئے ہے صحیح نہیں بلکہ آپ ﷺ کی نبوت کا زمانہ اتنا وسیع ہے کہ آدم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے شروع ہوتا ہے جیسا کے ایک حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "کنت نبیاً و آدم بین الروح والجسد" محشر میں شفاعت کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا اور تمام بنی آدم کا آپ ﷺ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شب معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی امامت کرانا حضور ﷺ کی اسی سیادت عامہ اور امامت عظمیٰ کے آثار میں سے ہے

تفسیر ماجدی:

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا جو کچھ میں تمہیں کتاب وحکمت (کی قسم) سے دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول اس (چیز) کی تصدیق کرنے والا آئے جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس (رسول) پر ایمان لانا اور ضرور اسکی نصرت کرنا ۱۸۳ (پھر) فرمایا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے ہم اقرار کرتے ہیں فرمایا تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں ۱۸۴

تفسیر:۔

(یہ ایمان دل و جان سے ہو اور نصرت دست وزبان سے) اخذ اللّٰہ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ یعنی ارواح انبیاء سے عہد لیا۔ عالم ارواح میں اس ناسوتی دنیا کے وجود سے قبل۔ یہاں یہ واضح رہے کہ جو احکام انبیاء کو ملے' ان میں ان کی امتیں بدرجہ اولیٰ شامل ہیں بعض

بِكِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ۔ کتاب سے مراد کتاب آسمانی ہونا ظاہر ہے۔ حکمۃ سے مراد معرفت الٰہی بھی ہو سکتی ہے اور نبوت بھی۔ مُصَدِّقٌ۔ تصدیق ہونے سے بھی بڑھ کر یہ حالت ہے کہ وہ بعد کا آنے والا رسول خود ان پچھلی تعلیمات وہدایات کا مصداق بھی ہو۔ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ۔ عارفین صوفیا نے کہا ہے کہ شیوخ پر لازم ہے کہ ان کا جو معاصر علم وعمل میں ان سے فوق ہو بلکہ ان کا مساوی ہو اس سے دعاء کرانے میں عار نہ کریں۔ رَسُوْلٌ۔ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ ایک فرد معین کی جانب کر رہا ہے۔ اور یہ اسلوب قرآن میں عام ہے۔ الرسولُ هُنا مُحمدٌ ﷺ على قولِ عليٍّ ؓ وَابن عباسٍ ؓ وَاللفظ وَان كانَ نكرةً فالاشارةُ الىٰ مُعَيَّنٍ (قرطبی)

۸۴۔ انبیاء کی زبان سے اقرار یوں بھی اقرار صالح اور حلف مؤکد کے برابر ہے۔ اللہ کی اس گواہی نے مؤکد کو مؤکد تر کر دیا۔ اِصْرِیْ عَہْد اِصر کے لفظی معنی بوجھ کے ہیں۔ مراد عہد ہی سے ہے۔ الاصرُ فِي اللغةِ الثِقلُ فَسُمي العهدُ اِصراً لانّهُ مَنعٌ وَتشديدٌ (قرطبی)

ترجمہ کنز الایمان۔

ترجمہ: اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا (۱۵۵) جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول (۱۵۶) کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے (۱۵۷) تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا۔ فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا فرمایا ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔

تفسیر:

(۱۵۵) حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کے بعد جس کسی کو نبوت عطا فرمائی ان سے سید انبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت عہد لیا اور ان انبیاء نے اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر ان کی حیات میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں تو آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں اس سے ثابت ہوا

کہ حضور تمام انبیاء میں سب سے افضل ہیں (۱۵۶) یعنی سید عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (۱۵۷) اس طرح کہ ان کے صفات واحوال اس کے مطابق ہوں جو کتب انبیاء میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

تفسیر ثنائی:۔

ترجمہ: یاد تو کریں جب خدا نے ہر ایک نبی سے عہد لیا تھا کہ جو کتاب اور دانائی کی باتیں میں نے تم کو دی ہیں پھر جو تمہارے پاس کوئی رسول آوے جو تمہارے ساتھ والی بات کی تصدیق کرے تو اس کو ضرور مانیو۔ ور اتکی مدد کیجیو۔ کہا کیا تم اقراری ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو وہ بولے ہم اقراری ہیں کہا تم گواہ رہو اور میں خود بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

تفسیر:۔

ذرا یاد تو کریں جب خدا نے ہر ایک نبی سے عہد لیا تھا کہ جو کتاب اور دانائی کی باتیں میں نے تم کو دی ہیں ان پر عمل تو کرو پھر اگر تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری زندگی میں ہی آوے جو تمہارے ساتھ والی بات کی جو میں نے تمہیں دی ہے تصدیق کرے تو اس کو ضرور مانیو پھر مزید تاکید کے لئے خدا نے کہا کیا تم اقراری ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو یا نہیں وہ بیک زبان بولے ہم اقراری ہیں خدا نے کہا تم اس معاملہ کے تم گواہ رہو اور میں خود بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

شان نزول:۔

واذ اخذ اللہ۔ یہ آیت یہود ونصاریٰ کی مذمت در بارہ کتمان حق نازل ہوئی (معالم)

تفہیم القرآن:۔ (ص ۲۸۶ ج ۱)

ترجمہ: یاد کرو اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج ہم نے کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے' کل اگر دوسرا رسول تمہارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی ۶۹" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا" کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟" انھوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا" اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے" ۷۰

تفسیر:۔

مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے۔ اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو وہ لامحالہ اس کے پیرو پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے۔ کہ جو نبی ہماری طرف سے اس دین کی تبلیغ و اقامت کے لئے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو' اس کا تمھیں ساتھ دینا ہو گا۔ اس کے ساتھ تعصب نہ برتنا' اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا' حق کی مخالفت نہ کرنا' بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لئے اٹھایا جائے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ حضرت محمد ﷺ سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں' کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد ﷺ سے ایسا عہد لیا گیا ہو یا آپ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

۷۰۔ اس ارشاد سے مقصود اہل کتاب کو متنبہ کرنا ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ رہے ہو' محمد ﷺ کا انکار اور انکی مخالفت کر کے اس میثاق کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمہارے انبیاء سے لیا گیا تھا' لہٰذا اب تم فاسق ہو چکے ہو' یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل گئے ہو۔

جامع البیان:۔(ص۳۳۶۔۳۵۳ج۳)

يعني بذلک جلّ ثناؤه : واذكروا يا أهل الكتاب إذ أخذالله ميثاق النبيين، يعني حين أخذ الله ميثاق النبيين، وميثاقهم : ماوثقوا به على أنفسهم طاعة الله فيما أمرهم ونهاهم . وقد بينا أصل الميثاق باختلاف أهل التأويل فيه بما فيه الكفاية.﴿لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ﴾ اختلفت القراء في قراءة ذلک، فقرأته عامة قراء الحجاز والعراق: ﴿لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ﴾ بفتح اللام من ,,لما"إلا أنهم اختلفوا في قراءة آتيتكم، فقرأه بعضهم﴿آتيتكُمْ﴾ على التوحيد، و قرأه آخرون :,,آتيناكم"على الجمع.

ثم اختلف أهل العربية إذا قرىء ذلک كذلک، فقال بعض نحويي البصرة : اللام التي مع "ما" في اوّل الكلام لام الابتداء، نحو قول القائل : لزيد أفضل منک،لأن "ما"اسم،والذي بعدها صلة لها، واللام التي في:﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ لام القسم،كأنه قال : والله لتؤمنن به، يؤكد في اوّل الكلام وفي آخره،كما يقال: أما والله أن لو جئتني لكان كذا وكذا، وقد يستغني عنها فيؤكد في لتؤمنن به باللام في آخر الكلام وقد يستغني عنها، ويجعل خبر"ما آتيتكم من كتاب وحكمة""لتؤمنن به" مثل"لعبدالله والله لآتينه"قال: وإن شئت جعلت خبر"ما""من كتاب "يريد: لما آتيتكم كتاب وحكمة، وتكون"من" زائدة . وخطأ بعض نحويي الكوفيين ذلک كله، وقال: اللام التي تدخل في أوائل الجزاء لا تجاب بما ولا "لا" فلا يقال لمن قام : لا تتبعه، ولا لمن قام: ما أحسن، فإذا وقع في جوابها"ما"و"لا"علم أن اللام ليست بتوكيد للأولى، لأنه يوضع موضعها "ما"و"لا "فتكون كالأولى،وهي جواب للأولى . قال : وأما قوله : ﴿ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ﴾ بمعنى إسقاط"من"غلط، لأن "من"التي تدخل وتخرج لا تقع مواقع الأسماء، قال : ولا تقع في الخبر أيضاً، إنما تقع في الجحد والاستفهام والجزاء.

وأولى الأقوال في تأويل هذه الآية على قرأة من قرأ ذلك بفتح اللام بالصواب أن يكون قوله: ﴿لما﴾ بمعنى:لمهما، وأن تكون "ما" حرف جزاء أدخلت عليها اللام، وصير الفعل معها على فَعَلَ، ثم أجيبت بما تجاب به الأيمان،فصارت اللام الأولى يميناً إذ تلقيت بجواب اليمين.

وقرأ ذلك آخرون:"لما آتيتكم"بكسر اللام من "لما"وذلك قرأة جماعة من أهل الكوفة.

ثم اختلف قارئو ذلك كذلك في تأويله، فقال بعضهم: معناه إذا قرىء كذلك: وإذأخذالله ميثاق النبين للذي آتيتكم، فما على هذه القرأة بمعنى: الذي عند هم. وكان تأويل الكلام: وإذ أخذ الله ميثاق النبيين من أجل الذي آتاهم من كتاب وحكمة، ثم جاء كم رسول :يعني: ثم إن جاء كم رسول، يعني ذكر محمد في التوراة، لتؤمنن به، أي ليكونن إيمانكم به للذي عندكم في التوراة من ذكره.

وقال آخرون منهم: تأويل ذلك إذا قرىء بكسر اللام من "لِما"وإذ أخذ الله ميثاق النبيين للذي آتاهم من الحكمة، ثم جعل قوله: لتؤمنن به من الأخذ، أخذالميثاق، كما يقال في الكلام: أخذت ميثاقك لتفعلن لأن أخذ الميثاق بمنزلة الاستحلاف.فكان تأويل الكلام عند قائل هذا القول: وإذا استحلف اللهالنبيين للذي آتاهم من كتاب وحكمة، متى جاء هم رسول مصدق لما معهم ليؤمنن به ولينصرنه.

وأولى القراء تين في ذلك بالصواب قراء ة من قرأ: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَآ آتَيْتُكُمْ﴾ بفتح اللام، لأن الله عز وجل أخذ ميثاق جميع الأنبياء بتصديق كل رسول له ابتعثه إلي خلقه فيما ابتعثه به إليهم، كان ممن آتاه كتاباً، أو من لم يؤته كتاباً. وذلك أنه غير جائزوصف أحد من أنبياء الله عزّ وجلّ ورسله، بأنه كان ممن أبيح له التكذيب بأحد من رسله. فإذاكان ذلك كذلك، وكان معلوماً أن منهم من أنزل عليه الكتاب، وأن منهم من لم ينزل عليه الكتاب، كان بيّناً أن قراء ة من قرأ ذلك: "لِما آتيتكم"بكسر اللام، بمعنى: من أجل اللذي آتيتكم من كتاب، لا وجه له مفهوم إلا على تأويل بعيد، وانتزاع عميق.

ثم اختلف أهل التأويل فيمن أخذ ميثاقه بالإيمان بمن جاءه من رسل الله مصدقاً لما معه، فقال بعضهم إنما أخذ الله بذلك ميثاق أهل الكتاب، دون أنبيائهم، واستشهد والصحة قولهم بذلك بقوله: ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ﴾ قالوا: فإنما أمر الذين أرسلت إليهم الرسل من الأمم بالإيمان برسل الله، ونصرتها على من خالفها، وأما الرسل فإنه لا وجه لأمرها بنصرة أحد، لأنها المحتاجة إلى المعونة على من خالفها من كفرة بني آدم، فأما هي فإنها لا تعين الكفرة على كفرها ولا تنصرها. قالوا: وإذا لم يكن غيرها وغير الأمم الكافرة، فمن الذي ينصر النبيّ، فيؤخذ ميثاقه بنصرته؟ ذكر من قال ذلك.

٥٧٨٦- حدثني محمد بن عمرو، قال: ثنا أبوعاصم، عن عيسى، عن ابن أبي نجيح، عن مجاهد في قوله: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ﴾ قال: هي خطأ من الكاتب، وهي في قراءة ابن مسعود: "وإذأخذ الله ميثاق الذين أوتوا الكتاب".

– حدثني المثنى، قال: ثنا أبو حذيفة، قال: ثنا شبل، عن ابن أبي نجيح، عن مجاهد، مثله.

٥٧٨٧- حدثني المثنى، قال: ثنا إسحاق، قال: ثنا عبد الله بن أبي جعفر، عن أبيه، عن الربيع في قوله: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ﴾ يقول: وإذأخذ الله ميثاق الذين أوتوا الكتاب" وكذلك كان يقرؤها الربيع: و إذأخذ الله ميثاق الذين أوتوا الكتاب"،إنما هي أهل الكتاب، قال: وكذلك كان يقرؤها أبيّ بن كعب، قال الربيع: ألا ترى أنه يقول: ﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ﴾ يقول لتؤمنن بمحمد ﷺ ولتنصرنه، قال: هم أهل الكتاب.

قال آخرون: بل الذين أخذ ميثاقهم بذلك الأنبياء دون أممها. ذكر من قال ذلك:

٥٧٨٨- حدثني المثنى وأحمد بن حازم قالا: ثنا أبو نعيم، قال: ثنا سفيان، عن حبيب، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس، قال: إنما أخذ الله ميثاق النبيين على قومهم.

٥٧٨٩—حدثنا الحسن بن يحي، قال: أخبرنا عبدالرزاق، قال: أخبرنا معمر، عن ابن طاوس، عن أبيه في قوله: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ﴾ أن يصدق بعضهم بعضاً.

—حدثنا القاسم، قال: ثنا الحسين، قال: ثني حجاج، عن ابن جريج، عن ابن طاوس، عن أبيه في قوله: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾... الآية، قال: أخذالله ميثاق الأول من الأنبياء ليصدقنّ وليؤمننّ بما جاء به الآخر منهم.

٥٧٩٠—حدثني المثنى، قال: ثنا إسحاق، قال: ثنا عبداللهبن هاشم، قال: أخبرنا سيف بن عمر، عن أبي روق، عن أبي أيوب، عن عليّ بن أبي طالب، قال: لم يبعث الله عزوجلّ نبياً، آدم فمن بعده، إلا أخذ عليه العهد في محمد: لئن بعث وهو حيّ ليؤمنن به ولينصرنه، ويأمره فيأخذ العهد على قومه، فقال: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ﴾... الآية.

٥٧٩١—حدثنا بشر، قال: ثنا يزيد، قال: ثناسعيد، عن قتادة، قوله: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ﴾... الآية، هذا ميثاق أخذه الله على النبيين أن يصدق بعضهم بعضاً، وأن يبلغوا كتاب الله ورسالاته. فبلغت الأنبياء كتاب الله ورسالاته إلى قومهم، وأخذ عليهم فيما بلغتهم رسلهم أن يؤمنوا بمحمد ﷺ، ويصدقوه وينصروه.

٥٧٩٢—حدثنا محمد بن الحسين، قال: ثنا أحمد بن المفضل، قال: ثنا أسباط، عن السدي: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ﴾... الآية. قال: لم يبعث الله عزوجلّ نبياً قط من لدن نوح إلا أخذ ميثاقه: ليؤمنن بمحمد، ولينصرنه إن خرج وهو حيّ، وإلا أخذ على قومه أن يؤمنوا به، ولينصرنه إن خرج وهم أحياء.

٥٧٩٣—حدثني محمد بن سنان، قال: ثنا عبد الكبير بن عبد المجيد أبوبكر الحنفي، قال: ثنا عبادبن منصورقال: سئلت الحسن عن قوله: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ﴾... الآية كلها، قال: أخذاللهميثاق النبيين: ليبلغن آخركم أوّلكم ولا تختلفوا.

وقال آخرون:معني ذلك:أنه ميثاق النبيين وأممهم، فاجتزأبذكر الأنبياء عن ذكر أممها، لأن في ذكر أخذ الميثاق علي المتبوع دلالة علي أخذه علي التباع، لأن الأمم هم تبّاع الأنبياء. ذكر من قال ذلك:

٥٧٩٣- حدثنا ابن حميد، قال: ثنا سلمة، عن محمد بن إسحاق، عن محمد بن أبي محمد، عن عكرمة أو عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس، قال: ثم ذكر ما أخذ عليهم، يعني علي أهل الكتاب، وعلي أنبيائهم من الميثاق بتصديقه، يعني بتصديق محمد ﷺ إذا جاء هم، و إقرارهم به علي أنفسهم، فقال:﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّنَ لَمَآ آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتٰبٍ وَحِكْمَةٍ﴾...إلي آخر الآية.

- حد ثنا أبو كريب، قال : ثنا يونس بن بكير، قال : ثنا محمد بن إسحاق، قال : ثني محمد بن أبي محمد مولي زيد بن ثابت، قال : ثني سعيد بن جبير او عكرمة، عن ابن عباس، مثله.

وأولي هذه الأقوال في ذلك بالصواب قول من قال : معني ذلك : الخبر عن أخذ الله الميثاق من أنبيائه بتصديق بعضهم بعضاً، علي الأنبياء علي أممها، وتباعها الميثاق بنحو الذي أخذ عليها ربها من تصديق أنبياء الله ورسله بما جاء تها به، لأن الأنبياء عليهم السلام بذلك أرسلت إلي أممها، ولم يدع أحد ممن صدق المرسلين أن نبياً أرسل إلي أمة بتكذيب أحد من أنبياء الله عزّ وجلّ، وحججه في عباده، بل كلها، وإن كذّب بعض الأمم بعض أنبياء الله بجحودها نبوّته مقر بأن من ثبتت صحة نبوته، فعليها الدينونة بتصديقه فذلك ميثاق مقرّ به جميعهم . ولا معني لقول من زعم أن الميثاق إنما أخذ علي الأمم دون الأنبياء، لأن الله عزّ وجلّ، قد أخبر أنه أخذ ذلك من النبيين، فسواء قال قائل: لم يأخذ ذلك منها ربها، أوقال: لم يأمرها ببلاغ ما أرسلت، وقد نص الله عزّ وجلّ أنه أمرها بتبليغه لأنهما جميعاً خبران من الله عنهما، أحد هما أنه أخذ منها، والآخر منهما أنه أمرها، فإن جاز الشك في أحد هما جاز في الآخر. وأما مااستشهد به الربيع بن أنس علي أن المعنيّ بذلك أهل الكتاب من قوله : ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ فإن ذلك غير شاهد علي صحة ما قال، لأن الأنبياء قد أمر بعضها بتصديق بعض، وتصديق بعضها بعضاً، نصرة من بعضها بعضاً.

ثم اختلفوا في الذين عنوا بقوله:﴿ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَ لَتَنْصُرُنَّهُ﴾فقال بعضهم الذين عنوا بذلك هم الأنبياء، أخذت مواثيقهم أن يصدق بعضهم بعضاً، وأن ينصروه، وقد ذكرنا الرواية بذلك عمن قاله.

وقال آخرون : هم أهل الكتاب أمروا بتصديق محمد ﷺ إذا بعثه الله وبنصرته، وأخذ ميثاقهم في كتبهم بذلك، وقد ذكرنا لرواية بذلك أيضاً عمن قاله .

وقال آخرون ممن قال الذين عنوا بأخذالله ميثاقهم منهم في هذه الآية هم الأنبياء، قوله :﴿ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾معني به أهل الكتاب . ذكر من قال ذلك:

٥٧٩٥—حدثنا الحسن بن يحي،قال:أخبرنا عبدالرزاق قال: أخبرنا معمر. قال: أخبرنا ابن طاوس، عن أبيه في قوله : ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّنَ لَمَآ ءَاتَيْتُكُم مِّن كِتَٰبٍ وَحِكْمَةٍ﴾قال:أخذ الله ميثاق النبيين: أن يصدق بعضهم بعضاً، ثم قال : ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَ لَتَنْصُرُنَّهُ﴾ قال: فهذه الآية لأهل الكتاب أخذ الله ميثاقهم أن يؤمنوا بمحمد ويصدقوه.

٥٧٩٦– حدثني المثني،قال:ثنا إسحاق، قال : ثني ابن أبي جعفر، عن أبيه، قال : قال قتادة : أخذالله على النبيين ميثاقهم أن يصدق بعضهم بعضاً، وأن يبلغوا كتاب الله ورسالته إلي عباده، فبلّغت الأنبياء كتاب الله ورسالاته إلي قومهم، وأخذوا مواثيق أهل الكتاب في كتابهم، فيما بلغتهم رسلهم، أن يؤمنوا بمحمد ﷺ، ويصدقوه وينصروه .

وأولى الأقوال بالصواب عندنا في تأويل هذه الآية : أن جميع ذلك خبر من الله عزّوجلّ عن أنبيائه أنه أخذ ميثاقهم به، وألزمهم دعاء أممهم إليه والإقرار به، لأن إبتداء الآية خبر من الله عزّوجلّ عن أنبيائه أنه أخذ ميثاقهم، ثم وصف الذي أخذ ميثاقهم، فقال : هو كذا وهو كذا.

وإنما قلنا إن ما أخبر الله أنه أخذ به مواثيق أنبيائه من ذلك، قد أخذت الأنبياء مواثيق أممها به، لأنها أرسلت لتدعو عبادالله إلي الدينونة،

بما أمرت بالديونة به في أنفسها من تصديق رسل الله على ما قد منا البيان قبل . فتأويل الآية : واذكروا يا معشر أهل الكتاب إذ أخذالله ميثاق النبيين لمهما آتيتكم أيها النبيون من كتاب وحكمة، ثم جاء كم رسول من عندي مصدق لما معكم لتؤمنن به، يقول : لتصدقنه ولتنصرنه، وقد قال السدي في ذلك بما :

٥٧٩٧-حدثنا به محمد بن الحسين، قال: ثنا أحمد، قال:ثنا أسباط، عن السدي قوله : ﴿ لَمَا آتَيْتُكُم ﴾ يقول لليهود : أخذت ميثاق النبيين بمحمدﷺ، وهوالذي ذكر في الكتاب عندكم.

فتأويل ذلك على قول السدي الذي ذكرناه : واذكروا يا معشر أهل الكتاب، إذأخذ الله ميثاق النبيين لما آتيتكم أيها اليهودمن كتاب وحكمة . وهذا الذي قاله السدي كان تأويلاً لا وجه غيره لوكان التنزيل "بما آتيتكم"،ولكن التنزيل باللام لما آتيتكم، وغير جائز في لغة أحد من العرب أن يقال : أخذالله ميثاق النبيين لما آتيتكم، بمعني : بما آتيتكم'

تفسیر کشاف:

(ميثاق النبيين)فيه غيروجه : احدها أن يكون على ظاهره من أخذ الميثاق على النبيين بذلك . والثاني أن يضيف الميثاق الى النبيين اضافته الى الموثق لاالى الموثق عليه كما تقول ميثاق الله وعهد الله كأنه قيل : واذ أخذالله ميثاق الذى وثقه الأنبياء على اممهم . والثالث أن يراد ميثاق أولادالنبيين وهم بنواسرائيل على حذف المضاف .والرابع أن يراد اهل الكتاب وأن يرد على زعمهم تهكما بهم لأنهم كانوايقولون :نحن أولى بالنبوةمن محمد لأنا اهل الكتاب ومنا كان النبييون'وتدل عليه قراءة أبيّ وابن مسعود"وأذ أخذ الله ميثاق الذين أوتوا الكتاب"واللام في (لما آتيتكم)لام التوطئة لأن أخذالميثاق في معني الاستحلاف وفي لتؤمنن لام جواب القسم، وما يحتمل أن تكون المتضمنة لمعني الشرط، وفي لتؤمنن سادّ مسد جواب القسم والشرط جميعاً، وأن تكون موصولة بمعني الذى آتيتكموه لتؤمنن به . وقرىء لما آتينا كم، وقرأ حمزة لما

آتيتكم بكسر اللام ' ومعناه : لاجل أيتائي اياكم بعض الكتاب والحكمة ' ثم لمجيء رسول مصدق لما معكم لتؤمنن به على أن ما مصدرية والفعلان معها، أعني آتيتكم وجاء كم في معنى المصدرين،واللام داخلة للتعليل على معنى اخذ الله ميثاقهم لتؤمنن بالرسول ولتنصرنه ، لأجل أني آتيتكم الحكمة، وأن الرسول الذى آمركم بالايمان به ونصرته موافق لكم غير مخالف، ويجوز أن تكون ما موصولة، فأن قلت :كيف يجوز ذلک والعطف على آتيتكم وهو قوله ثم جاء كم لايجوز أن يدخل تحت حكم الصفة لأنک لا تقول للذى جاء كم رسول مصد ق لما معكم ؟ قلتُ : بلى لأن ما معكم في معني ماآتيتكم، فكأنه قيل للذ ى آتيتكموه وجاء كم رسول مصد ق له . وقرأ سعيد ابن جبير لما بالتشد يد بمعنى حين آتيتكم بعض الكتاب والحكمة ثم جاء كم رسول مصدق له وجب عليكم الايمان به ونصرته، وقيل أصله لمن ما فاستثقلوااجماع ثلاث ميمات وهى ميمان والنون المنقلبة ميما بأدغامها في الميم فحذ فوا أحداها فصارت لماومعناها : لمن أجل ما آتيتكم لتؤمنن به وهذ ا نحو في القراء ة حمزة في المعني(أصري)عهدى . وقرىء أصرى بالضم ؛ وسمي أصرا لأنه مما يؤصر : اى يشد ويعقد، ومنه الأصار الذى يعقدبه ' ويجوز أن يكون المضموم لغة في أصرى كعبر وعبر وأن يكون جمع أصار (فاشهدوا) فليشهد بعضكم على بعض بالأقرار (وأنا على ذلكم)من أقراركم وتشاهدكم (من الشاهدين) وهذا توكيد عليهم وتحذ ير من الرجوع اذا علموا بشهادة الله وشهادة بعضهم على بعض . وقيل الخطاب للملائكة .

معالم التنزيل ۔(ص۳۲۱۔۳۲۲،ط ملتان)

قوله عزوجلّ:﴿وَإِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ﴾قرأ حمزة﴿لما﴾بكسر اللام، وقرأالآخرون بفتحها، فمن كسر اللام فهي لامُ الاضافة دخلت على ما الموصولة، ومعناه: إن الذي يريد للذي آتيتكم، أي:أخذ ميثاق النبيين لأجل الذيآ تا هم من الكتاب

والحكمة وأنهم أصحاب الشرائع، ومن فتح اللام فمعناه: للذي آتيتكم، بمعنى الخبر، وقيل:بمعنى الجزاء،أي:لئن آتيتكم ومهما آتيتكم، وجواب الجزاء، قوله:﴿لَتُؤمِنُنَّ به﴾ قوله ﴿لماآتيتكم﴾ قرأ نافع و أهل المدينة ﴿آتيناكم﴾على التعظيم كما قال:﴿وآتينا داود زبوراً﴾﴿وآتيناه الحكم صبياً﴾وقرأ الآخرون بالتاء لموافقة الخط، ولقوله:﴿وإنا معكم﴾ واختلفوا في المعنى بهذه الآية فذهب قوم إلى أن الله تعالىٰ أخذ الميثاق على النبيين خاصةً أن يُبلغوا كتاب الله ورسالته إلى عباده، وأن يُصدّق بعضهم بعضاً و أخذ العهود على كل نبي أن يؤمن بمن يأتي بعده من الأنبياء، وينصره إن أدركه، فإن لم يدركه أن يأمره قومَه بنصرته إن أدركه، فأخذالميثاق من موسى أن يؤمن بعيسى،ومن عيسى أن يؤمن بمحمدﷺ،وقال الآخرون : بما أخذالله الميثاق منهم في أمرمحمد ﷺ،فعلى هذا اختلفوا فمنهم من قال:إنما أخذالميثاق على أهل الكتاب الذين أرسل منهم النبيين، وهذا قول مجاهد و الربيع، ألا ترى إلى قوله ﴿ثُمَّ جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾وإنما كان محمد ﷺ مبعوثاً إلى أهل الكتاب دون النبيين يدل عليه أن في قراءة عبد الله بن مسعود وأبي بن كعب﴿وإذا خذالله ميثاق الذين أوتو الكتاب﴾ وإنما القراءة المعروفة ﴿وإذا خذالله ميثاق النبيين﴾ فأراد:أن الله أخذ ميثاق النبيين أن ياخذو الميثاق إلىٰ أُممهم أن يؤمنوا بمحمد ﷺويصدقوه وينصروه، إن أدركوه، وقال بعضهم : أراد أخذالله الميثاق على النبيين، وأممهم جميعاً في أمر محمد ﷺ،فاكتفى بذكر الأنبياء لأن العهد على المتبوع عهد على الاتباع، وهذا معنى قول ابن عباس، وقال علي بن أبي طالب: لم يبعث الله نبياً آدم فمن بعده إلا أخذعليه الميثاق والعهد في أمر محمد، وأخذ العهد على قومه ليؤمنن به، ولئن بُعث وهم أحياء لينصرنه، قوله: ﴿ثُمَّ جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾يعني:محمداًﷺ، ﴿لَتُؤمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قال﴾يقول الله تعالىٰ للأنبياء حين استخرج الذرية من صلب آدم عليه السلام والأنبياء فيهم كالمصابيح والسُّرج، وأخذ عليهم الميثاق في أمر محمدﷺ، ﴿أقررتم وأخذتم على ذٰلكم إصري﴾

أي: قبلتم على ذلكم عهدي، والإصر: العهد الثقيل،﴿فقالوا أقررنا قال﴾، الله تعالىٰ: ﴿ فاشهدوا ﴾أي: فاشهدوا أنتم على أنفسكم وعلى أتباعكم، ﴿وانا معكم من الشاهدين﴾،عليكم وعليهم، وقال ابن عباس: فاشهدوا، أي: فاعلموا، وقال سعيد بن المسيب : قال الله تعالىٰ للملائكة فاشهدوا عليهم كناية عن غير مذكور.

تفسیر کبیر:(ص۲۷۳-۲۷۹ج۳)

﴿"وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَ أَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوٓا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾

اعلم أن المقصود من هذه الآيات تعديد تقرير الأشياء المعروفة عند أهل الكتاب مما يدل على نبوة محمد ﷺقطعاً لعذرهم وإظهاراً لعنادهم ومن جملتها ما ذكره الله تعالىٰ في هذه الآية وهو أنه تعالىٰ أخذ الميثاق من الأنبياء الذين آتاهم الكتاب والحكمة بأنهم كلما جاءهم رسول مصدق لما معهم آمنوا به ونصروه، وأخبر أنهم قبلوا ذلك وحكم تعالىٰ بأن من رجع عن ذلك كان من الفاسقين، فهذا هو المقصود من الآية فحاصل الكلام أنه تعالىٰ أوجب على جميع الأنبياء الإيمان بكل رسول جاء مصدقاً لما معهم إلا أن هذه المقدمة الواحدة لاتكفي في إثبات نبوة محمد ﷺ مالم يضم إليها مقدمة أخرى،وهي أن محمداً رسول الله جاء مصدقاً لما معهم، وعند هذا لقائل أن يقول: هذا إثبات للشيء بنفسه، لأنه إثبات لكونه رسولاً بكونه رسولاً.

والجواب: أن المرادمن كونه رسولاً ظهورالمعجز عليه، و حينئذ يسقط هذا السؤال والله أعلم، ولنرجع إلى تفسيرالألفاظ:

أما قوله﴿وإذأخذالله﴾فقال ابن جريرالطبرى : معناه اذكروا ياأهل الكتاب إذأخذالله ميثاق النبيين، وقال الزجاج : واذكريا محمد في القرآن إذأخذ الله ميثاق النبيين .

أما قوله﴿ميثاق النبيين﴾فاعلم أن المصدر يجوز إضافته إلى الفاعل وإلى المفعول، فيحتمل أن يكون الميثاق مأخوذاً منهم، ويحتمل أن يكون مأخوذا لهم من غيرهم، فلهذا السبب اختلفوا في تفسير هذه الآية على هذين الوجهين.

أما الإحتمال الأوّل : وهو أنه تعالىٰ أخذ الميثاق منهم في أن يصدق بعضهم بعضاً، وهذا قول سعيدبن جبيروالحسن وطاؤس رحمهم الله، وقيل: إن الميثاق هذا مختص بمحمدﷺوهو مروي عن علي وابن عباس وقتادة والسدي رضوان الله عليهم، واحتج أصحاب هذا القول علىٰ صحته من وجوه.الأوّل:أن قوله تعالىٰ ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ﴾ يشعربأن آخذالميثاق هوا لله تعالىٰ، والمأخوذ منهم هم النبيون، فليس في الآية ذكرالأمة، فلم يحسن صرف الميثاق إلى الأمة، ويمكن أن يجاب عنه من وجوه، الأوّل : على أن الوجوه الذي قلتم يكون الميثاق مضافاً إلى الموثق عليه، وعلى الوجه الذي قلنايكون إضافته إليهم إضافة الفعل إلى الفاعل، وهو الموثق له، ولا شك أن إضافة الفعل إلى الفاعل أقوىٰ من إضافته إلى المفعول، فإن لم يكن فلا أقل من المساواة، وهو كما يقال ميثاق الله وعهده، فيكون التقدير: وإذأخذ الله ميثاق الذي وثقه الله للأنبياء على أممهم .الثاني: أن يراد ميثاق أولاد النبيين، وهو بنوإسرائيل على حذف المضاف وهو كما يقال : فعل بكربن وائل كذا، وفعل معد بن عدنان كذا، والمراد أولادهم وقومهم، فكذا ههنا . الثالث: أن يكون المراد من لفظ﴿النبيين﴾أهل الكتاب وأطلق هذا اللفظ عليهم تهكماً بهم على زعمهم لأنهم كانوا يقولون نحن أولى با النبوة من محمد عليه الصلاة والسلام لأ نا أهل الكتاب ومنا كان النبيون . الرابع: أنه كثيراً ورد في القرآن لفظ النبي والمراد منه أمته قال تعالىٰ : ﴿ يا أيها النبي اذا طلقتم النساء﴾[الطلاق:١]

الحجة الثانية: لأصحاب هذا القول:ما روي أنه عليه الصلاة و السلام قال:"لقد جئتكم بها بيضاء نقية أما والله لوكان موسىٰ بن عمران حياً لما وسعه إلا اتباعي".

الحجة الثالثة : ما نقل عن علي رضي الله عنه أنه قال: إن الله تعالى ما بعث آدم ومن بعده من الأنبياء عليهم الصلاة والسلام إلا أخذ عليه العهد لئن بعث محمد عليه الصلاة والسلام وهو حي ليؤمنن به ولينصرنه، فهذا يمكن نصرة هذا القول به والله اعلم.

الاحتمال الثاني: إن المراد من الآية أن الأنبياء عليهم الصلاة والسلام كانوا يأخذون الميثاق من أممهم بانه إذا بعث محمد ﷺ فإنه يجب عليهم أن يؤمنو به وأن ينصروه، وهذا قول كثير من العلماء، وقد بينا أن اللفظ محمتمل له وقد احتجوا على صحته بوجوه . الأول : ما ذكره أبو مسلم الأصفهاني فقال: ظاهر الآية يدل على أن الذين أخذ الله ميثاق منهم يجب عليهم الإيمان بمحمد ﷺعندمبعثه، وكل الأنبياء عليهم الصلاة والسلام يكونون عند مبعث محمد ﷺ من زمرة الأموات، والميت لا يكون مكلفافلما كان الذين أخذالميثاق عليهم يجب عليهم الإيمان بمحمدعليه السلام عند مبعثه ولا يمكن إيجاب الإيمان على الأنبياء عند مبعث محمد عليه السلام، علمنا أن الذين أخذ الميثاق عليهم ليسوا هم النبيين بل هم أمم النبيين قال: ومما يؤكد هذاأنه تعالىٰ حكم على الذين أخذ عليهم الميثاق أنهم لو تولوا لكانوا فاسقين وهذا الوصف لا يليق بالأنبياء عليهم السلام وإنما يليق بالأمم، أجاب القفال رحمه الله فقال لم لا يجوز أن يكون المراد من الآية أن الأنبياء لو كانوا في الحياة لوجب عليهم الإيمان بمحمد عليه الصلاة والسلام، ونظيره قوله تعالىٰ : ﴿لئن اشركت ليحبطن عملك﴾[الزمر:٦٥]وقد علم الله تعالىٰ أنه لا يشرك قط ولكن خرج هذاالكلام على سبيل التقدير والفرض فكذا ههنا وقال: ﴿ولو تقول علينا بعض الأقاويل. لأخذنا منه باليمين.ثم لقطعنا منه الوتين﴾[الحاقة:٤٤،٤٥،٤٦]وقال في صفة الملائكة﴿ ومن يقل منهم إني إله من دونه فذلك نجزيه جهنم كذلك نجزي الظالمين﴾[الأنبياء:٢٩]مع أنه تعالىٰ أخبرعنهم بأنهم لا يسبقونه بالقول وبأنهم يخافون ربهم من فوقهم، فكل ذلك خرج على سبيل الفرض والتقدير فكذا ههنا، ونقول إنه سماهم فاسقين على تقدير التولي،فإن اسم الفسق ليس أقبح من اسم

الشرك، وقد ذكر ذلك تعالى على سبيل الفرض والتقدير في قوله: ﴿لئن اشركت ليحبطن عملك﴾[الزمر:٦٥]فكذا ههنا.

الحجة الثانية: أن المقصود من هذه الآية أن يؤمن الذين كانوا في زمان الرسول الله ﷺ،وإذا كان الميثاق مأخوذاً عليهم كان ذلك أبلغ في تحصيل هذاالمقصود من أن يكون مأخوذاً على الأنبياء عليهم السلام، وقد أجيب عن ذلك بأن درجات الأنبياء عليهم السلام، أعلىٰ وأشرف من درجات الأمم، فإذا دلت هذه الآية على أن الله تعالىٰ أوجب على جميع الأنبياء أن يؤمنوا بمحمد عليه السلام، لو كانوا في الأحياء، وأنهم لوتركوا ذلك لصاروا من زمرة الفاسقين فلأن يكون الإيمان بمحمد ﷺ واجباً على أممهم لو كان ذلك أولى، فكان صرف هذا الميثاق إلى الأنبياء أقوىٰ في تحصيل المطلوب من هذا الوجه.

الحجة الثالثة: ما روي عن ابن عباس أنه قيل له إن أصحاب عبد الله يقرؤن ﴿وإذ أخذ الله ميثاق الذين أ توا الكتاب﴾ونحن نقرأ﴿وإذ أخذالله ميثاق النبيين﴾ فقال ابن عباس رضي الله عنهما: إنما أخذالله ميثاق النبيين على قومهم.

الحجة الرابعة:أن هذا الاحتمال متأكد بقوله تعالى ﴿يابني إسرائيل اذكروا نعمتي التي انعمتُ عليكم واوفوا بعهدي أوف بعهدكم﴾ وبقوله تعالى:﴿وإذ أخذالله ميثاق الذين أوتوا الكتاب لتبيننه للناس ولا تكتمونه﴾ [آل عمران:١٨٧]فهذا جملة ما قيل في هذا الموضوع والله أعلم بمراده.

وأما قوله تعالىٰ:﴿ولما آتيتكم من كتاب وحكمة﴾ ففيه مسائل:

المسئلة الأولىٰ: قرأ الجمهور﴿لما﴾بفتح اللام وقرأ حمزة بكسر اللام وقرأسعيد بن جبير﴿لما﴾مشددة، أما القراء ة بالفتح فلها وجهان الأول: أن (ما) اسم موصول والذي بعده صلة له وخبره قوله ﴿لتؤمنن به﴾ والتقدير: للذي آتيتكم من كتاب وحكمة، ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم لتؤ منن به، وعلى هذا التقدير(ما)رفع بالابتداء والراجع إلى لفظة(ما) وموصولتها محذوف والتقدير: لما آتيتكموه فحذف الراجع كما حذف من قوله﴿أهذا الذي بعث الله رسولاً﴾ [الفرقان:٤١] وعليه سؤالان:

السؤال الأول: إذا كانت (ما) موصولة لزم أن يرجع من الجملة المعطوفةعلى الصلة ذكر إلى الموصول وإلا لم يجز، ألاترى أنك لوقلت: الذي قام أبوه ثم انطلق زيد لم يجز.

وقوله تعالىٰ:﴿ثم جاء كمْ رسول مصدق لما معكم﴾ليس فيه راجع إلى الموصول، قلنا: يجوز إقامة المظهرمقام المضمرعند الأخفش والدليل عليه قوله تعالىٰ :﴿إنه من يتق ويصبرفإن الله لا يضيع أجرالمحسنين﴾ [يوسف:۹۰]ولم يقل : فإن اللهلايضيع أجره، وقال:﴿إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات إنا لا نضيع أجرمن أحسن عملاً﴾ [الكهف ۳۰]ولم يقل : إنا لانضيع أجرهم وذلک لأن المظهر المذكور قا ئم مقام المضمر فكذا ههنا.

السؤال الثاني: ما فائدة اللام في قوله﴿لما﴾قلنا: هذه اللام هي لام الابتداء بمنزلة قولک: لزيد أفضل من عمر، ويحسن إدخالهاعلى ما يجري مجرى المقسم عليه لأن قوله﴿وإذاخذالله ميثاق النبيين﴾بمنزلة القسم والمعنى استحلفهم، وهذه اللام المتلقية للقسم، فهذا تقرير هذا الكلام.

الوجه الثاني: وهو اختيار سيبويه والمازني والزجاج أن(ما)ههنا هي المتضمنة لمعنى الشرط والتقديرما آتيتكم من كتاب وحكمة ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم لتؤ منن به، فاللام في قوله﴿لتؤمنن به﴾هي المتلقية للقسم، أما اللام في (لما)هي لام تحذف تارةً، وتذكر أخرى، ولا يتفاوت المعنىٰ ونظيره قولک : والله لوان فعلت، فعلت فلفظة(ان)لا يتفاوت الحال بين ذكرها وحذ فهافكذا ههنا، وعلى هذا التقدير كانت (ما)في موضع نصب بآتيتكم﴿وجاء كم﴾جزم بالعطف على﴿آتيتكم﴾ و ﴿لتؤمنن به﴾هو الجزاء وانما لم يرض سيبويه بالقول الأوّل لأنه لا يرى إقامة المظهر مقام المضمر، وأما الوجه فيقراء ة﴿لما﴾بكسر اللام فهو أن هذا لام التعليل كانه قيل:أخذ ميثاقهم لهذا لأن من يؤتى الكتاب والحكمة فإن اختصاصه بهذه الفضيلة يوجب عليه تصديق سائر الأنبياء والرسل وما على هذه القراء ة تكون موصولة، وتمام البحث فيه ما قدمناه في الوجه الأوّل،وأما قراء ة ﴿لما﴾بالتشديد فذكر صاحب "الكشاف"فيه

وجهين. الأول: أن المعنى: حين آتيتكم بعض الكتاب والحكمة، ثم جاء كم رسول مصدق له، وجب عليكم الإيمان به ونصرته، والثاني: أن أصل ﴿لما﴾لمن ما فاستثقلوا اجتماع ثلاثة ميمات، وهي ميمان والنون المنقلبة ميماً بإدغامها في الميم فحذفوا إحداها فصارت﴿لما﴾ومعناه لمن أجل ما آتيتكم لتؤمنن به، وهذا قريب من قراءة حمزة في المعنى.

المسئلة الثانية: قرأ نافع ﴿آتيناكم﴾ بالنون على التفخيم، والباقون بالتاء على التوحيد،حجة نافع قوله﴿وآتينا داود زبوراً﴾ [النساء: ١٦٣] ﴿وآتيناه الحكم صبياً﴾ [مريم: ١٢]﴿وآتيناهما الكتاب المستبين﴾ [الصافات: ١١٧]،ولأن هذا أدل على العظمة فكان أكثر هيبة في قلب السامع، وهذا الموضع يليق به هذا المعنى، وحجة الجمهور قوله﴿هو الذي ينزل على عبده آيات بينات﴾[الحديد: ٩]و ﴿الحمدلله الذي أنزل على عبده الكتاب ﴾ [الكهف: ١]وأيضاً هذه القراءة أشبه بما قبل هذه الآية وبما بعدها لأنه تعالى قال قبل هذه الآية ﴿وإذ أخذالله﴾وقال بعدها﴿إصري﴾وأجاب نافع عنه بأن أحد أبواب الفصاحة تغير العبارة من الواحد إلى الجمع ومن الجمع إلى الواحد قال تعالى:﴿وجعلناه هدىً لبني إسرائيل ألا تتخذوا من دوني﴾[الإسراء: ٢]ولم يقل من دوننا كما قال:﴿وجعلناه﴾والله أعلم.

المسئلة الثالثة: أنه تعالى ذكرالنبيين على سبيل المغايبة ثم قال : ﴿آتيتكم﴾وهو مخاطبة إضمار والتقدير: وإذأخذالله ميثاق النبيين فقال مخاطباً لهم لما آتيتكم من كتاب وحكمة، والإضمارباب واسع في القرآن، ومن العلماء من التزم في هذه الآية إضماراً آخر وأراح نفسه عن تلك التكلفات التي حكيناها عن النحويين فقال تقدير الآية: وإذأخذ الله ميثاق النبيين لتبلغن الناس ما آتيتكم من كتاب وحكمة، قال إلا أنه حذف لتبلغن لدلالة الكلام عليه لأن لام القسم إنما يقع على الفعل فلما دلت هذه اللام على هذاالفعل لا جرم حذفه اختصاراثم قال تعالى بعده ﴿ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم﴾وهو محمد ﷺ﴿لتؤمنن به ولتنصرنه ﴾ وعلى هذا التقدير يستقيم النظم ولا يحتاج إلى تلك التعسفات، وإذا كان لا بد من التزام الإضمار فهذا الإضمار الذي به ينتظم الكلام نظماً بيناً جلياً أولى من تلك الكلفات.

المسئلة الرابعة: في قوله﴿لما آتيتكم من كتاب وحكمة﴾ إشكال، وهو أن هذاالخطاب إما أن يكون مع الأنبياء أومع الأمم، فإن كان مع الأنبياء فجميع الأنبياء ما اوتو الكتاب، وإنما أوتي بعضهم وإن كان مع الأمم، فالإشكال أظهر، والجواب عنه من وجهين.الأوّل: أن جميع الأنبياء عليهم السلام أتوا الكتاب، بمعنى كونه مهتديا به داعياإلى العمل به، وإن لم ينزل عليه.والثاني: أن أشرف الأنبياء عليهم السلام هم الذين أتو الكتاب، فوصف الكل بوصف أشرف الأنواع.

المسئلة الخامسة: الكتاب هو المنزل المقروء والحكمة هي الوحي الوارد بالتكاليف المفصلة التي لم يشتمل الكتاب عليها.

المسئلة السادسة: كلمة﴿من﴾في قوله﴿من كتاب﴾دخلت تبييناً لما كقولك: ما عندي من الورق دانقان .

اما قوله تعالى:﴿ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم﴾ففيه سؤالات:

السؤال الاوّل:ما وجه قوله:﴿ثم جاء كم﴾والرسول لا يجيء إلى النبيين وإنما يجيء إلى الامم؟

والجواب:إن حملنا قوله﴿وإذ أخذالله ميثاق النبيّين﴾على أخذ ميثاق أممهم فقد زال السؤال وإن حملناه على أخذ ميثاق النبيّين انفسهم كان قوله﴿ثم جاء كم ﴾أي جاء في زمانكم.

السؤال الثاني:كيف يكون محمد ﷺ مصدقاً لما معهم مع مخالفة شرعه لشرعهم، قلنا : المرادبه حصول الموافقة في التوحيد، والنبوات، وأصول الشرائع، فأما تفاصيلها وإن وقع الخلاف فيها ؛ فذلك في الحقيقة ليس بخلاف،لأن جميع الأنبياء عليهم السلام متفقون على أن الحق في زمان موسىٰ عليه السلام ليس إلا شرعه وأن الحق في زمان محمد ﷺ ليس إلا شرعه، فهذا وإن كان يوهم الخلاف، إلا أنه في الحقيقة وفاق، وأيضاً فالمراد من قوله﴿ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم﴾هو محمد ﷺوالمراد بكونه مصدقاً لما معهم هو أن وصفه وكيفية أحواله مذكورة في التورات والإنجيل، فلما ظهر على أحوال مطابقة لما كان مذكوراً في تلك الكتب، كان نفس مجيئه تصديقاً لما كان معهم، فهذا هو المراد بكونه مصدقاً لما معهم.

السؤال الثالث:حاصل الكلام أن اللهتعالىٰ أخذ الميثاق على جميع الأنبياءبأن يؤمنوابكل رسول يجيء مصدقاًلمامعهم فمامعنى ذلك الميثاق

والجواب: يحتمل أن يكون هذا الميثاق ما قررفي عقولهم من الدلائل الدالة على أن الإنقياد لأمرالله واجب، فإذا جاء الرسول وهو إنما يكون رسولاً عند ظهورالمعجزات الدالة على صدقه فإذا أخبرهم بعد ذلك أن الله أمرالخلق بالإيمان به عرفوا عند ذلك وجوبه، فتقدير هذا الدليل في عقولهم هو المرادمن أخذ الميثاق، ويحتمل أن يكون المراد من أخذ الميثاق أنه تعالىٰ شرح صفاته في كتب الأنبياء المتقدمين، فإذا صارت أحواله مطابقة لما جاء في كتب الإلهية المتقدمة وجب الإنقياد له، فقوله تعالىٰ: ﴿ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم﴾يدل على هذين الوجهين، أما على الوجه الأوّل،فقوله ﴿رسول﴾وأما على الوجه الثاني، فقوله ﴿مصدق لما معكم﴾.

أما قوله ﴿لتؤمنن به ولتنصرنه﴾فالمعنى ظاهر،وذلك لأنه تعالىٰ أوجب الإيمان به أوّلاً، ثم الاشتغال بنصرته ثانياً، واللام في ﴿لتؤمنن به﴾ لام القسم كأنه قيل والله لتؤمنن به.

ثم قال تعالىٰ: ﴿قال أأقررتم وأخذتم على ذلكم إصري﴾وفيه مسائل:

المسئلة الأولىٰ: إن فسرنا قوله تعالى﴿وإذ أخذالله ميثاق النبيّين﴾ بأنه تعالىٰ أخذالمواثيق على الأنبياء

كان قوله تعالىٰ ﴿أأقررتم﴾ معناه: قال الله تعالىٰ للنبيّين أأقررتم بالإيمان به والنصرة له وإن فسرنا أخذ الميثاق بأن لأنبياء عليهم الصلاة والسلام أخذ وا المواثيق على الأمم كان معنى قوله ﴿قال أأقررتم﴾أي قال كل نبي لأمته أأقررتم، وذلك لأنه تعالى أضاف أخذالميثاق إلى نفسه، وإن النبيون أخذوه على أمم، لكذلك طلب هذا الإقرار أضافه إلى نفسه وإن وقع من الأنبياء عليهم الصلاة والسلام، والمقصود أن الأنبياء بالغوا في إثبات هذا المعنى وتأكيده، فلم يقتصروا على أخذالميثاق على الأمم، بل طالبوهم بالإقرار بالقول، وأكدوا ذلك بالإشهاد

المسألةالثانية: الإقرار في اللغة منقول بالألف من قر الشيء يقر، إذا ثبت ولزم مكانه وأقره غيره والمقر بالشيء يقره على نفسه أي يثبته.

أماقوله:﴿وأخذتم على ذلكم إصري﴾أي قبلتم عهدي، والأخذ بمعنى القبول كثير في الكلام قال تعالى:﴿ولايؤخذ منها عدل﴾ [البقرة ٤٨] أي يقبل منها فدية وقال:﴿ويأخذالصدقات﴾ [التوبة ١٠٤] أي يقبلها و

الإصر هو الذي يلحق الإنسان لأجل ما يلزمه من عمل قال تعالى: ﴿ولا تحمل علينا إصراً﴾ [البقرة ٢٨٦] فسمي العهد إصراً لهذا المعنى، قال صاحب (الكشاف): سمي العهد إصراً لأنه مما يؤصر أي يشد يعقد، منه الإصار الذي يعقد به وقرىء ﴿إصري﴾ ويجوز أن يكون لغة في إصر.

ثم قال تعالى: ﴿قالوا أقررنا قال فاشهدوا وأنا معكم من الشاهدين﴾ وفي تفسير قوله ﴿فاشهدوا﴾ وجوه. الأول: فليشهد بعضكم على بعض بالإقرار، وأنا على إقراركم وإشهاد بعضكم بعضاً ﴿من الشاهدين﴾ وهذا توكيد عليهم وتحذير من الرجوع إذا علموا شهادة الله وشهادة بعضهم على بعض. الثاني: أن قوله ﴿فاشهدوا﴾ خطاب للملائكة. الثالث: أن قوله ﴿فاشهدوا﴾ أي ليجعل كل أحد نفسه شاهداً على نفسه ونظيره قوله ﴿وأشهدهم على أنفسهم ألست بربكم قالوا بلى شهدنا﴾ [الأعراف: ١٧٢] على أنفسنا وهذا من باب المبالغة. الرابع: ﴿فاشهدوا﴾ أي بينوا هذا الميثاق الخاص والعام، لكي لا يبقى لأحد عذر في الجهل به، وأصله أن الشاهد هو الذي يبين صدق الدعوى. الخامس: ﴿فاشهدوا﴾ أي فاستيقنوا ما قررته عليكم من هذا الميثاق، وكونوا فيه كالمشاهد للشيء المعاين له. السادس: إذا قلنا إن أخذ الميثاق كان من الأمم فقوله ﴿فاشهدوا﴾ خطاب للأنبياء عليهم السلام بأن يكونوا شاهدين عليهم.

وأما قوله تعالى: ﴿وأنا معكم من الشاهدين﴾ فهو للتأكيد وتقوية الإلزام، وفيه فائدة أخرى وهي أنه تعالى وإن أشهد غيره، فليس محتاجاً إلى ذلك الإشهاد، لأنه تعالى لا يخفى عليه خافية لكن لضرب من المصلحة لأنه سبحانه وتعالى يعلم السر وأخفى، ثم إنه تعالى ضم إليه تأكيداً آخر فقال: ﴿فمن تولى بعد ذلك فأولئك هم الفاسقون﴾ يعني من أعرض عن الإيمان بهذا الرسول وبنصرته بعد ما تقدم من هذه الدلائل كان من الفاسقين ووعيد الفاسق معلوم، وقوله ﴿فمن تولى بعد ذلك﴾ هذا شرط، والفعل الماضي ينقلب مستقبلاً في الشرط والجزاء، والله أعلم

ابن کثیر۔ (ص۳۷۹ ج۱)

يخبر تعالى أنه أخذ ميثاق كل نبي بعثه من لدن آدم عليه السلام إلى عيسى عليه السلام لمهما آتى الله أحدهم من كتاب وحكمة، وبلغ أي

مبلغ، ثم جاء ه رسول من بعده ليؤمنن به ولينصرنه، ولا يمنعه ما هو فيه من العلم والنبوة من اتباع من بعث بعده ونصرته ولهذا قال تعالیٰ وتقدس ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ﴾اي لمهما اعطيتكم من كتاب وحكمة﴿ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قال أأقررتم واخذتم علىٰ ذلكم إصري﴾قال ابن عباس و مجاهد والربيع بن انس وقتادة والسدي يعني عهدي وقال محمد بن إسحاق (إصري)أي ثقل ما حملتم من عهدي أي ميثاقي الشديد المؤكد ﴿قالوا أ قررنا قال فاشهدوا وانا معكم من الشاهدين فمن تولي بعد ذلک﴾ أي عن هذا العهد والميثاق ﴿فاولئک هم الفاسقون﴾، قال علي بن أبي طالب وابن عمه ابن عباس رضي الله عنهما : ما بعث الله نبياً من الأنبياء إلا أخذ عليه الميثاق، لئن بعث الله محمداً وهو حي ليؤمنن به وينصرنه، و أمره أن يأخذ الميثاق علي أمته لئن بعث محمد وهم أحياء ليؤمنن به ولينصرنه، وقال طاوس و الحسن البصري وقتادة: أخذالله ميثاق النبيين أن يصدق بعضهم بعضاً، وهذا لا يضاد ماقاله علي وابن عباس ولا ينفيه، بل يستلزمه ويقتضيه، ولهذا روى عبد الرزاق عن معمر، عن ابن طاوس، عن ابيه، مثل قول علي وابن عباس، وقد قال الإمام أحمد: حدثنا عبد الرزاق، أنبأنا سفيان، عن جابر، عن الشعبي، عن عبد الله بن ثابت قال: جاء عمر إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله، إني مررت بأخ لي يهودي من قريضة، فكتب لي جوامع من التوراة الا أعرضها عليک ؟ قال، فتغير وجه رسول ﷺ قال عبدالله بن ثابت، قلت له: ألاترى ما بوجه رسول الله ﷺ؟ فقال عمر: رضينا بالله رباً، وبالإسلام ديناً، وبمحمد رسولاً، قال: فسري عن النبي ﷺ وقال والذي نفسي بيده لو أصبح فيكم موسیٰ عليه السلام، ثم اتبعتموه وتركتموني لضللتم، إنكم حظي من الأمم وأناحظكم من النبيين".

[حديث آخر]قال الحافظ أبو بكر:حدثنا إسحاق حدثنا حمادعن مجالد عن الشعبي عن جابرقال : قال رسول الله ﷺ لا تسئلوا أهل الكتاب عن شيء فانهم لن يهدوكم وقدضلوا، وإنكم إما أن تصدقوا

بباطل وإما أن تكذبوا بحق، وإنه والله لو كان موسى حياً بين أظهركم ما حل له إلا أن يتبعني"وفي بعض الأحاديث لوكان موسىٰ وعيسىٰ(1) حيين لما وسعهما إلا اتباعي" فالرسول محمد خاتم الأنبياء صلوات الله وسلامه عليه دائماً إلى يوم الدين، هو الإمام الأعظم الذي لو وجد في أي عصر وجد، لكان هو الواجب طاعته المقدم على الأنبياء كلهم، ولهذا كان إمامهم ليلة الإسراء لما اجتمعوا ببيت المقدس، وكذالک هو الشفيع في المحشر في إتيان الرب جل جلاله لفصل القضاء بين عباده، وهو المقام المحمود الذي لا يليق إلا له، والذي يحيد عنه أولو العزم من الأنبياء والمرسلين، حتى تنتهي النوبة إليه فيكون هو المخصوص به صلوات الله وسلامه عليه.

قادیانی اس حدیث سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر استدلال کرتے ہیں جو محض جہالت ، ضد اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہے کیونکہ علامہ ابن کثیر نے اس باب میں جتنی احادیث بیان کی ہیں ان میں سند کو بھی بیان کیا ہے جو احادیث اس باب میں سند کے ساتھ مذکور ہیں ان میں عیسیٰ کا لفظ نہیں ہے، جبکہ اس روایت میں علامہ ابن کثیر نے کوئی سند بیان نہیں کی ہے لہٰذا قادیانیوں کا ایک بے سند روایت سے عقیدہ کے باب میں استدلال کرنا غلط ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود صاحب ابن کثیر حیات عیسیٰ علیہ السلام کے قائل ہیں۔ چنانچہ آیت "انی متوفیک" کے تحت لکھتے ہیں "انی متوفیک" یعنی وفاۃ نوم، رفعہ اللہ فی منامہ۔ قال الحسن: قال رسول اللہ ﷺ للیہودی ان عیسیٰ لم یمت وانہ راجع الیکم قبل یوم القیامۃ۔ (ابن کثیر ص ۳۷۸، ج ا مطبوعہ بیروت)

تیسری بات یہ کہ اس حدیث کے دیگر طرق وشواہد کو اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ لفظ عیسیٰ کا اضافہ سبقت لسانی یا زلت قلم سے ہے۔

اور سب سے آخری بات یہ کہ بفرض محال اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ روایت درست ہے تو یہ روایت تو خود مرزائیوں کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی وفات ثابت ہوتی ہے جبکہ مرزا قادیانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نہ صرف یہ کہ حیات کا قائل ہے بلکہ نص قرآنی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اور ان کو زندہ ماننا فرض گردانتا ہے۔ (ملاحظہ ہو مرزا کی کتاب حمامۃ البشریٰ در روحانی خزائن ص ۲۲۱ ج ۷۔ نور الحق ص ۶۹ ج ۸)

اب دیکھنا یہ ہے کہ مرزائی کیا فیصلہ کرتے ہیں؟ اگر وہ حدیث مذکور کو صحیح مانتے ہیں تو بھی مرزا جھوٹا ثابت ہوتا ہے کیونکہ حدیث حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موت کو ثابت کرتی ہے اور اگر صحیح نہیں مانتے تو بھی بہرحال مرزا اور مرزائیوں کو ذلت ورسوائی دامن گیر ہے، کیونکہ عقائد کے باب میں وہ ایک غیر صحیح حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

آیت:۔(۵)

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ"۔

(آل عمران ۱۷۹)

ترجمہ:اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو اس حالت پر جس پر تم ہو، جب تک کہ جدا نہ کر دے ناپاک کو پاک سے۔ اور اللہ نہیں ہے کہ تم کو خبر دے غیب کی لیکن اللہ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہے۔ سو تم یقین لاؤ اللہ پر اور اسکے رسولوں پر اور اگر تم یقین پر رہو اور پرہیزگاری پر تو تم کو بڑا ثواب ہے"

خلاصہ:۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مدعیان ایمان کو اسی طرح (منافق و مخلص مومن ملے جلے) رہنے نہیں دیگا بلکہ وہ بد باطن منافق اور مخلص مومن کے درمیان بالکل تمیز قائم کر دیگا۔ چنانچہ تمیز کلی طور پر غزوہ تبوک تک مکمل ہوگئی۔ مخلص مومن لوگ باقی رہ گئے اور منافق چھٹ گئے۔ حتیٰ کہ منافقین کے نام لے لے کر مسجد نبوی سے اٹھا دیا گیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ شدائد و مشکلات میں ڈال کر ہی اللہ تعالیٰ کیوں امتیاز قائم کرتے ہیں بغیر اس کے بھی تو یہ امتیاز ہو سکتا ہے۔ مثلاً اللہ بتا دے کہ کون مومن ہے کون منافق ہے، اس طرح سب کو معلوم بھی ہو جائے اور مسلمان تکالیف و مشکلات سے بھی بچ جائیں گے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ اللہ کی حکمتوں میں سے ایک حکمت اور غیب کی خبروں میں سے ہے اس کے پیچھے نہ پڑ کر بس یوں سمجھ لو کہ اللہ رب العزت کا یہ طریقہ نہیں کہ غیب کی خبریں عام لوگوں کو بتایا کرے بلکہ اس کے لئے وہ حضرات انبیاء کو منتخب فرما کر ان کے ذریعہ بتایا کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ اس آیت میں نہ بعثت رسل کا وعدہ ہے اور نہ ہی تمیز بین المومنین والمنافقین کا معاملہ بعثت رسل کا متقاضی ہے بلکہ یہ کام تو اللہ کا ہے۔ وہ جس طرح چاہے کریگا۔

قادیانی استدلال:۔

خدا تعالیٰ ہر مومن کو اطلاع غیب نہیں دیتے بلکہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے گا بھیجے گا۔ (تبلیغی پاکٹ بک ص ۲۵۰)

"سورہ آل عمران مدنی سورۃ ہے اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کے کم از کم تیرہ سال بعد نازل ہوئی جبکہ پاک اور ناپاک میں ابوبکرؓ و ابوجہل میں۔ عمرؓ اور ابولہب میں۔ عثمانؓ اور عتبہ وشیبہ وغیرہ میں کافی تمیز ہو چکی تھی۔ مگر خدا تعالیٰ اس کے بعد فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ مومنوں میں پھر ایک دفعہ تمیز کرے گا۔ مگر اس طور سے نہیں کہ ہر مومن کو الہاماً بتادے کہ فلاں مومن اور فلاں منافق ہے بلکہ فرمایا کہ رسول بھیج کر ہم پھر ایک دفعہ یہ تمیز کریں گے۔

آنحضرت ﷺ کی آمد سے ایک دفعہ یہ تمیز ہوگئی اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے بعد ایک اور تمیز کرے گا۔ پس اس سے سلسلہ نبوت ثابت ہے۔ (ص ۲۵۰)

جواب نمبر ا:۔

آیت مذکورہ بالا کے ترجمہ میں ہے "بھیجے گا" سوال یہ ہے کہ مرزائی پنڈت نے یہ کس لفظ کا ترجمہ کیا ہے؟ اس آیت میں ایسا کوئی لفظ قطعاً نہیں جس کا ترجمہ کیا جائے (بھیجے گا) کسی نے ایسے ہی مترجم کے حق میں کیا خوب کہا ہے۔

ابلیس کے معین ہو تلبیس تیرا کام
انسانیت کو آج بھی بہکا رہے ہو تم

البتہ آیت میں اطلاع علی الغیب کی خبر ہے جو غیر نبی کو بھی مرزائیوں کے نزدیک ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ مرزا نے لکھا ہے۔

"یہ بھی ان کو معلوم رہے کہ تحقیق وجود الہام ربانی کے لئے جو خاص خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور امور غیبیہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک اور بھی راستہ کھلا ہوا ہے اور وہ یہ

> ہے کہ خدا تعالیٰ امت محمدیہ میں کہ جو سچے دین پر ثابت اور قائم ہیں۔ ہمیشہ ایسے لوگ پیدا کرتا ہے کہ جو خدا کی طرف سے ملہم ہو کر ایسے امور غیبیہ بتلاتے ہیں۔ جن کا بتلانا بجز خدائے واحد لاشریک کے کسی کے اختیار میں نہیں"۔ (براہین احمدیہ حصہ دوم ص ۲۳۸)

اس سے معلوم ہوا کہ غیر نبی کو بھی مرزائیوں کے نزدیک اطلاع علی الغیب ہوتی رہتی ہے اور اسی کتاب کے صفحہ ۸۰ پر مرزا نے لکھا ہے کہ "وحی رسالت بوجہ عدم ضرورت منقطع ہے"۔ نیز (رسل) میں عموم ہے اور قادیانیوں کا دعویٰ خاص ہے دعویٰ کے مطابق دلیل نہ ہونے کی وجہ سے یہ ان کی دلیل باطل ٹھہری۔ اور یجتبی میں اللہ فاعل ہے جس سے مستقل نبی کا چننا ثابت ہوتا ہے۔ جبکہ قادیانی لوگ مستقل نبی آنے کے قائل نہیں اس لئے بھی یہ دلیل قادیانیوں کے لئے مفید نہیں۔

۲۔ حکیم نورالدین نے یہی آیت مرزا کے مرنے پر پڑھ کر بیان کیا کہ یہ مومنوں کا امتحان اور جانچنا ہے اور دوسرے امتیاز بین المخلصین والمنافقین ہے۔ لہٰذا اس آیت سے صرف ابتلا مراد ہے جیسا کہ مرزا کی موت پر تم کو آزمائش میں ڈالا گیا۔ دیکھو

(ریویو آف ریلیجنز بابت جون، جولائی ۱۹۰۸ء ص ۲۴۵ ج ۷)

حکیم نورالدین نے اس آیت کو کسی نبی کے آنے پر نہیں پڑھا تھا کہ اجرائے نبوت ثابت ہو بلکہ مرزائیوں کے نبی کے جانے پر پڑھا تھا۔ مرزائی خلیفہ نے بھی ثابت کر دیا کہ اسے اجرائے نبوت کی دلیل بنانا حماقت ہے۔

۳۔ "حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ" میں مرزائیوں کا یہ کہنا کہ تمیز پہلے ہو چکی تھی یہ بھی غلط ہے کیوں کہ سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو نزول کے اعتبار سے آخری ہے "وَمِنْ اَھْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُھُمْ نَحْنُ نَعْلَمُھُمْ سَنُعَذِّبُھُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰی عَذَابٍ عَظِیْمٍ. (توبہ ۱۰۱) اس آیت میں ان منافقین کا ذکر ہے جنکا نفاق رسول اللہ ﷺ سے ابتک چھپا رہا تو یہ تمیز مومنوں اور منافقوں میں ہو کر رہے گی۔ اور یہ اللہ کے ذمہ ہے اور اللہ ہی کے علم میں ان منافقین کی تعیین ہے۔ اور اس کے لئے نبی کی بعثت شرط نہیں کہ مرزا جیسا کوڑھ مغز نبی بنتا پھرے۔

۴- اجتباء کا معنی کسی لغت کی کتاب میں بھیجنا نہیں ہے۔ یجتبی کا ترجمہ 'بھیجے گا' کرنا بہت بڑی جہالت ہے۔ سچ ہے۔

جاہل تو تم ضرور ہو، کاہل مگر نہیں
دنیا میں کفریات کو پھیلا رہے ہو تم

آیت کا صحیح ترجمہ اور مطلب یہ ہے۔

''اور اللہ ایسا نہیں کہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر (اے گروہ کفار ومنافقین) تم ہو (بلکہ خدا انہیں اس حالت سے بلند کرنا چاہتا ہے) یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔ (اور مومنین سے ہر قسم کی ایمانی اور عملی کمزوریاں دور کر دے) اور اللہ تعالیٰ ایسا بھی نہیں کہ تم کو (اپنی ہدایت وقوانین کے) غیب پر اطلاع دے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (اس مرتبہ پر) منتخب فرمالیتا ہے (جیسا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو چنا) سو تم اللہ اور اسکے رسولوں پر ایمان لاؤ اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہیں بڑا اجر ملے گا''۔

گویا اس آیت میں رسولوں کا سلسلہ جاری رکھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ چہ جائیکہ اس آیت سے حضور ﷺ کے بعد اجرائے نبوت پر استدلال کیا جائے۔

۵- سوال کرنے والوں نے کہا تھا کہ ہمیں فرداً فرداً غیب پر کیوں اطلاع نہیں دی جاتی؟۔ جواب میں فرمایا 'یہ رسول کا کام ہے۔' آئندہ بعثت رسل کے متعلق نہ کسی نے سوال کیا نہ جواب دیا گیا۔ لہذا اس سے آئندہ بعثت رسل پر استدلال کرنا بکواس ہے۔

۶- یہ کہنا کہ آئندہ رسول آئیگا یہ مطلب رکھتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ خبیث وطیب میں امتیاز نہیں ہوا، غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید فرماتا ہے۔ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔ الاعراف ۱۵۷ ''جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ (بنی اسرائیل ۸۱) حق آ گیا اور باطل ہلاک ہو گیا۔ بیشک باطل ہلاک ہونے والا ہی تھا۔ پس حق وباطل میں حضور ﷺ کے ذریعہ امتیاز قائم ہو چکا ہے۔ اس لئے اب کسی اور رسول کی ضرورت نہیں رہی۔

کیا فرماتے ہیں مفسرین

معارف القرآن ۔ (ص ۲۴۷۔۲۴۸ ج ۲)

بیان القرآن :۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتا جس پر تم اب ہو (کہ کفر و ایمان اور حق و باطل اور مؤمن و منافق میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے انعامات دینوی کے اعتبار سے کوئی امتیاز اور فرق نہیں، بلکہ مسلمانوں پر شدائد و مصائب کا نازل ہوتے رہنا اس وقت تک ضروری ہے) جب تک کہ ناپاک (یعنی منافق) کو پاک (یعنی مؤمن مخلص) سے ممتاز نہ کر دیا جائے (اور یہ تمیز و تعیین مصائب و مشکلات ہی کے پیش آنے پر پوری طرح ہو سکتی، اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مومن و کافر اور حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے کیا ضروری ہے کہ حوادث و مصائب ڈال کر ہی یہ امتیاز حاصل کیا جائے، اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اس کا اعلان فرما سکتے ہیں کہ فلاں مؤمن مخلص ہے اور فلاں منافق، اور فلاں چیز حلال ہے فلاں حرام، تو اسکا جواب یہ کہ اللہ تعالیٰ (بمقتضائے حکمت) ایسے امور غیبیہ پر تم کو (بلا واسطہ ابتلاء و امتحان کے) مطلع نہیں کرنا چاہتے، لیکن ہاں جسکو (اس طرح مطلع کرنا) خود چاہیں اور (ایسے حضرات) وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں ان کو (بلا واسطہ حوادث بھی غیبی خبروں پر مطلع کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے) منتخب فرما لیتے ہیں، (اور تم پیغمبر ہو نہیں، اس لئے ایسے امور کی تمہیں اطلاع نہیں دی جا سکتی، البتہ ایسے حالات پیدا فرماتے ہیں کہ ان سے مخلص و منافق کا فرق خود بخود واضح ہو جائے، اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ دنیا میں کافروں پر عذاب نازل نہ ہونا بلکہ عیش عشرت ملنا اور مسلمانوں پر بعض مصائب و شدائد نازل ہونا عین تقاضائے حکمت ہے، یہ باتیں کسی کے مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی) پس اب تم (ایمان کے پسندیدہ اور کفر کے ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہ کرو، بلکہ)

اللہ پر اور اسکے سب رسولوں پر ایمان لے آؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور (کفر و معاصی سے) پرہیز رکھو تو پھر تم کو اجر عظیم ملے،

معارف و مسائل:

مؤمن و منافق میں امتیاز وحی کے بجائے عملی طور پر کرنے کی حکمت

اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ مؤمن مخلص اور منافق میں امتیاز کے لئے حق تعالیٰ ایسے حالات حوادث و مشکلات کے پیدا فرماتے ہیں جن سے عملی طور پر منافقین کا نفاق کھل جائے، اور یہ امتیاز اگرچہ یوں بھی ہوسکتا تھا کہ بذریعہ وحی منافقین کے نام متعین کر کے بتلا دیا جائے، مگر بمقتضائے حکمت ایسا نہیں کیا گیا اللہ تعالیٰ کے افعال کی پوری حکمتیں تو اسی کو معلوم ہیں، ہاں ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو بذریعہ وحی بتلا دیا جائے کہ فلاں منافق ہے تو مسلمانوں کو اس سے قطع تعلق اور معاملات میں احتیاط کیلئے کوئی ایسی واضح حجت نہ ہوتی جس کو منافق بھی تسلیم کر لیں، وہ کہتے کہ تم غلط کہتے ہو ہم تو پکے سچے مسلمان ہیں۔

بخلاف اس کے عملی امتیاز کے جو مصائب کے ابتلاء کے ذریعہ ہوا کہ منافق بھاگ کھڑے ہوئے عملی طور پر انکا نفاق کھل گیا، اب ان کا یہ منہ نہیں رہا کہ مؤمن مخلص ہونے کا دعویٰ کریں۔

اور اس طرح نفاق کھل جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کا ان کے ساتھ ظاہری اختلاط بھی قطع ہو ورنہ دل میں اختلاف کے باوجود ظاہری اختلاط رہتا تو وہ بھی مضر ہی ہوتا۔

امور غیب پر کسی کو مطلع کر دیا جائے تو وہ علم غیب نہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ امور غیب پر بذریعہ وحی اطلاع ہر شخص کو نہیں دیتے، البتہ اپنے انبیاء کا انتخاب کر کے ان کو دیتے ہیں، اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ

پھر تو انبیاء بھی علم غیب کے شریک اور عالم الغیب ہو گئے کیونکہ وہ علم غیب جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو اس میں شریک قرار دینا شرک ہے، وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک یہ کہ وہ علم ذاتی ہو کسی دوسرے کا دیا ہوا نہ ہو، دوسرے تمام کائنات ماضی و مستقبل کا علم محیط ہو، جس سے کسی ذرے کا علم بھی مخفی نہ ہو، حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاء کو جو امور غیبیہ بتلاتے ہیں وہ حقیقۃً علم غیب نہیں ہے بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو انبیاء کو دی گئی ہیں جن کو خود قرآن کریم نے کئی جگہ انباء الغیب کے لفظ سے تعبیر فرمایا: مِن انبآء الغیبِ نوحیھا الیک،

تفسیر ماجدی۔

ترجمہ: جس حال پر تم ہو اللہ اس پر ایمان والوں کو چھوڑے رکھنے کا نہیں جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر لے ۶۸؎۔ اور نہ اللہ تمہیں غیب پر مطلع کرنے والا ہے ۶۹؎ البتہ جس کو چاہتا ہے اپنے رسولوں میں سے انتخاب کر لیتا ہے۔ ۷۰؎

تفسیر:۔

۶۸؎۔ (طرح طرح کے امتحانوں سے اور آزمائشوں کے ذریعہ سے) خطاب عام نوع انسانی سے ہے۔ علی ما انتم ایھا الناس (جلالین) لیذر۔ میں لِ تاکید نفی کے لئے ہے۔ اللام لتاکید النفی (مدارک) ما انتم علیہ۔ (یعنی مومنین و منافقین کی ملی جلی قوم) ما انتم علیہ من اختلاط المؤمن المخلص والمنافقین (مدارک) معنی لا یترککم مختلطین لا یعرف مخلصکم من منافقکم (بیضاوی) الخبیث اور الطیب سے ظاہر مراد منافقین اور مومنین ہیں۔

۶۹؎۔ (مثلاً یہی کہ وہ بتلا دے کہ فلاں فلاں شخص منافق ہیں اور فلاں فلاں مومن) یہ منافقین کے جواب میں ارشاد ہوا ہے جو مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ اچھا بڑے سچے بنتے ہو تو یہی بتا دو کہ منافق کون کون سے ہیں۔ لیطلعکم میں خطاب عالم

انسانی سے ہے یا صرف مسلمانوں سے ۔ الغیب سے تکوینی حقیقتیں مراد ہوسکتی ہیں جو اس سے پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔

۳۵۰ بعض امور غیب کی اطلاع کے لئے) من یشاء ۔ یعنی جسے وہ چاہتا ہے اپنی مصلحت وحکمت تکوینی کے ماتحت ۔ متکلمین نے کہا ہے کہ آیت نص ہے عقیدہ باطنیہ کے مقابلہ میں جو علم غیب کا اثبات علاوہ رسول کے اپنے امام کے لئے بھی کرتے ہیں۔ الآیة حجة علی الباطنیة فلهم یدعون ذالک العلم لامامهم (مدارک)

ترجمہ کنزالایمان۔

ترجمہ: اللہ مسلمانوں کو اس حال پر چھوڑنے کا نہیں جس پر تم ہو ۳۵۱ جب تک جدا نہ کردے گندے کو ۳۵۲ ستھرے سے ۳۵۳ اور اللہ کی شان یہ نہیں کہ اے عام لوگو تمہیں غیب کا علم دے ہاں اللہ چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہے ۳۵۴۔

تفسیر:۔

۳۵۱ اے کلمہ گویان اسلام ۳۵۲ یعنی منافق کو ۔ ۳۵۳ مومن مخلص سے یہاں تک کہ اپنے نبی ﷺ کو تمہارے احوال پر مطلع کرکے مومن منافق ہر ایک کو ممتاز فرمادے۔

شان نزول:۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ خلقت وآفرینش سے قبل جبکہ میری امت مٹی کی شکل میں تھی اسی وقت وہ میرے سامنے اپنی صورتوں میں پیش کی گئی اور مجھے علم دیا گیا کون مجھ پر ایمان لائے گا کون کفر کریگا یہ خبر جب منافقین کو پہونچی تو براہ استہزاء انھوں نے کہا کہ محمد مصطفی ﷺ کا گمان ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ جو لوگ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے ان میں سے کون ان پر ایمان لائیگا کون کفر کرے گا باوجودیکہ ہم ان کے ساتھ ہیں اور وہ ہمیں نہیں پہچانتے اس پر سید عالم ﷺ نے ممبر پر قیام فرما کر اللہ تعالی کی حمد

وثنا کے بعد فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہے جو میرے علم میں طعن کرتے ہیں آج سے قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اس میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا تم مجھ سے سوال کرو اور میں تمہیں اس کی خبر نہ دے دوں۔ عبداللہؓ بن حذافہ سہمی نے کھڑے ہوکر کہا میرا باپ کون ہے یا رسول اللہ فرمایا حذافہؓ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے انھوں نے فرمایا یا رسول اللہ ہم اللہ کی ربوبیت پر راضی ہوئے اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوئے قرآن کے امام ہونے پر راضی ہوئے آپ کے نبی ہونے پر راضی ہوئے ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں حضور نے فرمایا کیا تم باز آؤ گے کیا تم باز آؤ گے پھر ممبر سے اتر آئے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سید عالم ﷺ کو قیامت تک کی تمام چیزوں کا علم عطا فرمایا گیا ہے اور حضور کے علم غیب میں طعن کرنا منافقین کا طریقہ ہے۔ ص ۳۵۷ تو ان برگزیدہ رسولوں کو غیب کا علم دیتا ہے اور سید انبیاء حبیب خدا ﷺ رسولوں میں سب سے افضل اور اعلیٰ ہیں اس آیت سے اور اس کے سوا بکثرت آیات واحادیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو غیوب کے علوم عطا فرمائے اور غیوب کے علم آپ کا معجزہ ہیں۔

تفسیر ثنائی۔

ترجمہ: اللہ کو منظور نہیں کہ مومنوں کو تمہاری موجودہ حالت پر چھوڑ رکھے جب تک کہ ناپاک کو پاک سے علیحدہ نہ کرے۔ اللہ کو منظور نہیں کہ تمہیں غیب کی خبر بتلا دے ہاں خدا اپنے رسولوں کو اطلاع کے لئے چن لیتا ہے۔

تفسیر:۔

اللہ کو منظور نہیں کہ مومنوں کو تمہاری موجودہ حالت پر چھوڑ رکھے جب تک کہ بسبب تکالیف چند در چند کے ناپاک کو پاک سے علیحدہ نہ کرے جس سے تم کو دوست دشمن میں تمیز ہو جائے اور بغیر ان تکالیف کے اللہ کو منظور نہیں کہ تمہیں غیب کی خبر

بتلادے کہ فلاں شخص تم میں منافق ہے اور فلاں شخص ضعیف الایمان ہے ہاں خدا اپنے رسولوں کو اس اطلاع کے لئے چن لیا کرتا ہے سو ان کو بتلا دیتا ہے کہ فلاں شخص منافق ہے فلاں تمہارا دشمن ہے اس کے داؤ سے بچتے رہیو۔ (در حاشیہ۔ من وسلطہ میں من بیانیہ ہے)

تفہیم القرآن ۔ (ص ۳۰۵ ج ۱)

ترجمہ: اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو ۱۲۵۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کرکے رہے گا مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے ۱۲۶۔ غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔

تفسیر۔

۱۲۵۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جماعت کو اس حال میں دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ ان کے درمیان سچے اہل ایمان اور منافق' سب خلط ملط ہیں۔ ۱۲۶۔ یعنی مومن و منافق کی تمیز نمایاں کرنے کے لئے اللہ یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کرتا کہ غیب سے مسلمانوں کو دلوں کا حال بتادے کہ فلاں مومن ہے اور فلاں منافق' بلکہ اس کے حکم سے ایسے امتحان کے مواقع پیش آئیں گے جن میں تجربہ سے مومن اور منافق کا حال کھل جائے گا۔

جامع البیان طبری: (ص ۱۷۹۔۱۸۰ ج ۴)

يعني بقوله: ﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ما كان الله ليدع المؤمنين على ما أنتم عليه من التباس المؤمن منكم بالمنافق، فلا يعرف هذا من هذا﴿حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ يعني بذلك: حتى يميز الخبيث، وهو المنافق المستسر للكفر، من الطيب، وهو المؤمن المخلص الصادق الإيمان بالمحن والاختبار، كما ميز بينهم يوم أحد عند لقاء العدو عند خروجهم إليه.

واختلف أهل التأويل في الخبيث الذي عنى الله بهذه الآية، فقال بعضهم فيه مثل قولنا. ذكر من قال ذلك:

۲۵۹۰ ـ حدثني محمد بن عمرو، قال: ثني أبو عاصم، عن عيسى، عن ابن أبي نجيح، عن مجاهد، في قول الله ﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ قال ميز بينهم يوم أحد، المنافق من المؤمن.

۲۵۹۱ ـ حدثنا القاسم، قال: ثنا الحسين، قال ثني حجاج، عن ابن جريج: ﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ قال ابن جريج: يقول: ليبين الصادق بإيمانه من الكاذب. قال ابن جريج: قال مجاهد: يوم أحد ميز بعضهم عن بعض، المنافق عن المؤمن.

۲۵۹۲ ـ حدثنا ابن حميد، قال: ثنا سلمة، عن ابن إسحاق: ﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾: أي المنافق.

وقال آخرون: معنى ذلك: حتى يميز المؤمن من الكافر بالهجرة والجهاد. ذكر من قال ذلك:

۲۵۹۳ ـ حدثنا بشر، قال: ثنا يزيد، قال: ثنا سعيد، عن قتادة، قوله: ﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ﴾ يعني: الكفار. يقول: لم يكن الله ليدع المؤمنين على ما أنتم عليه من الضلالة، ﴿حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾: يميز بينهم في الجهاد والهجرة.

۲۵۹۴ ـ حدثنا الحسن بن يحي، قال أخبرنا عبد الرزاق، قال: أخبرنا معمر، عن قتادة في قوله: ﴿حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ قال: حتى يميز الفاجر من المؤمن.

۲۵۹۵ ـ حدثنا محمد، قال: ثنا أحمد، قال: ثنا أسباط، عن السدي: ﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ قالوا: إن كان محمد صادقاً فليخبرنا بمن يؤمن بالله ومن يكفر!

فأنزل الله: ﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾: حتى يخرج المؤمن من الكافر.

والتأويل الأول أولى بتأويل الآية، لأن الآيات قبلها في ذكر المنافقين وهذه في سياقتها، فكونها بأن تكون فيهم أشبه منها بأن تكون في غيرهم.

القول في تأويل قوله تعالى: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ﴾

اختلف أهل التأويل في تأويل ذلك، فقال بعضهم بما:

۲۵۹۶—حدثنا به محمد بن الحسين، قال: ثنا أحمد بن مفضل، قال: ثنا أسباط، عن السدي: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾وما كان الله ليطلع محمداً على الغيب، ولكن الله اجتباه فجعله رسولاً.

وقال آخرون بما:

۲۵۹۷—حدثنا به ابن حميد، قال: ثنا سلمة، عن ابن إسحاق: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾أي فيما يريد أن يبتليكم به،لتحذروا ما يدخل عليكم فيه: ﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ﴾ يعلمه.

وأولى الأقوال في ذلك بتأويله: وما كان الله ليطلعكم على ضمائر قلوب عباده، فتعرفوا المؤمن منهم من المنافق والكافر، ولكنه يميز بينهم بالمحن والابتلاء كما ميز بينهم بالبأساء يوم أحد، وجهاد عدوه، وما أشبه ذلك من صنوف المحن،حتى تعرفوا مؤمنهم وكافرهم ومنافقهم. غير أنه تعالى ذكره يجتبي من رسله من يشاء، فيصطفيه، فيطلعه على بعض ما في ضمائر بعضهم بوحيه ذلك إليه ورسالته. كما:

۲۵۹۸—حدثنا محمد بن عمرو، قال: ثنا أبو عاصم، عن عيسى عن ابن أبي نجيح، عن مجاهد في قوله: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ﴾قال: يخلصهم لنفسه.

وإنما قلنا هذاالتأويل بتأويل الآية، لأن ابتداءها خبر من الله تعالى ذكره أنه غيرتارك عباده يعني بغير محن حتى يفرق بالابتلاء بين مؤمنهم وكافرهم وأهل نفاقهم. ثم عقب ذلك بقوله: ﴿وما كان ليطلعكم على

الغيب﴾، فكان فيما افتتح به من صفت إظهار الله نفاق المنافق وكفر الكافر، دلالة واضحة على أن الذي ولي ذلك هو الخبر عن أنه لم يكن ليطلعهم على ما يخفي عنهم من باطن سرائرهم إلا بالذي ذكر أنه مميز به نعتهم إلا من استثناه من رسله الذي خصه بعلمه.

تفسیر کشاف:۔

﴿على ما أنتم عليه﴾من اختلاط المؤمنين الخلص والمنافقين ﴿حتىٰ يميز الخبيث من الطيب﴾حتىٰ يعزل المنافق عن الخلص، وقرىء يميز من ميز، وفي رواية عن ابن كثير يميز من أ ماز بمعنىٰ ميز، فان قلت : لمن خطاب في أنتم؟ قلت: للمصدقين جميعامن أهل الأخلاص والنفاق كانه قيل : ماكان الله ليذر المخلصين منكم على الحال التي أنتم عليها من اختلاط بعضكم ببعض، وأنتم لايعرف مخلصكم من منافقكم لاتفاقكم على التصديق جميعاحتى يميزهم منكم بالوحي الىٰ نبيه واخباره بأحوا لكم، ثم قال﴿وماكان الله ليطلعكم على الغيب﴾اى وماكان الله ليؤتي احد ا منكم على الغيوب فلا تتوهمواعند أخبارالرسول عليه الصلاة والسلام بنفاق الرجل وأخلاص الآخر أنه يطلع على ما في القلوب اطلاع الله فيخبر عن كفرها وايمانها﴿ولكن الله﴾ يرسل الرسول فيوحي اليه ويخبره با ن في الغيب كذاوان فلانا في قلبه النفاق وفلانا في قلبه الأخلاص فيعلم ذلك من جهة أخبارالله لا من جهة اطلاعه على المغيبات، ويجوز أن يراد لايترككم مختلطين حتى يميز الخبث من الطيب بان يكلفكم التكاليف الصعبة التي لا يصبر عليها الا الخلص الذين امتحن الله قلوبهم كبذل الارواح في الجهاد وانفاق الاموال في سبيل الله، فيجعل ذلك عيارا على عقائدكم وشاهدا بضمائركم حتى يعلم بعضكم ما في قلب بعض من طريق الاستدلال، لا من جهة الوقوف على ذات الصد و ر والاطلاع عليها، فان ذالك مما استاثر الله به وما كان الله ليطلع احد ا منكم على الغيب ومضمرات القلوب حتى يعرف صحيحها من فاسد ها مطلعا عليها ﴿ولكن الله يجتبي من رسله من يشاء﴾فيخبره ببعض المغيبات.

تفسیر معالم التنزیل (ص ۲۷۷ ج ۱)

قوله تعالى: ﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ اختلفوا فيها، فقال الكلبي: قالت قريش: يامحمد تزعم أن من خالفك فهو في النار والله عليه غضبان، وأن من اتبعك على دينك فهو في الجنة، والله عنه راض، فأخبرنا بمن يؤمن بك وبمن لايؤمن بك، فأنزل الله تعالى هذه الآية، وقال السدي: قال رسول الله ﷺ: "عُرضت عليّ أمتي في صورها في الطين كما عرضت على آدم، و أُعلمتُ من يؤمن بي ومن يكفر بي"، فبلغ ذلك المنافقين، فقالوا استهزاءً: زعم محمد أنه يعلم من يؤمن به ومن يكفر ممن لم يخلق بعد، ونحن معه وما يعرفنا، فبلغ ذلك رسول الله ﷺ، فقام على المنبر فحمد الله وأثنى عليه، ثم

قال: "ما بال أقوام طعنوا في علمي لاتسألوني عن شيء فيما بينكم وبين الساعة إلاأنبأتكم به" فقام عبد الله بن حُذافة السهمي، فقال: من أبي يارسول الله؟ قال: حذافة، فقام عمر فقال: يارسول الله رضينا بالله ربًا و بالإسلام دينًا وبالقرآن إمامًا وبك نبيًا فاعفُ عنا عفاالله عنك، فقال النبي ﷺ: فهل أنتم منتهون؟ ثم نزل عن المنبر، فأنزل الله تعالى هذه الآية، واختلفوا في حكم الآية ونظمها، فقال ابن عباس رضي الله عنهما والضحاك ومقاتل والكلبي وأكثر المفسرين: الخطاب للكفار والمنافقين، يعني: ﴿ماكان الله ليذر المؤمنين علىٰ ماأنتم عليه﴾ يا معشر الكفار والمنافقين من الكفر والنفاق ﴿حتى يميز الخبيث من الطيب﴾ وقال قوم: الخطاب للمؤمنين الذين أخبر عنهم، معناه: ماكان الله ليذركم يامعشر المؤمنين على ماأنتم عليه من التباس المؤمن بالمنافق، فرجع من الخبر إلى الخطاب، ﴿حتى يميز الخبيث من الطيب﴾ وقرأ حمزة والكسائي ويعقوب بضم الياء وتشديدها وكذلك التي في الأنفال، وقرأ الباقون بالتخفيف، يقال: مازالشيء يميزه ميزاً وميزه

تمييزاً إذا فرّقه فامتاز، وإنما هو بنفسه، قال أبو معاذ إذا فرّقت بين شيئين قلت: مزت ميزاً فإذا كانت أشياء، قلت: ميزتها تمييزاً، وكذلك إذا جعلت الشيء الواحد شيئين قلت: فَرقتُ بالتخفيف، ومنه فرقت الشعر، فإن جعلته أشياء، قلت: فرقته تفريقاً ومعنى الآية: حتى يميز المنافق من المخلص، فميز الله المؤمنين من المنافقين يوم أحد حيث أظهروا النفاق فتخلّفوا عن رسول الله ﷺ، وقال قتادة: حتى يميز الكافر من المؤمن بالهجرة والجهاد، وقال الضحاك: ﴿ما كان الله ليذر المؤمنين على ما أنتم عليه﴾ في أصلاب الرجال وأرحام النساء يامعشر المنافقين والمشركين حتى يفرّق بينكم وبين من في أصلابكم وأرحام نسائكم من المؤمنين، وقيل: ﴿حتى يميز الخبيث﴾ وهو المذنب ﴿من الطيب﴾ وهو المؤمن، يعني: حتى تحط الأوزار عن المؤمن بما يصيبه من نكبة ومحنة ومصيبة، ﴿وما كان الله ليُطلعكم على الغيب﴾ لأنه لا يعلم الغيب أحد غير الله ﴿ولكن الله يجتبي من رسله من يشاء﴾ فيطلعه على الغيب، نظيره قوله تعالى: ﴿عالمُ الغيبِ فلا يُظهر على غيبه أحداً إلا من ارتضى من رسولٍ﴾ وقال السدي: معناه وما كان الله ليطلع محمداً ﷺ على الغيب ولكن الله اجتباه، ﴿فآمنوا بالله و إن تؤمنوا وتتقوا فلكم أجرٌ عظيم﴾

تفسیر کبیر (ص۳۳۱ ج۳)

اعلم أن هذه الآية من بقية الكلام في قصة أحد فأخبر تعالى أن الأحوال التي وقعت في تلك الحادثة من القتل والهزيمة، ثم دعاء النبي ﷺ اياهم مع ماكان بهم من الجراحات الي الخروج لطلب العدو، ثم دعائه اياهم مرة أخرى الي بدر الصغرى لموعد أبي سفيان، فأخبر تعالى أن كل هذه الأحوال صار دليلا على امتياز المؤمن من المنافق، لان المنافقين خافوا ورجعوا و شمتوا بكثرة القتلى منكم، ثم ثبطوا وزهدوا المؤمنين عن العود إلي الجهاد، فأخبر سبحانه و تعالى أنه لا يجوز في حكمته أن يذركم على ما أنتم عليه من اختلاط المنافقين بكم وإظهارهم

أنهم منكم ومن أهل الايمان بل كان يجب في حكمته إلقاء هذه الحوادث والوقائع حتى يحصل هذا الامتياز، فهذا وجه النظم. وفي الآية مسائل:

المسألة الأولى: قرأ حمزة والكسائي:﴿حتى يميز الخبيث﴾ بالتشديد وكذلك في الانفال والباقون ﴿يميز﴾ بالتخفيف وفتح الياء الأولى وكسر الميم وسكون الياء الأخيرة، قال الواحدي رحمه الله: وهما لغتان يقال مزت الشيء بعضه من بعض فأنا أميزه ميزا او أميزه تمييزاً ومنه الحديث "من مازأذى عن طريق فهوله صدقة" وحجة من قرأ بالتخفيف وفتح الياء أن الميز يفيد فائدة التمييز وهو أخف في اللفظ فكان أولى، وحكى أبوزيد عن أبيعمروأنه كان يقول: التشديد للكثرة، فاما واحد من واحد فيميزبالتخفيف، والله تعالى قال: ﴿حتى يميزالخبيث من الطيب﴾فذكرشيئين، وهذا كما قال بعضهم فيالفرق والتفريق، وأيضاقال تعالى:﴿وامتازواليوم ﴾[يس:٥٩]وهو مطاوع الميز، وحجة من قرأ بالتشديد: أن التشديد للتكثير والمبالغة، وفي المؤمنين والمنافقين كثرة، فلفظ التمييز ههنا أولى، ولفظ الطيب والخبيث وان كان مفردا إلا أنه للجنس، فالمراد بهما جميع المؤمنين والمنافقين لااثنان منهما.

المسألة الثانية: قد ذكرنا أن معنى الآية: ما كان الله ليذركم يامعشر المؤمنين على ماأنتم عليه من اختلاط المؤمن بالمنافق واشباهه حتى يميز الخبيث من الطيب، أي المنافق من المؤمن. واختلفوا بأي شيء ميز بينهم وذكروا وجوها: أحدها: بالقاء المحن و المصائب والقتل والهزيمة، فمن كان مؤمنا ثبت على إيمانه وعلى تصديق الرسولﷺ، ومن كان منافقا ظهر نفاقه وكفره. وثانيها: أن الله وعد بنصرة المؤمنين وإذلال الكافرين، فلما قوي الاسلام عظمت دولته وذل الكفر وأهله، وعند ذلك حصل هذا الامتياز وثالثها: القرائن الدالة على ذلك، مثل ان المسلمين كانوا يفرحون بنصرة الاسلام وقوته، والمنافقين كانوا يغتمون بسبب ذلك.

المسألة الثالثة: ههناسؤال، وهوأن هذا التميزإن ظهر وانكشف فقد ظهركفرالمنافقين، وظهورالكفر منهم ينفي كونهم منافقين، وان لم يظهرلم يحصل موعودالله.

تفسیر ابن کثیر (ص۵۶۳ ج۱)

قال تعالى: ﴿ما كان الله ليذر المؤمنين على ما أنتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب﴾ أي لابد أن يعقد سبباً من المحنة، يظهر فيه وليه و يفضح به عدوه، يعرف به المؤمن الصابر، و المنافق الفاجر، يعني بذلك يوم أحد الذي امتحن الله به المؤمنين، فظهر به إيمانهم و صبرهم و جلدهم وثباتهم وطاعتهم لله ولرسوله ﷺ، وهتك به ستر المنافقين. فظهر مخالفتهم ونكولهم عن الجهاد وخيانتهم لله ولرسوله ﷺ ولهذا قال تعالى: ﴿ما كان الله ليذر المؤمنين على ما أنتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب﴾ قال مجاهد: ميز بينهم يوم أحد، وقال قتادة: ميز بينهم بالجهاد و الهجرة، وقال السدي: قالوا: إن كان محمد صادقاً فليخبرنا عمن يؤمن به منا ومن يكفر، فأنزل الله تعالى: ﴿ما كان الله ليذر المؤمنين على ما أنتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب﴾ أي حتى يخرج المؤمن من الكافر، روى ذلك كله ابن جرير. ثم قال تعالى ﴿وما كان الله ليطلعكم على الغيب﴾ أي أنتم لا تعلمون غيب الله في خلقه حتى يميز لكم المؤمن من المنافق لولا ما يعقده من الأسباب الكاشفة عن ذلك. ثم قال تعالى: ﴿ولكن الله يجتبي من رسله من يشاء﴾ كقوله تعالى: ﴿عالم الغيب فلا يظهر على غيبه أحداً إلا من ارتضى من رسول فإنه يسلك من بين يديه ومن خلفه رصدا﴾ ثم قال تعالى: ﴿فآمنوا بالله ورسله﴾ أي أطيعوا الله ورسول واتبعوه فيما شرع لكم ﴿وإن تؤمنوا وتتقوا فلكم أجر عظيم﴾

آیت۔(۶)

مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰہِ وَکَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیْمًا" (نساء ۶۹)

ترجمہ:۔جوکوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا، سو وہ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید اور نیک بخت ہیں۔اور اچھی ہے ان کی رفاقت۔یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے۔اور اللہ کافی ہے جاننے والا۔

خلاصہ:۔

آیت کے شان نزول سے ثابت ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت پر مطیع اور فرمانبردار بندوں کو آخرت کی زندگی میں محض فضل خداوندی سے اُن لوگوں کی رفاقت ملے گی جن پر دنیا میں بھی خدا کا فضل وانعام رہا ہے۔اور وہ منعم علیہم لوگ چار طرح کے ہیں ایک نبی، دوسرے صدیق، تیسرے شہید، چوتھے صالح اور پابند شرع لوگ۔گویا اس آیت کے ذریعہ اللہ رب العزت اپنے نیک بندوں کو خوشخبری بھی دے رہے ہیں اور نیکی کی طرف ترغیب بھی۔رہی یہ بات کی اطاعت خداوندی اور فرمانبرداری کے ذریعہ بندہ کیا کیا رتبے پاسکتا ہے اور کس درجے تک پہنچ سکتا ہے؟ اس سوال کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں اس کا جواب ایک دوسری آیت میں دیا گیا ہے۔وہ یہ ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ۔الحدید۱۹۔ان دونوں آیتوں میں فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے قادیانی گمراہ ہوئے ہیں۔اللھم احفظنا منہ۔

اٹھو مومنو! آج سے عہد کرلو حبیب خدا کی اطاعت کروگے
عقیدت کے پہلو بہ پہلو عمل سے حقیقت میں تعمیل سنت کروگے
وہ تابندہ اسلام جو رہ گیا ہے کتابوں کی اوراق میں دفن ہوکر
وفا کیشیوں سے جفاکوشیوں سے زمانہ میں اسکی اشاعت کروگے۔

قادیانی استدلال:۔

جو اطاعت کریں گے اللہ کی اور اسکے اس رسول (محمد ﷺ) کی پس وہ ان میں شامل ہوجائیں گے جن پر اللہ نے انعام کیا یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالح اور یہ ان کے

اچھے ساتھی ہونگے۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے امت محمدیہ میں طریق حصول نعمت اور تحصیل نعمت کو بیان کیا ہے آیت میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیروی سے ایک انسان صالحیت کے مقام سے ترقی کر کے نبوت کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ (تبلیغ پاکٹ بک ص ۲۵۹)

جواب ا۔

آیت مبارکہ میں نبوت ملنے کا ذکر نہیں۔ اور نہ ہی اس کے کسی اور درجے کے ملنے کا یہاں ذکر ہے یہاں تو محض معیت اور رفاقت کا ذکر ہے کہ اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرنے والے مذکورہ بالا چار لوگوں کے ساتھ ہونگے۔ جیسا کہ آیت کے آخری الفاظ "حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا" سے ظاہر ہے۔

جواب ۲۔ آیت میں معیت مراد ہے عینیت نہیں معیت فی الدنیا ہر مومن کو حاصل نہیں اسلئے اس سے معیت فی الآخرۃ ہی مراد ہے۔ چنانچہ مرزائیوں کے مسلمہ دسویں صدی کے مجدد امام سیوطیؒ نے اپنی تفسیر جلالین میں اس آیت کا شان نزول یہ لکھا ہے:

قال بعض الصحابة للنبي ﷺ كيف نراك في الجنة وانت في الدرجات العلى. ونحن اسفل منك فنزل ومن يطع الله والرسول فيما امر به فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبين والصديقين .افاضل اصحاب الانبياء لمبالغتهم في الصدق والتصديق . والشهداء القتلى في سبيل الله والصالحين غير من ذكر وحسن اولئك رفيقاً.رفقاء في الجنة بان يستمتع فيها برويتهم وزيارتهم والحضور معهم وان كان مقرهم في درجات عالية (جلالین ص ۸۰)

بعض صحابہ کرام نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ جنت کے بلند وبالا مقامات پر ہونگے اور ہم جنت کے نچلے درجات میں ہونگے تو آپ کی زیارت کیسے ہوگی؟ تو یہ آیت نازل ہوئی من یطع اللہ والرسول... یہاں رفاقت سے مراد جنت کی رفاقت ہے کہ صحابہ کرامؓ انبیاء علیہم السلام کی زیارت وحاضری سے فیضیاب ہونگے اگرچہ ان (انبیاء) کا قیام بلند وبالا مقام پر ہوگا۔

اسی طرح امام فخر الدین رازیؒ نے لکھا ہے:

"من يطع الله والرسول ذكروا في سبب النزول وجوهاً الاول روى جمع من المفسرين ان ثوبانؓ مولى رسول الله ﷺ كان شديد الحب

لرسول اللہ ﷺ قلیل الصبر عنه فاتاه یوما وقد تغیر وجهه ونحل جسمه وعرف الحزن فی وجهه فسئله رسول اللہ ﷺ عن حاله فقال یا رسول اللہ ما بی وجع غیر انی اذا لم اراک اشتقت الیک واستوحشت وحش شدید حتی القاک فذکرت الآخرة فخفت ان لا اراک هناک لانی ان ادخلت الجنة فانت تکون فی الدرجات النبیین وانا فی الدرجة العبید فلا اراک وان انا لم ادخل الجنة فحینئذ لا اراک ابدا فنزلت هذه الآیة : من یطع اللہ.

اس آیت کے کئی اسباب مفسرین نے ذکر کئے ہیں ان میں پہلا یہ ہے کہ حضرت ثوبانؓ جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے وہ آپ ؐ کے بہت زیادہ شیدائی تھے (جدائی) پر صبر نہ کر سکتے تھے ایک دن غمگین صورت بنائے رحمت دو عالم ﷺ کے پاس آئے ان کے چہرے پر حزن وملال کے اثر تھے۔ آپ ﷺ نے وجہ دریافت فرمائی۔ تو انھوں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ بس اتنا ہے کہ آپ ﷺ کو اگر نہ دیکھوں تو اشتیاق ملاقات میں بے قراری بڑھ جاتی ہے۔ آپ کی زیارت ہوئی آپ نے قیامت کا تذکرہ کیا تو سوچتا ہوں کہ جنت میں داخلہ ملا بھی تو آپ ﷺ سے ملاقات کیسے ہوگی۔ اس لئے کہ آپ تو انبیاء کے درجات میں ہو نگے۔ اور ہم آپ ﷺ کے غلاموں کے درجہ میں۔ اور اگر جنت میں سرے سے میرا داخلہ ہی نہ ہوا تو پھر ہمیشہ کے لئے ملاقات سے گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

معلوم ہوا کہ اس معیت سے مراد جنت کی رفاقت ہے۔ ابن کثیر، تنویر المقیاس، روح البیان میں بھی تقریباً یہی مضمون ہے۔

حدیث نمبر ۱— عن معاذ ابن انسؓ قال قال رسول اللہ ﷺ من قرء الف آیة فی سبیل اللہ کتب یوم القیامة مع النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا.

حضرت معاذؓ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ایک ہزار آیت اللہ (کی رضا) کے لئے تلاوت کرے۔ طے شدہ ہے کہ وہ قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں، شہداء وصالحین کے ساتھ بہترین رفاقت میں ہوگا۔

(منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ص ۹۲ ج ۳ ابن کثیر ص ۲۳ ج ۲)

حدیث نمبر ۲— "قالَ رسولُ اللہ ﷺ التاجرُ الصدُوقُ الامینُ مَعَ النبیین والصدیقین والشهداءِ.

آپ ﷺ نے فرمایا کہ سچا تاجر امانت دار (قیامت کے دن) نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

(منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ص ۲۰۹ ج ۲ ابن کثیر ص ۵۲۳ ج ا طبع مصر)

مرزائی بتائیں کہ اس زمانہ میں کتنے امین وصادق تاجر نبی ہوئے ہیں؟

حدیث نمبر ۳ — عن عائشةؓ قالت سمعت رسول الله ﷺ یقول ما من نبی یمرض إلا خُیِّرَ بین الدنیا والآخرة وکان فی شکواه الذی قُبِضَ اَخَذَته بُحّة شدیدة سمعته یقول مع الذین انعمت علیهم من النبیین فعلمتُ انّه خُیِّرَ۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے کہ ہر نبی مرض (وفات) میں اسے اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں رہنا چاہتا ہے یا عالم آخرۃ میں۔ جس مرض میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی آپ ﷺ اس مرض میں فرماتے تھے "مع الذین انعمت علیهم من النبیین" اس سے میں سمجھ گئی کہ آپ ﷺ کو بھی (دنیا و آخرۃ میں سے ایک کا) اختیار دیا جارہا ہے۔

(مشکوٰۃ ص ۵۴۷ ج ۲۔ ابن کثیر ص ۵۲۳ ج ا)

کتب سیر میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے وصال کے وقت یہ الفاظ ارشاد فرمائے "مع الرفیق الاعلی فی الجنة مع الذین انعمت علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین" (البدایہ والنہایہ ص ۲۳۱ ج ۵) رفیق اعلیٰ کے ساتھ جنت میں انعام یافتہ لوگوں۔ (یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ)۔

معلوم ہوا کہ اس آیت میں نبی بننے کا ذکر نہیں کیونکہ نبی تو پہلے ہی بن چکے تھے آپ ﷺ کی تمنا آخرۃ کی معیت کے متعلق تھی۔

ان تمام احادیث میں مع کا لفظ ہے۔ جو معیت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ انکو عینیت کے معنوں میں لینا ممکن ہی نہیں۔ جیسا کہ ان چند روایات سے ثابت ہوا۔

درجات کے ملنے کا تذکرہ

قرآن کریم میں جہاں دنیا میں درجات ملنے کا ذکر ہے وہاں نبوت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگرچہ باقی تمام درجات مذکور ہیں چنانچہ مثال کے طور پر دیکھئے:

۱- وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ الحدید ۱۹۔ اور جو لوگ یقین لائے اللہ پر اور اسکے سب رسولوں پر وہی ہیں سچے ایمان والے اور لوگوں کا احوال بتلانے والے اپنے رب کے پاس۔

۲- وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ۔ عنکبوت ۹
اور جو لوگ یقین لائے اور بھلے کام کیئے ہم ان کو داخل کریں گے نیک لوگوں میں۔

۳- سورہ حجرات کے آخر میں مجاہدین فی سبیل اللہ کو فرمایا "اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ"۔

۴- من یطع اللہ میں من عام ہے۔ جس میں عورتیں بچے ہجڑے سب شامل ہیں۔ کیا یہ سب نبی ہو سکتے ہیں؟ اگر نبوت اطاعت کاملہ کا نتیجہ ہے تو عورت کو بھی نبوت ملنی چاہیئے۔ کیونکہ اعمال صالحہ کے نتائج میں مرد و عورت کو یکساں حیثیت حاصل ہے جیسے فرمایا:

"مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً وَّلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" النحل ۹۷۔

کہ کوئی اچھا عمل کرتا ہے مرد یا عورت، اور وہ مومن ہے تو یقیناً اسے ایک پاک زندگی میں زندہ رکھیں گے اور ہم یقیناً انکے بہترین اعمال کے جو وہ کرتے تھے اجر دیں گے۔

کیا اس میں آنحضرت ﷺ کا کمال فیضان ثابت نہ ہوگا کہ عورت جسے کبھی نبوت حاصل نہ ہوئی وہ بھی آپ ﷺ کے طفیل نبوت حاصل کرتی ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت و رسالت اطاعت کاملہ کا نتیجہ نہیں۔

۵- کیا تیرہ سو سال میں کسی نے حضور ﷺ کی اطاعت و پیروی کی ہے یا نہیں؟ اگر کی ہے تو نبی کیوں نہ بنے؟ اور اگر کسی نے بھی نہیں کی تو آپ ﷺ کی امت خیر امت نہ ہوئی بلکہ شر امت ہوگی۔ (نعوذ باللہ) جس میں کسی نے بھی اپنے نبی کی کامل پیروی نہ کی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں صحابہ کرامؓ کے متعلق خود شہادت دیدی ہے کہ یُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (توبہ ۷۱)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ اللہ اور اسکے رسول کی کامل اطاعت کرتے ہیں۔ بتاؤ وہ نبی کیوں نہ ہوئے؟۔ اس لئے کہ اگر

اطاعت کاملہ کا نتیجہ نبوت ہے تو اکابر صحابہ کرامؓ کو یہ منصب ضرور حاصل ہوتا جنہیں "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ" کا خطاب ملا اور یہی رضائے الٰہی سب سے بڑی نعمت ہے چنانچہ فرمایا: "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ" توبہ ۷۲

۶۔ مرزا قادیانی تحریر کرتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وجود ظلی طور پر گویا آنجناب ﷺ کا وجود ہی تھا۔ ایام الصلح ص ۲۶۵ ج ۱۴ (۲) صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کے دست و بازو تھے۔ سراج الاخبار ۱۴۳ ج ۸ (۳) صدیق اکبر من بقیہ طینۃ النبی تھے سراج الاخبار ۵۵ ج ۸ (۴) صدیق اکبرؓ آیت استخلاف کا مصداق تھے سراج الاخبار ص ۲۵۲ ج ۸ (۵) صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کی عکسی تصویریں تھے۔ فتح اسلام ص ۱۱ ج ۳۔

سوال یہ ہیکہ جب مرزا قادیانی کے نزدیک صحابہ کرامؓ آنحضرت ﷺ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور کامل اتباع کا نمونہ تھے تو وہ نبی کیوں نہ بنے؟

بعض دفعہ مرزائی یہاں یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ نے ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر خلافت دینے کا وعدہ کیا ہے تو صرف چار ہی خلفاء کیوں مانے جاتے ہیں۔ کیا اور صحابہ مومن نہ تھے؟ بیشک تھے۔ لیکن خلافت اللہ کی دین ہے جس کو چاہے دے۔ اسی طرح نبوت بھی اللہ نے جس کو چاہا دیا۔ صحابہ کو نہیں چاہا تو نہیں دیا۔

تو اس سلسلہ میں یاد رکھئے کہ یہ مرزائیوں کا نرا مغالطہ ہے جو جہالت پر مبنی ہے۔ ان جاہلوں کو یہ نہیں معلوم خلافت صرف چار میں محدود نہیں بلکہ آئندہ بھی جب اور جہاں کوئی مسلمان عادل اور صالح بادشاہ ہوگا اپنے عمل و صلاح کے پیمانے پر اس وعدہ الٰہیہ کا اس کو حصہ قرار دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ آخری خلیفہ برحق حضرت مہدی ہونگے۔ لہذا نبوت کو آیت استخلاف پر قیاس کرنا محض جہالت کی بنیاد پر ہے۔ اور ہمارا سوال اپنی جگہ باقی ہے۔ کہ جب صحابہ میں اطاعت مکمل درجہ کی تھی تو وہ نبی کیوں نہ بنائے گئے؟

۷۔ اگر بفرض محال ایک منٹ کے لئے تسلیم کر لیں کہ اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت میں نبوت ملتی ہے تو بھی اس آیت میں تشریعی اور غیر تشریعی کی کوئی تخصیص نہیں

۔تم غیر تشریعی کی کیوں تخصیص کرتے ہو؟ اگر اس آیت میں نبوت ملنے کا ذکر ہے تو آیت میں النبیین ہے المرسلین نہیں۔ اور نبی تشریعی ہوتا ہے جیسا کہ نبی ورسول کے فرق سے واضح ہے۔ تو اس لحاظ سے تشریعی نبی آنے چاہئیں۔ یہ تمہارے عقیدہ کے بھی خلاف ہوا۔ مرزا کہتا ہے:

''اب میں بموجب آیت کریمہ وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ اپنی نسبت بیان کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس تیسرے درجہ میں داخل کر کے وہ نعمت بخشی ہے کہ جو میری کوشش سے نہیں بلکہ شکم مادر میں ہی مجھے عطا کی گئی ہے''

(حقیقت الوحی خ ص ۷۰ ج ۲۲)

اس حوالہ سے تو ثابت ہوا کہ مرزا کو آنحضرت ﷺ کی اتباع سے نہیں بلکہ وہبی طور پر نبوت ملی ہے۔ تو پھر اس آیت سے مرزائیوں کا استدلال باطل ہوا۔

۷۔ اگر اطاعت کرنے سے نبوت ملتی ہے تو نبوت کسبی چیز ہوئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ'' یعنی نبوت وہبی چیز ہے جو اسے کسبی مانے وہ کافر ہے۔ خود مرزا نے بھی نبوت کو وہبی مانا ہے۔

نبوت وہبی چیز ہے

۱۔ علامہ شعرانیؒ الیواقیت والجواہر میں تحریر فرماتے ہیں: ''فان قلت فھل النبوۃ مکتسبۃ او موھوبۃ فالجواب لیست النبوۃ مکتسبۃ حتی یتوصل الیھا بالنسک والریاضات کما ظنہ جماعۃ من الحمقاء...... وقد افتی المالکیۃ وغیرھم بکفر من قال ان النبوۃ مکتسبۃ۔ (الیواقیت ص ۱۶۴،۱۶۵ ج ۱) کہ کیا نبوت کسبی ہے یا وہبی؟ تو اس کا جواب ہے کہ نبوت کسبی نہیں ہے۔ کہ محنت وکاوش سے اس تک پہونچا جائے جیسا کہ بعض احمقوں (مثلاً قادیانی فرقہ، از مترجم) کا خیال ہے۔ مالکی وغیرہ نے کسبی کہنے والوں پر کفر کا فتویٰ دیا ہے۔

۲۔ قاضی عیاضؒ شفاء میں لکھتے ہیں:

''من ادعی نبوۃ احد مع نبینا ﷺ او بعدہ ...... او من ادعی النبوۃ لنفسہ او جوز اکتسابھا والبلوغ بصفاء القلب الی مرتبتھا ...... وکذا من

ادعی منهم انه یوحی الیه وان لم یدع النبوة ...... فهؤلاء کلهم کفار مکذبون للنبی ﷺ لانه اخبر علیه السلام انه خاتم النبیین لانبی بعدی '

(شفاء قاضی عیاض ص ۲۴۶ ۔ ۲۴۷ ج ۲)

ہمارے نبی ﷺ کی موجودگی میں یا آپ ﷺ کے بعد جو کوئی کسی اور کی نبوت کا قائل ہو یا اس نے خود اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ۔ یا پھر دل کی صفائی کی بنا پر اپنے کسب کے ذریعہ نبوت کے حصول کے جواز کا قائل ہوا ۔ یا پھر اپنے پر وحی کے اترنے کو کہا ۔ اگرچہ نبوت کا دعویٰ نہ کیا تو یہ سب قسم کے لوگ نبی ﷺ کے دعویٰ " انا خاتم النبیین " کی تکذیب کرنے والے ہوئے اور کافر ٹھہرے ۔

ان دونوں روشن حوالوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ نبوت کے کسبی ہونے کا عقیدہ رکھنا اپنے اندر تکذیب خدا اور رسول کا عنصر رکھتا ہے ۔ اور ایسا عقیدہ کا رکھنے والا مالکیہ و دیگر علماء کے نزدیک قابل گردن زدنی اور کافر ہے ۔

مرزا قادیانی خود اقراری ہے کہ نبوت وہبی چیز ہے کسبی نہیں ۔ اس نے لکھا ہے :

۱ ۔ " اس میں شک نہیں کہ محدثیت محض وہبی چیز ہے ۔ کسب سے حاصل نہیں ہو سکتی ۔ جیسا کہ نبوت کسب سے حاصل نہیں ہو سکتی " (حمامۃ البشریٰ ص ۳۰۱ خ ج ۷)

۲ ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ : اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کو یہ مرتبہ ملا انعام کے طور پر ملا ۔ یعنی محض فضل سے نہ کسی عمل کا اجر ۔

(چشمہ مسیحی خ ص ۳۶۵ ج ۲۰)

مرزائی عذر ۔ ۱

وہبی چیز میں بھی انسان کا دخل ہوتا ہے جیسے اللہ نے فرمایا ہے " یَهَبُ لِمَنْ یَّشَاءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَاءُ الذُّکُوْرَ " شوریٰ ۴۹ ۔ بخشتا ہے جسکو چاہے بیٹیاں اور بخشتا ہے جسکو چاہے بیٹے ۔ اس میں اگر مرد و عورت اکٹھے نہ ہوں تو کچھ نہیں ہوتا ۔ معلوم ہوا کہ وہبی چیز میں بھی کسب کو دخل ہے ۔

الجواب : ۔ ہاں ٹھیک ہے کہ انسان کا اس عمل میں دخل ہے مگر لڑکا یا لڑکی عطا کرنے میں کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہے ۔ چنانچہ بسا اوقات اس اختلاط سے بھی کچھ نہیں

ہوتا۔ پڑھئے "وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا" (شوریٰ ۵۰) لہذا مرزائیوں کو اس سے نہ دھوکہ کھانا چاہیے، نہ کسی کو دھوکہ دینا چاہیے۔

۸۔ اگر نبوت ملنے کیلئے اطاعت و تابعداری شرط ہے تو پھر بھی غلام احمد نبی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس نے نبی کریم ﷺ کی کامل اطاعت اور تابعداری نہیں کی جیسے:

۱۔ مرزا نے حج نہیں کیا۔

۲۔ مرزا نے ہجرت نہیں کی۔

۳۔ مرزا نے جہاد بالسیف نہیں کیا بلکہ الٹا اس کو حرام کہا۔

۴۔ مرزا نے کبھی پیٹ پر پتھر نہیں باندھے۔

۵۔ ہندوستان کے قحبہ خانوں میں زنا ہوتا رہا مگر غلام احمد نے کسی زانیہ یا زانی کو سنگسار نہیں کرایا بلکہ اس کے اور اسکے خاندان کے اس فعل قبیح میں ملوث ہونے کے پختہ ثبوت خود قادیانیوں نے ہی جمع کیے ہیں۔

۶۔ ہندوستان میں چوریاں ہوا کرتی تھیں مگر مرزاجی نے کسی چور کے ہاتھ نہیں کٹوائے۔ بلکہ خود مرزاجی ہی پانچ اور پچاس کا فلسفہ پڑھاتے رہے۔ اس عقدہ کو آج تک کوئی مرزائی حل نہیں کرسکا! (ملاحظہ فرمائیے کتاب براہین احمدیہ کی اشاعت اور مرزاجی کی فریب کاریاں)

۹۔ مرزا نے لکھا کہ

"تم پنجوقت نمازوں میں یہ دعا پڑھا کرو کہ اھدنا الصراط المستقیم ...... یعنی اے ہمارے خدا اپنے منعم علیہم بندوں کی ہمیں راہ بتا، وہ کون ہے! نبی اور صدیق اور شہید اور صلحاء۔ اس دعا کا خلاصہ مطلب یہی تھا کہ ان چاروں گروہوں میں سے جسکا زمانہ تم پاؤ اس کے سایہ صحبت میں آجاؤ" (آئینہ کمالات ص ۶۱۲ ج ۵)

نیز مرزا قادیانی خود تحریر کرتا ہے:

"الا ترى الى قول رسول الله ﷺ انه قال ان فى الجنة مكاناً لا ينا له الا رجل واحد وارجو ان اكون انا هو فبكى رجل من سماع هذا الكلام و قال يا رسول الله ﷺ لا اصبر على فراقك ولا استطيع ان تكون فى مكان وانا فى مكان بعيد عنك محجوباً عن روية وجهك وقال له رسول الله ﷺ انت تكون معى و فى مكانى (حمامة البشرىٰ خ ص ۲۹۳ ج ۷)

اب صراحت مرزا کے کلام سے ثابت ہوا کہ معیت سے مراد معیت فی الجنت ہے اور معیت فی المرتبہ مراد نہیں تا کہ اجراء نبوت کا سوال پیدا ہو۔

۱۰- یہ کہ مرزا قادیانی نے اہل مکہ کے لئے دعاء کی ہے اللہ تعالیٰ تم کو انبیاء ورسل وصدیقین وشہداء اور صالحین کی معیت نصیب کرے۔ جیسے حمامۃ البشریٰ ص خ ص ۳۲۵ ج ۷، میں لکھا ہے " نسئله ان یدخلکم فی ملکوته مع الانبیاء و الرسل والصدیقین والشهداء والصالحین "تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرزا دعا مانگ رہا ہے کہ اہل مکہ تمام کے تمام انبیاء رسول بن جاویں؟ اگر یہی مراد لی جاوے تو مرزا نے گویا اہل مکہ کے لئے نبوت حاصل کرنے کی دعا کی ہے۔ اور یقیناً اس کی دعا منظور ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ مرزا کو خدا نے الہام میں وعدہ کیا ہوا ہے کہ ''اجیب کل دعائک الافی شرکائک" میں تیری ساری دعائیں قبول کروں گا مگر شرکاء کے بارے میں نہیں۔ (تذکرہ ص ۲ طبع سوم) تو پھر یقیناً مکہ والے لوگ نبی ہو گئے ہوں گے؟

عسل مصفیٰ ص ۴۷۰ ج ۱ میں خدا بخش قادیانی نے کتاب ماثبت بالسنۃ ص ۳۶ شیخ عبدالحق دہلوی سے یہ عبارت نقل کی ہے:

ماوقع فی مرضه انه ﷺ خیر عند موته یقول فی آخر مرضه مع الذین انعم الله علیهم من النبیین الخ

جب حضور ﷺ مریض ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو موت کے وقت، حیات دنیا وآخرت میں اختیار دیا تو آپ ﷺ نے آخری مرض میں یہ آیت پڑھی۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کو کامل نبوت کے حاصل ہونے کے بعد بھی اپنی مرض موت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار دیا گیا تھا، کہ دنیا کے ساتھیوں کی رفاقت پسند کرتے ہیں یا جنت والے ساتھیوں کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر دو مقام سے رفاقت مکانی مقصود ہے نہ کہ رفاقت مرتبی۔ کیوں کہ یہ تو آپ ﷺ کو پہلے ہی سے حاصل تھی۔

۱۱- نیز مع کا معنی ساتھ کے ہیں۔ جیسے "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ"

نیز اگر نبی کی معیت سے نبی ہو سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی معیت سے خدا بھی ہو سکتا ہے؟ العیاذ باللہ!

۱۲- یہ دلیل قرآن کریم کی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس لئے مرزائی اپنے استدلال کی تائید میں کسی مفسر یا مجدد کا قول پیش کریں۔ بغیر اس تائید کے ان کا استدلال مردود اور من گھڑت ہے۔ اس لئے کہ مرزا نے لکھا ہے:

"جو شخص ان (مجددین) کا منکر ہے وہ فاسقوں میں سے ہے"

(شہادت القرآن خ ص ۳۴۴ ج ۶)

۱۳- اگر مرزائیوں کے بقول اطاعت سے نبوت وغیرہ درجات حاصل ہوتے ہیں تو ہمارا یہ سوال ہوگا کہ یہ درجے حقیقی ہیں یا ظلی، بروزی؟ اگر نبوت کا ظلی، بروزی درجہ حاصل ہوتا ہے جیسا کہ مرزائیوں کا عقیدہ ہے تو صدیق، شہید اور صالح بھی ظلی و بروزی ہونے چاہئیں۔ حالانکہ ان کے بارے میں کوئی ظلی، بروزی ہونے کا قائل نہیں۔ اور اگر صدیق وغیرہ میں حقیقی درجہ ہے تو پھر نبوت بھی حقیقی ہی ملنا چاہیے۔ حالانکہ تشریعی اور مستقل نبوت کا ملنا خود مرزائیوں کو بھی تسلیم نہیں ہے۔ اس لئے یہ دلیل مرزائیوں کے دعویٰ کے مطابق نہ ہوئی۔

۱۴- اس آیت سے چار آیت پہلے انبیاء و رسل کے متعلق فرمایا ہے "وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" سورۃ نساء ۶۴۔ یعنی ہر ایک رسول مطاع اور امام بنانے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس غرض سے نہیں بھیجا جاتا کہ وہ کسی دوسرے رسول کا مطیع اور تابع ہو اور آیت "وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ" میں مطیعون کا ذکر ہے۔ اور مطیع کسی بھی صورت میں نبی اور رسول نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ نبی اور رسول مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں (فافہم)

۱۵- مرزائی ایک طرف تو دلیل بالا سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اطاعت رسول کے ذریعہ سے آدمی درجہ نبوت تک پہنچ سکتا ہے۔ دوسری طرف خود انکے حضرت صاحب نے اس بات کا اقرار و اعتراف کیا ہے کہ اطاعت کرنے حتی

کہ فنافی الرسول ہو جانے سے بھی نبوت نہیں مل سکتی۔ بس زیادہ سے زیادہ محدثیت کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس اعتراف کے ثبوت میں چند حوالے پیش ہیں:

حوالہ نمبر ا: "جب کسی کی حالت اس نوبت تک پہونچ جائے (جو اس سے قبل ذکر کی گئی) تو اس کا معاملہ اس عالم سے وراء الوراء ہو جاتا ہے اور ان تمام ہدایتوں اور مقامات عالیہ کو ظلی طور پا لیتا ہے۔ جو اس سے پہلے نبیوں اور رسولوں کو ملے تھے۔ اور انبیاء ورسل کا نائب اور وارث ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقت جو انبیا میں معجزہ کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ وہ اس میں کرامت کے نام سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور وہی حقیقت انبیاء میں عصمت کے نام سے نامزد کی جاتی ہے۔ اس میں محفوظیت کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اور وہی حقیقت جو انبیا میں نبوت کے نام سے بولی جاتی ہے۔ اس میں محدثیت کے پیرایہ میں ظہور پکڑتی ہے۔ حقیقت ایک ہے لیکن بباعث شدت اور ضعف رنگ کے ان کے نام مختلف رکھے جاتے ہیں۔ اسلئے آنحضرت ﷺ کے ملفوظات مبارک ارشاد فرما رہے ہیں کہ محدث، نبی بالقوۃ ہوتا ہے اگر باب نبوت مسدود نہ ہوتا تو ہر ایک محدث اپنے وجود میں قوت اور استعداد نبی ہونے کی رکھتا ہے اور اس قوت اور استعداد کے لحاظ سے محدث کا حمل نبی پر جائز ہے۔ یعنی کہہ سکتے ہیں کہ المحدث نبی جیسا کہ کہہ سکتے ہیں "العنب خمر نظراً علی القوۃ والاستعداد و مثل ھذا الحمل شائع متعارف"

(ماہنامہ ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۴ اپریل ۱۹۰۴ء بعنوان اسلامی برکات)

اس عبارت سے واضح ہوا کہ ظلی نبوت بھی درحقیقت محدثیت ہی ہے اور کامل اتباع سے جو ظلی نبی بنتا ہے وہ دراصل محدث ہوتا ہے۔ اور یہاں جو محدث پر نبی کا حمل کیا گیا ہے وہ محض استعداد کی بناء پر ہے۔ یعنی اگر دروازہ نبوت بند نہ ہوتا تو وہ بھی نبی بن جاتا۔ جیسا کہ عنب پر خمر کا اطلاق قوت اور استعداد کی بناء پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسکا مطلب یہ نہیں کہ جو خمر کا حکم ہے وہ عنب کا بھی حکم ہو۔ بلکہ دونوں کے احکام اپنی جگہ الگ الگ ہیں۔ اسی طرح اگر محدث پر نبی کا اطلاق بلحاظ استعداد کیا جائے گا تو دونوں کے احکام الگ الگ ہونگے۔ نبی کا انکار کفر ہوگا اور محدث کی نبوت کا انکار کفر نہ ہوگا۔ حالانکہ مرزائی اپنے حضرت صاحب (ظلی نبی) کے منکرین کو پکا کافر گردانتے ہیں۔ یہ

توعجیب تضاد ہوا مرزا غلام احمد کچھ کہیں۔ مرزائی کچھ کہیں اور آج کل کے جاہل کچھ کہیں!
اسی سے اس لچر عقیدہ کے بطلان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حوالہ نمبر ۲۔ مرزا لکھتا ہے ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وجود ظلی طور پر گویا آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہی تھا'' (ایام الصلح خ ص ۲۶۵ ج ۱۴)

مرزا کو خود تسلیم ہے کہ حضرت عمرؓ آنحضرت ﷺ کے ظلی وجود تھے۔ پھر بھی وہ نبی نہ بن سکے۔ معلوم ہوا کہ اتباع نبی سے زیادہ سے زیادہ ظلی وجود تو مرزا کے نزدیک ہو سکتا ہے مگر نبوت نہیں مل سکتی۔ ورنہ قادیانی لوگ حضرت عمرؓ کو بھی ظلی نبی تسلیم کریں!
''لو کان بعدی نبی لکان عمر'' حدیث نے عمرؓ کے نبی نہ ہونے کی صراحت کر دی۔
حضرت علیؓ فرماتے ہیں ''قال علی الا وانی لست نبی ولا یوحی الیٰ'' (ازالۃ الخفاء ص ۱۳۳)
حضرت علیؓ فرماتے ہیں، خبردار! نہ میں نبی ہوں اور نہ میری طرف وحی آتی ہے۔

حوالہ نمبر ۳۔ ''صدہا ایسے لوگ گزرے ہیں جن میں حقیقت محمدیہ متحقق تھی اور عنداللہ ظلی طور پر ان کا نام محمد یا احمد تھا۔ (آئینہ کمالات اسلام خ ص ۳۴۶ ج ۵)

اس عبارت سے یہ بھی پتہ چلا کہ اگرچہ صدہا لوگ ایسے گزر چکے ہیں جن کا نام ظلی طور پر محمد یا احمد تھا مگر پھر بھی ان میں سے نہ کوئی نبی بنا اور نہ کسی نے دعویٰ نبوت کیا، نہ اپنی الگ جماعت بنائی، اور نہ اپنے منکرین کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیا۔ تو عجیب بات ہے کہ اتنے بڑے بڑے متبعین خدا اور رسول تو اس نعمت سے محروم ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور مرزا قادیانی جیسا کوڑھ مغز آدمی ظلی نبی کے ساتھ ساتھ حقیقی نبی بھی بن گیا۔

مرزائی عذر ۔ ۴

مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ ...... مع، من کے معنی میں ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ منعم علیہم انبیاء وغیرہ میں سے ہوگا۔ نہ کہ محض انکے ساتھ ہوگا اور اسکی مثال قرآن کریم میں بھی موجود ہے دیکھئے فرمایا گیا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ، ای من الابرار ''یعنی نیکوں میں سے بنا کر ہمیں وفات دیجئے۔

الجواب:۔ مرزائی عذر بچند وجوہ باطل ہے۔

الف-پورے عرب میں کہیں بھی مع ،من کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ اگر یہ من کے معنی میں آتا تو مع پر من کا دخول ممتنع ہوتا حالانکہ عربی محاوروں میں من کا مع پر داخل ہونا ثابت ہے لغت کی مشہور کتاب المصباح المنیر میں لکھا ہے" ودخول من نحو جئت من معه .مع القوم" لہذا معلوم ہوا کہ من کبھی بھی مع کے معنی میں نہیں ہوسکتا۔ ورنہ ایک ہی لفظ کا تکرار لازم آئے گا۔

ب- جب کوئی لفظ مشترک ہو اور دو معنی میں مستعمل ہو تو دیکھا جاتا ہے کہ کون سے معنی حقیقی ہیں اور کون سے معنی مجازی۔ جب تک حقیقت پر عمل کرنا ممکن ہو تو مجاز اختیار کرنا درست نہیں ہوتا۔ یہاں پر بہرحال مع رفاقت کے معنی میں حقیقت ہے۔ اور اس پر عمل کرنا یہاں ممکن بھی ہے۔ کیونکہ اگلے جملہ وَحَسُنَ اُولٰئِکَ رَفِیقاً سے صاف طور پر رفاقت کے معنی کی تائید ہو رہی ہے۔ لہٰذا مع کو من کے مجازی معنی میں لے جانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

ج- اگر مع کا معنی من لیا جائے تو حسب ذیل آیت کے معنی کیا ہوں گے

۱- اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ، (بقرہ ۱۵۳) کیا خدا اور فرشتے ایک ہوگئے۔

۲- لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا، (توبہ ۴۰) کیا حضور ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور خدا ایک ہوگئے۔

۳- "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" (بقرہ ۱۵۳)

۴- "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ" (فتح ۲۹) کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ صابروں کے جز ہیں یا یہ کہ حضرات صحابہ کرامؓ آنحضرت ﷺ میں سے ہیں؟ دیکھیے کس طرح قادیانی تنکوں کا پل بناتے ہیں اور پھر اس پر زندہ ہاتھی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

د- اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ مع بھی کبھی من کے معنی میں استعمال ہوا ہے یا ہوتا ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ آیت مبحوث عنہا میں بھی مع، من کے معنی میں ہے۔ کیا کسی مفسر یا مجدد نے یہاں پر مع کے بجائے من کے معنی مراد لیے ہیں؟۔

۵- مع، من کے معنی میں ہونے پر مرزائی جو آیات قرآنیہ تلبیس ومغالطہ کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک آیت میں بھی مع، من کے معنی میں نہیں۔ ہمارے اور مرزائیوں کے معتبر مفسر امام رازیؒ (جو مرزئیوں کے نزدیک چھٹی صدی کے مجدد ہیں (عسل مصفی ص۱۶۴ ج۱) نے آیت وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ کی تفسیر فرماتے ہوئے مرزائیوں کے سارے گھروندے کوزے میں بوس کر دیا ہے اور انکی رکیک تاویل کی دھجیاں اڑادی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

,,وفاتهم معهم هي ان يموتوا على مثل اعمالهم حتى يكونوا في درجاتهم يوم القيامة قد يقول الرجل انا مع الشافعي في هذه المسئلة ويريد به كونه مساويا له في ذالك الاعتقاد" تفسیر کبیر ص۱۸۱ ج ۳،،۔

ان کاان (ابرار) کے ساتھ وفات پانا اس طرح ہوگا کہ وہ ان نیکوں جیسے اعمال کرتے ہوئے انتقال کریں تاکہ قیامت کے دن ان کا درجہ پالیں۔ جیسے کبھی کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں اس مسئلہ میں شافعیؒ کے ساتھ ہوں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا اعتقاد رکھنے میں وہ اور امام شافعی برابر ہیں۔ نہ یہ کہ وہ درجہ میں امام شافعی تک پہنچ گیا۔

مرزائی عذر-۳

مرزائیوں نے اپنے باطل استدلال کی تائید کے لئے جھوٹ کا پلندہ تیار کیا ہے اور مشہور امام لغت راغب اصفہانیؒ کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امام راغبؒ کے ایک قول سے انکے بیان کردہ معنی کی تائید ہوتی ہے وہ عبارت یہ ہے۔

"قال الراغب :ممن انعم عليهم من الفرق الاربع في المنزلة والصواب النبي بالنبي والصديق بالصديق والشهيد بالشهيد والصالح بالصالح واجاز الراغب ان يتعلق من النبي بقوله ومن يطع الله والرسول اى من النبيين ومن بعدهم (بحرالمحیط للعلامہ اندلسی ص ۲۸۷ ج ۳)

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ من النبیین، انعم اللہ علیہم سے نہیں بلکہ ومن یطع اللہ سے متعلق ہے۔ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ نبیوں وغیرہ میں سے جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ منعم علیہم کے ساتھ ہوگا اور یہاں یطع مضارع کا صیغہ ہے جو

حال و مستقبل دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ لہذا ضروری ہوا کہ اس امت میں بھی کچھ نبی ہونے چاہئیں جو رسولوں کی اطاعت کرنے والے ہوں۔ اگر نبوت کا دروازہ بند ہوگا تو اس آیت کے مطابق کون سا نبی ہوگا جو رسول اللہ کی اطاعت کرے گا؟

ڈھول کا پول

مرزائیوں نے مذکورہ عبارت پیش کر کے انتہائی دجل و فریب کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ حوالہ علامہ اندلسی کی تفسیر البحر المحیط سے ماخوذ ہے۔ مگر انہوں نے اس قول کو نقل کر کے اپنی رائے اس طرح بیان فرمائی ہے:

"وهذا وجه الذى هو عنده ظاهر فاسد من جهة المعنى ومن جهة النحو۔

معنی اور نحو دونوں کے لحاظ سے یہ بات فاسد ہے۔ تفسیر البحر المحیط ص ۲۸۷ ج ۳ بیروت

لہذا معلوم ہوا کہ یہ قول بالکل مردود اور ساقط الاستدلال ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ امام راغبؒ کی کسی کتاب میں اس طرح کی عبارت نہیں ملتی۔ انکی طرف یہ قول منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ انکی طرف قول بالا کی غلط نسبت ہونے پر ہمارے پاس دو قرینہ موجود ہیں۔ دیکھئے:

پہلا قرینہ

امام راغب اصفہانیؒ نے صدیقین کی تفسیر میں ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ جس کا نام الذریعہ الی مکارم الشریعہ ہے۔ آیت ومن یطع اللہ والرسول کا تعلق بھی اسی مضمون سے ہے اگر بالفرض امام راغبؒ کا وہ مسلک ہوتا جو بحر محیط میں نقل کیا ہے تو اس کتاب میں ضرور نقل کرتے۔ لیکن پوری کتاب میں کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔

دوسرا قرینہ

اگر اس طرح کی عبارت امام راغبؒ کی کسی کتاب میں ہوتی تو مرزائی مناظرین امام راغبؒ کی اسی کتاب سے حوالہ دیتے اور وہیں سے نقل کرتے کہ دلیل پختہ ہوتی۔ لیکن وہ لوگ تو بحر محیط کی ایک عبارت لے کر لکیر پیٹتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا اصل ماخذ کہیں ہے ہی نہیں۔

۱۶۔ اگر درجات ملنے کا ذکر ہے تو بہ ترتیب حاصل ہونے چاہئیں پہلے صدیق پھر شہید پھر صالح۔

مرزائی عذر-۴

مع بمعنی من ہے۔ ابلیس کے متعلق ایک جگہ فرمایا: "اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ.

(الحجر) دوسری جگہ فرمایا: "لَمْ یَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ. (اعراف ۱۱)

جواب:- ابلیس نے تین گناہ کئے تھے ۱۔ تکبر کیا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ ص کے آخری رکوع میں ہے: "کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ" ۲۔ سجدہ نہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اسکا بیان سورۃ اعراف کے دوسرے رکوع میں ہے "لم یکن من الساجدین" ۳۔ اس نے جماعت ملائکہ سے مفارقت کی تھی۔ اس کا بیان سورۃ حجر کے تیسرے رکوع میں ہے "اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ."

پس مع ہرگز من کے معنوں میں نہیں بلکہ دونوں کے فائدے الگ الگ اور جداگانہ ہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہیں۔

مرزائی عذر-۵

"اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰہِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا. (نساء ۱۴۶) کیا توبہ کرنے والے مومن نہیں، مومنوں کے ساتھ ہونگے۔ کیا ان کو اجر عظیم عطا نہ ہوگا؟

جواب:-

حقیقت یہ ہے کہ مومنین پر الف لام عہد کا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو شروع سے خالص مومن ہیں ان سے کبھی نفاق سرزد نہیں ہوا، ان کی معیت میں وہ لوگ جنت میں ہونگے جو پہلے منافق تھے پھر توبہ کر کے مخلص مومن بن گئے۔ پس ثابت ہوا کہ مع اپنے اصل معنی، مصاحبت کے لئے آیا ہے نہ کہ بمعنی من۔

خلاصہ کلام: قادیانیوں اس آیت سے اجرائے نبوت پر استدلال نہ صرف یہ کہ بے معنی اور بے سود ہے بلکہ یہ انکی جہالت وڈھٹائی ہے اس سے انہیں باز رہنا چاہیے۔

مجھ سے کچھ بھی عقیدت ہے تم کو تو اپنا وطیرہ بدلنا پڑے گا
نفاق زبان وعمل سے گزر کر صداقت کے سانچے میں ڈھلنا پڑے گا

کیا فرماتے ہیں ائمہ مفسرین

معارف القرآن (ص ۴۶۶ ج ۲)

بیان القرآن:۔

اور جو شخص (ضروری احکام میں بھی) اللہ و رسول کا کہنا مان لے گا (گو تکثیر طاعات سے کمال حاصل نہ کر سکے) تو ایسے اشخاص بھی (جنت میں) ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ تعالیٰ نے (کامل) انعام (دین و قرب و قبول کا) فرمایا ہے، یعنی انبیاء (علیہم السلام) اور صدیقین (جو کہ انبیاء کی امت میں سب سے زیادہ رتبہ کے ہوتے ہیں، جن میں کمال باطنی بھی ہوتا ہے، جن کو عرف میں اولیاء کہا جاتا ہے) اور شہداء (جنھوں نے دین کی محبت میں جان تک دیدی) اور صلحاء (جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں واجبات میں بھی اور مستحبات میں بھی، جن کو نیک بخت دیندار کہا جاتا ہے) اور یہ حضرات (جس کے رفیق ہوں) بہت اچھے رفیق ہیں (اور مطیع کی ان کے ساتھ رفاقت ثابت ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ اطاعت کا یہ ثمرہ ہوا کہ اس کو ایسے رفیق ملے) یہ (معیت اور رفاقت ان حضرات کے ساتھ محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے (یعنی عمل کا اجر نہیں ہے، کیونکہ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ جو درجے میں عمل کا مقتضا تھا وہاں سے آگے نہ جا سکتا تھا، بس یہ بطور انعام کے ہے) اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں (ہر ایک عمل کو اور اس کے مقتضا کو، اور اس مقتضا سے زائد مناسب انعام کی مقدار کو خوب جانتے ہیں، کیونکہ اس انعام میں بھی تفاوت ہوگا، کسی کو ان حضرات سے بار بار قرب ہوگا، کسی کو گاہ بگاہ و علیٰ ہٰذا (واللہ اعلم)

ربطِ آیات

اوپر اللہ و رسول کی اطاعت پر خاص مخاطبین سے اجر عظیم کا وعدہ تھا، اب ان آیات میں بطور قاعدہ کلیہ کے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر عام وعدہ کا ذکر ہے،

معارف ومسائل

جنت کے درجات اعمال کے اعتبار سے ہوں گے۔ جولوگ ان تمام چیزوں پر عمل کریں جن کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے دیا ہے، ان تمام چیزوں سے پرہیز کریں جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے..... تو عمل کے اعتبار سے ان کے مختلف درجات ہوں گے، اول درجہ کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جنت کے مقاماتِ عالیہ میں جگہ عطا فرمائیں گے، اور دوسرے درجہ کے لوگوں کو ان لوگوں کے ساتھ جگہ عطا فرمائیں گے جو انبیاءؑ کے بعد ہیں، جن کو صدیقین کہا جاتا ہے یعنی وہ اجلہ صحابہ جنہوں نے بغیر کسی جھجک اور مخالفت کے اول ہی ایمان قبول کر لیا۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ، پھر تیسرے درجہ کے حضرات شہداء کے ساتھ ہوں گے شہداء وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال قربان کر دیا، پھر چوتھے درجہ کے حضرات صلحاء کے ساتھ ہوں گے، اور صلحاء وہ لوگ ہیں جو اپنے ظاہر و باطن میں اعمال صالحہ کے پابند ہیں،

خلاصہ۔

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت کرنے والے ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز اور مقبول ہیں جن کے چار درجے بتلائے گئے ہیں، انبیا، صدیقین، شہداء اور صالحین،

شانِ نزول۔

یہ آیت ایک خاص واقعہ کی بناء پر نازل ہوئی ہے جسکو امام تفسیر حافظ ابن کثیر نے متعدد اسانید سے نقل کیا ہے،

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک روز ایک صحابی رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے دل میں آپ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہے، اپنی بیوی سے بھی، اپنی اولاد سے بھی، بعض

اوقات میں اپنے گھر میں بے چین رہتا ہوں یہاں تک کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کی زیارت کرلوں تب سکون ہوتا ہے، اب مجھے فکر ہے کہ جب اس دنیا سے آپ کی وفات ہوجائے اور مجھے بھی موت آجائے گی تو میں جانتا ہوں کہ آپ جنت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ درجاتِ عالیہ میں ہوں گے، اور مجھے اول تو یہ معلوم نہیں کہ میں جنت میں پہنچوں گا بھی یا نہیں، اگر پہونچ بھی گیا تو میرا درجہ آپ سے بہت نیچے ہوگا، میں وہاں آپ کی زیارت نہ کرسکوں گا تو مجھے کیسے صبر آئے گا؟

آنحضرت ﷺ نے ان کا کلام سن کر کچھ جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہوگئی ومن یطع اللہ والرسول فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھدآء والصلحین اس وقت آنحضرت ﷺ نے ان کو بشارت سنادی کہ اطاعت گذاروں کو جنت میں انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کے ساتھ ملاقات کا موقع ملتا رہے گا، یعنی درجاتِ جنت میں تفاضل اور اعلیٰ اولیٰ ہونے کے باوجود باہم ملاقات ومجالست کے مواقع ملیں گے،

جنت میں ملاقات کی چند صورتیں،

جس کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ اپنی اپنی جگہ سے ایک دوسرے کو دیکھیں گے جیسا کہ مؤطا امام مالکؒ میں بروایت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ جنت اپنی کھڑکیوں میں اپنے سے اوپر کے طبقات والوں کو دیکھیں گے جیسے دنیا میں تم ستاروں کو دیکھتے ہو،

اور یہ بھی صورت ہوگی کہ درجات میں ملاقات کے لئے آیا کریں گے، جیسا کہ ابن جریر نے بروایت ربیعؒ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اونچے درجات والے نیچے درجات کے طرف اُتر کر آیا کریں گے اور ان کے ساتھ ملاقات اور مجالست ہوا کریگی،

اور یہ بھی ممکن ہے کہ نیچے کے درجات والوں کو ملاقات کے لئے اعلیٰ درجات میں جانے کی اجازت ہو، اس آیت کی بناء پر رسول کریم ﷺ نے بہت سے لوگوں کو جنت میں اپنے ساتھ رہنے کی بشارت دی،

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت کعب بن اسلمیؓ آنحضرت ﷺ کے ساتھ رات گذارتے تھے، ایک رات تہجد کے وقت کعب اسلمی نے آنحضرت ﷺ کے لئے وضو کا پانی اور مسواک وغیرہ ضروریات لاکر رکھیں، تو آپؐ نے خوش ہو کر فرمایا، مانگو کیا مانگتے ہو، کعب اسلمیؓ نے عرض کیا، میں جنت میں آپ کی صحبت چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا اور کچھ؟ تو انھوں نے عرض کیا اور کچھ نہیں، اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو ''اعنی علیٰ نفسک بکثرۃ السجود'' یعنی تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا لیکن اس میں تم بھی میری مدد اس طرح کرو کہ کثرت سے سجدے کیا کرو، یعنی نوافل کی کثرت کرو۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں اس بات کی شہادت دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ہیں، اور میں پانچ وقت کی نماز کا بھی پابند ہوں، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہوں، اور رمضان کے روزے بھی رکھتا ہوں، یہ سنکر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مرجائے وہ انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا، بشرطیکہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرے۔

اسی طرح ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدقین والشہداء ''یعنی وہ بیوپاری جو سچا اور امانتدار ہو وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''

قرب کی شرط محبت ہے

رسول کریم ﷺ کی صحبت اور رفاقت آپؐ کے ساتھ محبت کرنے سے حاصل ہوگی، چنانچہ صحیح بخاری میں طرقِ متواترہ کے ساتھ صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص کا کیا درجہ ہوگا جو کسی جماعت سے محبت اور تعلق رکھتا ہے مگر عمل میں ان کے درجہ کو نہیں پہنچا، آپؐ نے فرمایا: المرأ مع من احب ''یعنی محشر میں ہر شخص اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے''۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کو دنیا میں کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس حدیث سے، کیونکہ اس حدیث نے ان کو یہ بشارت دیدی کہ رسول کریم ﷺ کے ساتھ محبت کرنے والے محشر اور جنت میں بھی حضورؐ کے ساتھ ہوں گے،

رسول اللہ ﷺ کی رفاقت کسی رنگ ونسل پر موقوف نہیں۔

طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حبشی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ آپ ہم سے حسنِ صورت اور حسین رنگ میں بھی ممتاز ہیں، اور نبوت و رسالت میں بھی، اب اگر میں بھی اس چیز پر ایمان لے آؤں جس پر آپؐ ایمان رکھتے ہیں، اور وہی عمل کروں جو آپ کرتے ہیں، تو کیا میں بھی جنت میں آپؐ کے ساتھ ہو سکتا ہوں؟

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہاں ضرور (تم اپنی حبشیانہ بدصورتی سے نہ گھبراؤ) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جنت میں کالے رنگ کے حبشی سفید اور حسین ہو جائیں گے، اور ایک ہزار سال کی مسافت سے چمکیں گے، اور جو شخص لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو اس کی فلاح ونجات اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو جاتی ہے، اور جو شخص سبحان اللہ وبحمدہ پڑھتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں،

یہ سنکر مجلس میں سے ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہؐ جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حسنات کی اتنی سخاوت ہے تو ہم پھر کیسے ہلاک ہو سکتے یا عذاب میں کیسے گرفتار ہو سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا (یہ بات نہیں) حقیقت یہ ہے کہ قیامت میں بعض آدمی اتنا عمل اور حسنات لے کر آئیں گے کہ اگر ان کو پہاڑ پر رکھدیا جائے تو پہاڑ بھی ان کے بوجھ کا تحمل نہ کر سکے، لیکن اس کے مقابلہ میں جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں آتی ہیں اور ان سے موازنہ کیا جاتا ہے تو انسان کا عمل ان کے مقابلہ میں ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کو اپنی رحمت سے نوازیں،

اس حبشی کے سوال وجواب ہی پر سورۂ دہر کی یہ آیت نازل ہوئی، هل اتى على الإنسان حين من الدهر لم يكن شيئاً مذكوراً حبشی نے حیرت سے سوال کیا یا رسول اللہ میری آنکھیں بھی ان نعمتوں کو دیکھیں گی جنکو آپ کی مبارک آنکھیں مشاہدہ کریں گی؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں ضرور"۔ یہ سنکر حبشی نومسلم نے رونا شروع کیا، یہاں تک کہ روتے روتے وہیں جان دیدی، اور آنحضرتؐ نے اپنے دست مبارک سے اس کی تجہیز و تکفین فرمائی۔

درجات کی تفصیل

آیت کی تفسیر مع شانِ نزول اور متعلقہ تشریحات کے بیان ہو چکی، اب ایک بات قابلِ غور باقی رہ گئی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا جن لوگوں پر انعام ہے ان کے چار درجے بیان فرمائے گئے ہیں، یہ درجے کس اعتبار سے ہیں، اور ان چار درجوں میں باہمی نسبت اور فرق کیا ہے، اور کیا یہ چاروں درجے کسی ایک شخص میں جمع ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرات مفسرین نے اس بارے میں مختلف اقوال اور طویل تفصیل لکھی ہے، بعض نے فرمایا کہ یہ چاروں درجے ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتے ہیں، اور یہ سب صفات متداخلہ کی طرح ہیں، کیوں کہ قرآن کریم میں جس کو نبی فرمایا گیا ہے اس کو صدیق وغیرہ کے القاب بھی دے گئے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے: انه كان صديقاً نبياً۔ اور حضرت یحیٰی علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: ونبياً من الصلحين، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق وكهلا من الصلحين آیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ مفہوم و معنیٰ کے اعتبار سے یہ چار صفات اور درجات الگ الگ ہیں لیکن یہ سب صفات ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتی ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مفسر، محدث، فقیہ، مورخ اور متکلم مختلف صفات علماء کی ہیں، لیکن بعض علماء ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو مفسر بھی ہوں محدث بھی فقیہ بھی اور مورخ و متکلم بھی، یا جس طرح ڈاکٹر، انجینیر، پائلٹ مختلف صفات ہیں، مگر یہ سب کسی ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتی ہیں۔

البتہ عرف عام میں قاعدہ ہے کہ جس شخص پر جس صفت کا غلبہ ہوتا ہے اسی کے نام سے وہ معروف ہو جاتا ہے، طبقات پر کتابیں لکھنے والے اس کو اسی طبقہ میں شمار کرتے ہیں، اسی وجہ سے علماءِ مفسّرین نے فرمایا کہ "صدیقین" سے مراد اجلہ صحابہ اور شہداءِ احد اور "صالحین" سے عام نیک مسلمان مراد ہیں،

اور امام راغب اصفہانی نے ان چاروں درجات کو مختلف درجات قرار دیا ہے، تفسیر بحرِ محیط، روح المعانی، اور مظہری میں بھی یہی مذکور ہے، یعنی یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو چار قسموں میں تقسیم کر کے ہر ایک کے لئے درجات اعلیٰ وادنیٰ مقرر فرمائے ہیں، اور عام مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی ہے، کہ وہ ان میں سے کسی کے درجہ سے پیچھے نہ رہیں، علمی اور عملی جدوجہد کے ذریعہ ان درجات تک پہونچنے کی کوشش کریں، ان میں نبوت ایک ایسا مقام ہے جو جدوجہد سے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن انبیاء کی معیت پھر بھی حاصل ہو جاتی ہے، امام راغبؒ نے فرمایا کہ ان درجات میں سب سے پہلا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جنکو قوت الٰہیہ کی امداد حاصل ہے، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو قریب سے دیکھ رہا ہو، اسی لئے حق تعالیٰ نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا "افتمارونه علیٰ مایریٰ"،

صدیقین کی تعریف

دوسرا درجہ صدیقین کا ہے، اور وہ وہ لوگ ہیں جو معرفت میں انبیاء علیہم السلام کے قریب ہیں، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دور سے دیکھ رہا ہو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا میں کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کر سکتا جس کو نہ دیکھا ہو، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن ان کے قلوب نے حقائقِ ایمان کے ذریعہ دیکھ لیا ہے، اس دیکھنے سے حضرت علیؓ کی مراد اسی قسم کی رویت ہے کہ ان کی معرفت علمی مثل دیکھنے کے ہے۔

شہدا کی تعریف

تیسرا درجہ شہداء کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو دلائل و براہین کے ذریعہ جانتے ہیں، مشاہدہ نہیں ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو آئینہ میں قریب سے دیکھ رہا ہو، جیسے حضرت حارثہ نے فرمایا کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے رب کریم کے عرش کو دیکھ رہا ہوں،

اور حدیث ان تعبد اللہ کانک براہ میں بھی اسی قسم کی رویت مراد ہو سکتی ہے۔

صالحین کی تعریف

چوتھا درجہ صالحین کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو تقلید و اتباع کے ذریعہ پہچانتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی چیز کو آئینہ میں دور سے دیکھے، اور حدیث میں فان لم تکن تراہ فانہ یراک، وارد ہوا ہے اس میں بھی رویت کا یہی درجہ مراد ہو سکتا ہے، امام راغب اصفہانی کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ یہ درجات معرفت رب کے درجات ہیں، اور معرفت کے مختلف درجات کی بناء پر مختلف مدارج ہیں، بہر حال آیت کا مضمون صاف ہے کہ اس میں مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت کرنے والے درجات عالیہ کے رہنے والوں کے ساتھ ہوں گے، اللہ تعالیٰ یہ صحبت ہم سب کو نصیب کرے۔ آمین

تفسیر ماجدی۔

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریگا تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے اپنا خاص انعام کیا ہے یعنی پیمبر اولیاء اور شہید اور صالحین اور یہ کیسے اچھے رفیق ہیں (۶۹)

تفسیر:

دنیا کی مادی اور حسی نعمتیں چاہے جتنی بھی ہوں۔ انسان اس سے لطف ولذت لینے میں کچھ کمی ہی محسوس کرتا ہے۔ اگر ساتھ ہی یاران بزم اور شرکا صحبت بھی اپنے ہم مذاق اور دلپسند نہ ہوں۔ یہاں بشارت اسی نعمت عظیم کی مل رہی ہے کہ اہل جنت کو مادی وروحانی ہر قسم کی نعمتوں کے علاوہ صحبت بھی پاکیزہ ترین، بہترین انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے والوں کی نصیب ہوگی۔ حسن اولئک رفیقا میں ایک پہلو حیرت کا بھی ہے اور اسی لئے ترجمہ "کیسے اچھے" سے کیا گیا ہے۔ فیہ معنی التعجب کانہ قیل وما احسن اولئک رفیقا (کشاف) ومن یطع اللہ والرسول۔ اس اطاعت کا تعلق احکام اور واجبات ضروری سے ہے۔ ورنہ اگر فرائض وواجبات کے علاوہ مستحبات، نوافل، تطوعات کا بھی اسی قدر اہتمام ہو جائے تو پھر درجہ ولایت خود ہی حاصل ہو جائیگا اور بطور انعام رفاقت اولیاء نصیب ہونے کے کوئی معنی نہ رہیں گے۔ اولئک مع الذین انعم اللہ علیہم۔ یعنی باوجود اپنے اعمال میں کمی اور کوتاہی رہ جانے کے اور باوجود بالذات اور کاملین سے مرتبہ میں فروتر ہونے کے انہیں ان کاملین کی جنت نصیب ہو جائے گی۔ انعم اللہ علیہم۔ یہ انعام کمال قرب ووصول کی صورت میں ہوگا۔ صدیقین۔ یعنی بات کے کھرے اور معاملہ کے سچے ایسے کہ سچائی اور حق پسندی گویا ان کی فطرت میں رچ گئی اور ان کی طبیعت کا جزء بن گئی ہے۔ ایمان کے ہر جزء سے متعلق ان کی تصدیق کامل ہوتی ہے۔ ریب وشک کے حدود سے بالاتر۔ کل من صدق بکل الدین لایتخالجہ فیہ شک فھو صدیق (کبیر) المبالغ فی الصدق والتصدیق (قرطبی) اردو میں انھی کو اولیاء کہتے ہیں۔ قرب حق میں ان کا نام انبیاء کے بعد ہی ہوتا ہے۔ افضل الخلق ھم الانبیاء علیہم السلام وبعدھم الصدیقون (کبیر) شھدآء۔ شہید وہ ہے جو دین کی محبت میں اپنی جان تک سے دریغ نہ کرے اور عمل سے ثابت کردے کہ جس چیز پر وہ ایمان لایا تھا، وہ اسے اس قدر عزیز تھی کہ اس کی خاطر اس نے اپنی جان تک قربان کردی۔ الصالحین۔ صالحین وہ افراد امت کہلاتے ہیں جو پورے دیندار اور متبع شریعت ہوتے ہیں۔

ترجمہ کنز الایمان

ترجمہ: اور جو اللہ اور اسکے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء (۱۸۱) اور صدیق (۱۸۲) اور شہید (۱۸۳) اور نیک لوگ (۱۸۴) اور کیا ہی اچھے ساتھی ہیں یہ اللہ کا فضل ہے اور کافی ہے اللہ جاننے والا۔

تفسیر:۔

(۱۸۱) تو انبیاء کے مخلص فرمانبردار جنت میں ان کی صحبت و دیدار سے محروم نہ ہونگے۔ (۱۸۲) صدیق انبیاء کے سچے متبعین کو کہتے ہیں جو اخلاص کے ساتھ ان کی راہ پر قائم رہیں مگر اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افاضل اصحاب مراد ہیں جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق۔ (۱۸۳) جنھوں نے راہ خدا میں جانیں دیں۔ (۱۸۴) وہ دیندار جو حق العباد اور حق اللہ دونوں ادا کریں اور ان کے احوال و اعمال اور ظاہر و باطن اچھے اور پاک ہوں۔

شان نزول۔

حضرت ثوبانؓ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کمال محبت رکھتے تھے جدائی کی تاب نہ تھی ایک روز اسقدر غمگین اور رنجیدہ حاضر ہوئے کہ چہرہ کا رنگ بدل گیا تھا حضور نے فرمایا آج رنگ کیوں بدلا ہوا ہے عرض کیا نہ مجھے کوئی بیماری ہے نہ درد بجز اسکے کہ جب حضور سامنے نہیں ہوتے تو انتہا درجہ کی پریشانی ہو جاتی ہے جب آخرت کو یاد کرتا ہوں تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہاں میں کس طرح دیدار پاسکوں گا آپ اعلیٰ ترین مقام میں ہونگے مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے جنت بھی دی تو اس مقام عالی تک رسائی کہاں اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور انہیں تسکین دی گئی کہ باوجود فرق منازل کے فرماں برداروں کو باریابی اور معیت کی نعمت سے سرفراز کیا جائیگا۔

تفسیر ثنائی۔

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں وے ان لوگوں کے ساتھ ہونگے جن پر خدا نے انعام کئے یعنی اللہ کے نبی اور صدیق اور شہداء اور نیکوکار اور یہ لوگ بہت ہی اچھے رفیق ہیں

شان نزول۔

ایک شخص ثوبان نامی آنحضرت سے نہایت محبت رکھتا تھا ایک دفعہ نہایت بیقراری میں بھاگا آیا آپ نے پوچھا ثوبان کیا حال ہے اچھے ہو کہا کہ حضرت اچھا ہوں کوئی بیماری نہیں فقط میں نے آج آپ کی زیارت نہ کی تھی اس لئے گھبراہٹ ہوئی اور مجھے قیامت یاد آئی تو اور بھی زائد رنج ہوا اس لئے کہ جنت میں آپ بلند مرتبہ انبیاء کے ساتھ ہونگے وہاں ہماری رسائی کیسے ہوگی کہ ہم دیدار پرانوار سے مشرف ہوں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔م۔

راقم کہتا ہے کہ آپ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ ہر معاملہ میں آپ کی سنت محفوظ رکھکر اس پر عمل کرے ورنہ دعوی محبت غلط

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں وے ان لوگوں کے ساتھ ہونگے جن پر خدا نے احسان اور انعام کئے یعنی اللہ کے نبی اور صدیق اور شہید اور نیکوکار اور یہ لوگ بہت ہی اچھے رفیق ہیں ان کی صحبت میں رہنے والا بھی وہی انعام پاویگا جو ان کو ملے گا یہ مہربانی خاص خدا کی طرف سے ہوگی نہ کسی مخلوق کی طرف سے جو ان پر کسی قسم کا احسان جتلا دے اور اللہ ہی جاننے والا کافی ہے موافق اپنے علم کے ان کو دے گا ان کو سوال تک کی بھی نوبت نہ پہونچے گی

تفہیم القرآن۔ (ص ۳۷۰ ج ۱)

ترجمہ: جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ۹۹۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں ۱۰۰۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لئے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے۔

تفسیر:

۹۹۔ صدیق سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راستباز ہو جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجہ پر ہو جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے اس کے مقابلہ میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے جس کی سیرت ایسی ستھری ہو اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرز عمل کا اندیشہ نہ ہو۔

شہید کے اصل معنی گواہ کے ہیں اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرز عمل سے شہادت دے۔ اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا اسے واقعی سچے دل سے حق سمجھتا تھا اور اسے اتنا عزیز رکھتا تھا کہ اس کے لئے جان قربان کرنے میں بھی اس نے دریغ نہ کیا۔ ایسے راستباز لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابل اعتماد ہوں کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں اس کا صحیح و برحق ہونا بلا تامل تسلیم کر لیا جائے۔

صالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات و عقائد میں اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویہ رکھتا ہو۔

۱۰۰؎ یعنی وہ انسان خوش قسمت ہے جسے ایسے لوگ دنیا میں رفاقت کے لئے میسر آئیں اور جس کا انجام آخرت میں بھی ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہو۔ کسی آدمی کے احساسات مردہ ہو جائیں تو بات دوسری ہے ورنہ درحقیقت بدسیرت بدکردار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دنیا ہی میں ایک عذاب علیم ہے کجا کہ آخرت میں بھی آدمی انھیں کے ساتھ اس انجام سے دوچار ہو جو ان کے لئے مقدر ہے اسی لئے اللہ کے نیک بندوں کی ہمیشہ یہی تمنا رہی ہے کہ ان کو نیک لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو اور مرکر بھی وہ نیک ہی لوگوں کے ساتھ رہیں۔

جامع البیان الطبری (ص ۲۲۳۔۲۲۶ ج ۴)

يعني بذلك جلّ ثناؤه: ومن يطع الله والرسول بالتسليم لأمرهما، وإخلاص الرضابحكمهما، والانتهاء إلى أمرهما، والانزجار عما نهياعنه من معصية الله، فهو مع الذين أنعم الله عليهم بهدايته والتوفيق لطاعته في الدنيا من أنبيائه وفي الآخرة إذا دخل الجنة.﴿وَالصِّدِّيقِينَ﴾وهم جمع صدّيق،

واختلف في معني الصدّيقين، فقال بعضهم : الصدّيقون : تُبّاع الأنبياء الذين صدّقوهم واتبعوا منهاجهم بعدهم حتى لحقوا بهم. فكان "الصدّيق فعيل "علي مذهب قائلي هذه المقالة من الصدق، كما يقال رجل سكّير من السكر،إذاكان مدمناًعلي ذلك،وشرّيب وخمّير.

وقال آخرون: بل هو فعيل من الصدقة. وقد روي عن رسول الله ﷺ بنحو تأويل من قال ذلك ؛ وهو ما :

۷۸۳۰—حدثنا به سفيان بن وكيع، قال: ثنا خالد بن مخلد، عن موسي بن يعقوب، قال: أخبرتني عمتي قريبة بنت عبدالله بن وهب بن زمعة،عن أمها كريمة بنت المقداد، عن ضباعة بنت الزبير، وكانت تحت المقداد عن المقداد، قال: قلت للنبي ﷺ: شيء سمعته منك شككت فيه! قال :"إذاشكّ أحدُكُم في الأمرِفَلْيَسْئَلْنِي عنه !"قال: قلت قولك

في أزواجك: إنيّ لارجو لهن من بعدي الصدّ يقين؟ قال: "من تعنّون الصّدّيقِيْنَ؟"قلت: أولادنا الذين يهلكون صغاراً.قال : "لا، ولكن الصّدّيقِينَ هم المصدّ قون"

وهذا خبرلوكان إسناده صحيحاًلم نستجز أن نعدوه إلى غيره، ولو كان في إسناده بعض ما فيه . فإذكان ذلك كذلك، فالذي هو أولى بالصدّ يق أن يكون معناه المصدّق قوله بفعله، إذاكان الفعيل في كلام العرب إنما يأتي إذاكان ماخوذاًمن الفعل بمعنى المبالغة، إما في المدح وإمافي الذم،ومنه قوله جلّ ثناؤه في صفة مريم:﴿وَأُمُّه صدِّيقَةٌ﴾. وإذاكان معنى ذلك ما وصفنا، كان داخلاً من كان موصوفاً بما قلنا في صفة المتصدقين والمصدقين:﴿وَالشُّهَدَاء﴾وهم جمع شهيد: وهو المقتول في سبيل الله، سمي بذ لك لقيامه بشهادة الحق في جنب الله حتى قتل. ﴿وَالصَّالِحِيْنَ﴾وهم جمع صالح:وهو كل من صلحت سريرته وعلانيته.

واماقوله جلّ ثناؤه:﴿وَحَسُنَ أُوْلٰئِكَ رَفِيْقاً﴾فانه يعني : وحسن هؤلاء الذ ين نعتهم . ووصفهم رفقاء في الجنة، والرفيق في لفظ الواحد بمعنى الجميع،كما قال الشاعر:

نَصَبْنَ الْهَوٰى ثُمّ ارْتَمَيْنَ قُلوبَنا— بِاَسْهُم أعداءٍ وَهُنَّ صَدِيْقُ.

بمعني:وهن صدائق. وأما نصب"الرفيق"فإن أهل العربية مختلفون فيه، فكان بعض نحويي البصرة يرى أنه منصوب على الحال، ويقول: وهو كقول الرجل: كرم زيد رجلاً، ويعد ل به عن معني: نعم الرجل، ويقول: إنّ نعم لاتقع إلى على اسم فيه أ لف ولام أوعلى نكرة . وكان بعض نحو يي الكوفة يرى أنه منصوب على التفسير، وينكر أن يكون حالاً، ويستشهد على ذلك بأن العرب تقول :كرم زيد من رجل، وحسن أولئك من رفقاء؛ وأن دخول "من"دلالة على أن الرفيق مفسره.قال: وقد حكي عن العرب: نعمتم رجالاً، فدل على أن ذلك نظير قوله: وحسنتم رفقاء. وهذا القول أولى بالصواب لعلة التي ذكرناالقائليه. وقد ذكر أن هذ ه الآية نزلت لأن قوماً حزنوا على فقد رسول الله ﷺحذ راً أن لايروه في الآخرة. ذكر الرواية بذلك:

۷۸۳۱-حدثنا ابن حميد، قال: ثنا يعقوب القمي، عن جعفر بن أبي المغيرة، عن سعيد بن جبير، قال: جاء رجل من الانصار إلي النبي ﷺ وهو محزون، فقاله النبي ﷺ: "يَا فُلَانُ مَا لِي أَرَاکَ مَحْزُوْنًا"؟ قال: يا نبي الله شيءٌ فكرت فيه. فقال: "ماهو؟" قال: نحن نغدو عليک ونروح، ننظر في وجهک ونجالسک، غداً ترفع مع النبيين فلا نصل إليک! فلم يرد النبي ﷺ شيئاً. فأتاه جبرئيل عليه السلام بهذه الآية: ﴿مَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولٰٓئِکَ رَفِيْقًا﴾ قال: فبعث إليه النبي ﷺ فبشره.

۷۸۳۲-حدثنا ابن حميد، قال: ثنا جرير، عن منصور، عن أبي الضحي، عن مسروق، قال: قال أصحاب رسول الله ﷺ: يا رسول الله ما ينبغي لنا أن نفارقک في الدنيا، فإن لو قد مت رُفعت فوقنا فلم نرک! فأنزل الله: ﴿وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ﴾... الآية.

۷۸۳۳-حدثنا بشر بن معاذ، قال: ثنا يزيد، قال: ثنا سعيد، عن قتادة، قوله: ﴿مَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ﴾ ذكرلنا أن رجالاً قالوا: هذا نبي الله نراه في الدنيا، فأما في الآخرة فيرفع فلا نراه! فأنزل الله: ﴿ومن يطع الله والرسول﴾... إلى قوله: ﴿رفيقا﴾.

۷۸۳۴-حدثنا محمد بن الحسين، قال: ثنا أحمد بن المفضل، قال ثنا أسباط، عن السدي: ﴿مَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾... الآية. قال: قال ناس من الأنصار: يا رسول الله، إذا أدخلک الله الجنة فكنت في أعلاها ونحن نشتاق إليک، وكيف نصنع؟ فأنزل الله: ﴿مَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ﴾.

۷۸۳۵-حدثني المثني، قال: ثنا إسحاق، قال: ثنا ابن أبي جعفر، عن أبيه، عن الربيع، قوله: ﴿مَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ﴾... الآية. قال: إن أصحاب النبي ﷺ قالوا: قد علمنا أن النبي ﷺ له فضل على من آمن به في درجات الجنة ممن اتبعه وصدقه، فكيف لهم إذا اجتمعوا في الجنة أن

يرى بعضهم بعضاً؟ فأنزل الله في ذلك فقال: إن الأعلين ينحدرون إلى من هم أسفل فيجتمعون في رياضها، فيذكرون ما أنعم الله عليهم، ويثنون عليه، وينزل لهم أهل الدرجات، فيسعون عليهم بما يشتهون وما يدعون به، فهم في روضة يحبرون ويتنعمون فيه.

وأما قوله: ﴿ذلك الفضل من الله﴾ فإنه يقول: كون من أطاع الله والرسول مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين، ﴿الفضل من الله﴾ يقول ذلك عطاء الله إياهم وفضله عليهم، لا باستيجابهم ذلك لسابة سبقت لهم.

فإن قال قائل: أو ليس بالطاعة وصلوا إلى ما وصلوا إليه من فضله؟ قيل له: إنهم لم يطيعوه في الدنيا إلا بفضله الذي تفضل به عليهم فهداهم به لطاعته، فكل ذلك فضل منه تعالى ذكره.

وقوله: ﴿وكفى بالله عليماً﴾ يقول: حسب العباد بالله الذي خلقهم عليماً بطاعة المطيع منهم ومعصية العاصي، فإنه لا يخفى عليه شيء من ذلك ولكنه يحصيه عليهم ويحفظه حتى يجازي جميعهم، فيجزي المحسن منهم بالإحسان، والمسيء منهم بالإساءة، ويعفوا عمن شاء من أهل التوحيد.

كشاف:۔

(وحسن أولئك رفيقا) فيه معنى التعجب كأنه قيل وما أحسن أولئك رفيقا، ولاستقلاله بمعنى التعجب قرىء وحسن بسكون السين يقول المتعجب: حسن الوجه وجهك وحسن الوجه وجهك بالفتح والضم مع التسكين، والرفيق كالصديق والخليط في استواء الواحد والجمع فيه، ويجوز أن يكون مفرداً بين به الجنس في باب التمييز، وروى "أن ثوبان مولى رسول الله ﷺ كان شديد الحب لرسول الله ﷺ قليل الصبر عنه، فأتاه يوما وقد تغير وجهه ونحل جسمه وعرف الحزن في وجهه، فسأله رسول الله ﷺ عن حاله فقال: يارسول الله ما بي من وجع غير أني إذا لم أرك اشتقت اليك واستوحشت وحشة شديدة حتى

القاک افذکرت الآخرة فخفت أن لا اراک هناک لأني عرفت انک ترفع مع النبيين وأن أدخلت الجنة کنت في منزل دون منزلک وأن لم ادخل فذاک حين لا أراک أبدا فنزلت فقال رسول الله ﷺ: "والذی نفسي بيده لا يؤمن عبد حتی اکون احبّ أليه من نفسه وأبويه وأهله وولده والناس اجمعين "وحکی جماعة من الصحابة .

تفسير معالم التنزيل (ج۱ص۱۰۰)

قوله تعالیٰ: ﴿مَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّنَ ﴾الآية، نزلت في ثوبان مولیٰ رسول الله ﷺ وكان شديد الحب لرسول الله ﷺ قليل الصبر عنه، فأتاه ذات يوم قد تغير لونه يعرف الحزن في وجهه، فقال رسول الله ﷺ: "ماغيّر لونک"؟ فقال: يا رسول الله ما بي مرض ولا وجع غير اني إن لم أرک استوحشتُ وحشةً شديدة حتی ألقاک، ثم ذکرتُ الآخرة فاخاف أن لا أراک لانک تُرفع مع النبيين، وانّي إن دخلت الجنة کنتُ في منزلةادنی من منزلتک، وإن لم أدخل الجنة لا أراک أبدًا، فنزلت هذه الآية، وقال قتادة: قال بعض أصحاب النبي ﷺ: کيف يکون الحال في الجنةوأنت في الدرجات العلی ونحن اسفل منک؟ وکيف نراک؟ فأنزل الله تعالیٰ هذهِ الآية: ﴿ومَن يُطِعِ الله ﴾في أداء الفرائض، ﴿والرسول﴾في السنن ﴿فَأُولٰئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّنَ﴾أي لا تفوتهم رؤية الانبياء ومجالستهم لأنهم يرفعون إلیٰ درجة الأنبياء، ﴿ والصدّيقين﴾وهم أفاضل اصحاب النبي ﷺ، والصدّيق المبالغ في الصدق، ﴿والشهداء﴾ قيل: هم الذين استشهدوا في يوم أحد، وقيل: الذين استشهدوا في سبيل الله، وقال عکرمة: النبيون ههنا محمد ﷺ، والصديق أبوبکر، والشهداء عمر وعثمان وعلي رضي الله عنهم، ﴿والصالحين ﴾سائر الصحابة رضي الله عنهم، ﴿وحَسُنَ اولئک رفيقا﴾، يعني رفقاء الجنة والعرب تضع الواحد موضع الجمع، کقوله تعالیٰ:﴿ ثم نخرجُکم طِفلاً﴾أي: أطفالا ﴿ويُوَلّونَ الدُّبر﴾أي: الأدبار أخبرنا عبد الواحد بن أحمد المليحي انا أبو

محمد الحسن بن أحمد المخلدي أنا أبو العباس السراج أنا قتيبة بن سعد أنا حماد بن زيد عن ثابت عن أنس أن رجلاً قال: يا رسول الله ﷺ الرجل يحب قوماً ولم يلحق بهم؟ فقال النبي ﷺ : "المرء مع من أحبّ، أخبرنا أحمد بن عبد الله الصالحي وأبوعمر ومحمد بن عبد الرحمن النسوي قالا: أخبرنا احمد بن الحسن الحيري أنا أبو عباس الاصم انا أبو يحي زكريا بن يحي المروزي انا سفيان بن عُيينة عن الزهري عن أنس بن مالک رضي الله عنه قال: قل رجل : يارسول الله متى الساعة ؟ قال: "وما أعددت لها"؟ قال: لا شيء إلا أني أحب الله ورسوله قال : "فانت مع من أحببت".

﴿ذلک الفضل من الله وكفى بالله عليماً﴾ أي: بثواب الآخرة، وقيل : من أطاع رسول الله وأحبه، وفيه بيان أنهم لن ينالوا تلک الدرجة بطاعتهم، وإنما نالوها بفضل الله عزّ وجلّ . أخبرنا أحمد بن عبد الله الصالحي أنا أبو بكر بن الحسن الحيري أنا احب بن أحمد الدوسي أنا عبد الرحيم بن منيب أنا يعلي بن عبيد عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة قال: رسول الله ﷺ : "قاربوا وسدّدوا واعلموا أنه لا ينجو أحدٌ منكم بعمَلِه"، قالوا: ولا أنت يارسول الله ؟ قال: "ولاأنا إلا أن يتغمدني الله بفضلٍ منه ورحمة"

تفسیر کبیر (ص۱۳۲_۱۳۶ج۳)

(۶۹) ﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِيْقًا﴾ (۷۰) ﴿ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا﴾

اعلم أنه تعالى لما أمر بطاعة الله وطاعة الرسول بقوله: ﴿يا أيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول﴾ (النساء : ۵۹) ثم زيف طريقة الذين تحاكموا إلى الطاغوت وصدوا عن الرسول، ثم أعاد الأمر الرسول مرة أخرى فقال ﴿وما أرسلنا من رسول إلا ليطاع بإذن الله﴾ (النساء) ثم رغب في تلک الطاعة بقوله :﴿لكان خيراً لهم وأشد

تثبيتاوإذا لآتيناهم من لدناأجراً عظيماً .ولهديناهم صراطاً مستقيماً﴾(النساء ـ ٦٦ـ٦٨) أكد الأمر بطاعة الله وطاعة الرسول في هذه الآية مرة أخرى فقال: ﴿ومن يطع الله والرسول فاولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين﴾ إلى آخر الآية وههنا مسائل :

المسألة الأولى: ذكروا في سبب النزول وجوها: الأول: روى جمع من المفسرين أن ثوبان مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم كان شديد الحب لرسول الله صلى الله عليه وسلم قليل الصبرعنه فأتاه يوما وقد تغيروجهه ونحل جسمه وعرف الحزن واستو حشت وحشة شديدة حتى الفاك، فذكرت الآخرة فخفت أن لا أراك هناك، لأني إن أدخلت الجنة فأنت تكون في درجات النبيين وأنا في درجة العبيد فلا أراك، وإن أنا لم أدخل الجنة فحينئذ لا أراك أبداً، فنزلت هذه الآية.
الثاني: قال السدي: ان ناسا من الأنصار قالوا: يا رسول الله إنك تسكن الجنة في أعلاها، ونحن نشتاق اليك، فكيف نصنع ؟ فنزلت الآية .
الثالث : قال مقاتل: نزلت في رجل من الأنصار قال للنبي صلى الله عليه وسلم : يا رسول الله إذا خرجنا من عندك إلى أهالينا اشتقنا اليك، فما ينفعنا شيء حتى نرجع اليك، ثم ذكرت درجتك في الجنة، فكيف لنا برؤيتك ان دخلنا الجنة ؟ فانزل الله هذه الآية، فلما توفي النبي صلى الله عليه وسلم أتى الانصار ولده وهو في حديقة له فأخبره بموت النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: اللهم أعمني حتى لا أرى شيئا بعده إلى أن ألقاه، فعمي مكانه، فكان يحب النبي حبا شديدا فجعله الله معه في الجنة.
الرابع: قال الحسن: ان المؤمنين قالوا للنبي عليه السلام: ما لنا منك إلا الدنيا، فاذا كانت الآخرة رفعت في الأولى فحزن النبى صلى الله عليه وسلم وحزنوا، فنزلت هذه الآية. قال المحققون: لا ننكر صحة هذه الروايات إلا أن سبب نزول الآية يجب أن يكون شيئا أعظم من ذلك، وهو البحث على الطاعة والترغيب فيها، فانك تعلم أن خصوص السبب لا يقدح في عموم اللفظ، فهذه الآية عامة فى حق جميع المكلفين، وهو أن كل من أطاع الله وأطاع الرسول فقد فاز بالدرجات العالية والمراتب الشريفة عندالله تعالى.

المسألة الثانية : ظاهر قوله :﴿ ومن يطع الله والرسول ﴾ يوجب الاكتفاء بالطاعة الواحدة . لأن اللفظ الدال على الصفة يكفي في العمل به في جانب الثبوت حصول ذلك المسمى مرة واحدة. قال القاضي : لابد من حمل هذا على غير ظاهره، وأن تحمل الطاعة على فعل المأمورات وترك جميع المنهيات، إذ لو حملناه على الطاعة الواحدة لدخل فيه الفساق والكفار، لأنهم قد يأتون بالطاعة الواحدة. وعندي فيه وجه آخر، وهو أنه ثبت في أصول الفقه أن الحكم المذكور عقيب الصفة مشعر بكون ذلك الحكم معللا بذلك الوصف، إذا ثبت هذا فنقول: قوله: ﴿ من يطع الله ﴾ أي ومن يطع الله في كونه إلها، وطاعة الله في كونه إلها هو معرفته والاقرار بجلاله وعزته وكبريائه وصمديته، فصارت هذه الآية تنبيها على أمرين عظيمين من أحوال المعاد، فالأول : هو أ منشأ جميع السعادات يوم القيامة إشراق الروح بأنوار معرفة الله، وكل من كانت هذه الأنوار في قلبه أكثر،وصفاؤها أقوى،وبعدها عن التكدر بمحبة عالم الاجسام أتم كان إلى السعادة أقرب وإلى الفوز بالنجاة أوصل. والثاني : أنه تعالى ذكر في الآية المتقدمة وعد أهل الطاعة بالأجر العظيم والثواب الجزيل والهداية إلى الصراط المستقيم، ثم ذكر في هذه الآية وعدهم بكونهم مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين، وهذا الذي وقع به في الختم لا بد أن يكون أشرف وأعلى مما قبله،ومعلوم أنه ليس المراد من كون هؤلاء معهم هو أنهم يكونون في عين تلك الدرجات، لأن هذا ممتنع، فلا بد وأن يكون معناه أن الأرواح الناقصة إذا استكملت علا ئقها مع الأرواح الكاملة في الدنيا لسبب الحب الشديد، فاذا فارقت هذا العالم ووصلت إلى عالم الآخرة بقيت تلك العلا ئق الروحانية هناك، ثم تصير تلك الأرواح الصافية كالمرايا المجلوة المتقابلة، فكان هذه المرايا ينعكس الشعاع من بعضها على بعض، وبسبب هذه الانعكاسات تصير أنوارها في غاية القوة، فكذا القول في تلك الأرواح فانها لما كانت مجلوة بصقالة المجاهدة عن غبار حب ماسوى الله، وذلك هو المراد من طاعة الله وطاعة الرسول، لم

ارتفعت الحجب الجسدانية أشرقت عليها أنوار جلال الله، ثم انعكست تلك الأنوار من بعضها إلى بعض وصارت الأرواح الناقصة كاملة بسبب تلك العلائق الروحانية، فهذا الاحتمال خطر بالبال والله أعلم بأسرار كلامه.

المسألة الثالثة:ليس المراد بكون من أطاع الله وأطاع الرسول مع النبيين والصديقين، كون الكل في درجة واحدة، لأن هذا يقتضي التسوية في الدرجة بين الفاضل والمفضول،وإنه لا يجوز . بل المراد كونهم في الجنة بحيث يتمكن كل واحد منهم من رؤية الآخر، وإن بعد المكان، لأن الحجاب إذا زال شاهد بعضهم بعضا، وإذا أرادوا الزيارة والتلاقي قدروا عليه، بهذا هو المراد من هذه المعية.

المسألة الرابعة: اعلم أنه تعالى ذكر النبيين، ثم ذكر أوصافا ثلاثة : الصد يقين والشهداء والصالحين، واتفقوا على أن النبيين مغايرون للصديقين والشهداء والصالحين، فأما هذه الصفات الثلاثة فقد اختلفوا فيها، قال بعضهم : هذه الصفات كلها لموصوف واحد، وهي صفات متداخلة فانه لا يمتنع في الشخص الواحد أن يكون صديقاً وشهيداً وصالحاً. وقال الآخرون: بل المراد بكل وصف صنف من الناس، وهذا الوجه أقرب لأن المعطوف يجب أن يكون مغايرا للمعطوف عليه، وكما أن النبيين غير من ذكر بعدهم، وفكذ لك الصد يقون يجب أن يكونوا غير من بعدهم وكذا القول في سائر الصفات، ولنبحث عن هذه الصفات الثلاث :

الصفة الأولى : الصديق: وهو اسم لمن عادته الصدق، ومن غلب على عادته فعل إذا وصف بذلك الفعل قيل فيه فعيل، كما يقال: سكير وشريب وخمير، والصد ق صفة كريمة فاضلة من صفات المؤمنين، وكفى الصد ق فضيلة أن الايمان ليس إلا التصديق، وكفى الكذ ب مذمة أن الكفر ليس إلا التكذ يب.

إذا عرفت هذا فنقول: للمفسرين في الصد يق وجوه: الأول: أن كل من صد ق بكل الد ين لا يتخالجه فيه شك فهو صديق، والدليل عليه قوله تعالى: ﴿والذين آمنوا بالله ورسله أولئك هم الصد يقون﴾ (الحديد: ١٩)

الثاني: قال قوم: الصديقون أفاضل أصحاب النبي عليه الصلاة والسلام.
الثالث: أن الصديق اسم لمن سبق إلى تصديق الرسول عليه الصلاة والسلام فصار في ذلك قدوة لسائر الناس، وإذا كان الأمر كذلك كان أبوبكر الصديق رضي الله تعالى عنه أولى الخلق بهذا الوصف أما بيان انه سبق إلى تصديق الرسول عليه الصلاة والسلام فلأنه قد اشتهرت الرواية عن الرسول عليه الصلاة و السلام أنه قال: "ما عرضت الاسلام على أحد إلا وله كبوة غير ابي بكر فانه لم يتلعثم" دل هذا الحديث على أنه صلى الله عليه وسلم لما عرض الاسلام على أبي بكر قبله أبو بكر ولم يتوقف، فلو قدرنا أن اسلامه تأخر عن إسلام غيره لزم أن يقال: أن النبي صلى الله عليه وسلم قصر حيث أخر عرض الاسلام عليه، وهذا لا يكون قدحا في أبي بكر، بل يكون قدحا في الرسول ﷺ وذلك كفر، ولما بطل نسبة هذا التقصير إلى الرسول علمنا أنه ﷺ ما قصر في عرض الاسلام عليه، والحديث دل على أن ابابكر لم يتوقف ألبتة فحصل من مجموع الأمرين أن ابابكر رضي الله تعالى عنه أسبق الناس إسلاماً، أما بيانه أنه كان قدوة لسائر الناس في ذلك فلأن بتقدير أن يقال: إن إسلام علي كان سابقاً على إسلام أبي بكر، إلا أنه لا يشك عاقل أن علياما صار قدوة في ذلك الوقت، لأن علياً كان في ذلك الوقت صبياً صغيراً، وكان أيضاً في تربية الرسول عليه الصلاة والسلام، وكان شديد القرب منه بالقرابة وأبو بكر ما كان شديد القرب منه بالقرابة وإيمان من هذا شأنه يكون سبباً لرغبة سائر الناس في الإسلام. وذلك لأنهم اتفقوا على أنه رضي الله عنه لما آمن جاء بعد ذلك بمدة قليلة بعثمان بن عفان رضي الله عنه، وطلحة والزبير وسعد بن أبي وقاص وعثمان بن مظعون رضي الله تعالى عنهم أجمعين حتى أسلموا، فكان إسلامه سبباً لاقتداء هؤلاء الاكابر به، فثبت بمجموع ما ذكرنا أنه رضوان الله عليه كان أسبق الناس إسلاماً، وثبت أن إسلامه صار سبباً لاقتداء أفاضل الصحابة في ذلك الإسلام، فثبت إن أحق الامة بهذه الصفة أبوبكر رضي الله عنه. إذا عرفت هذا فنقول: هذا الذي ذكرناه انه افضل الخلق بعد رسول الله ﷺ وبيانه من وجهين:

الأول: أن إسلامه لما كان أسبق من غيره وجب أن يكون ثوابه أكثر؛ لقوله عليه الصلاة والسلام :"من سنّ سنة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها إلى يوم القيامة" الثاني: أنه بعد أن أسلم جاهد في الله وصار جهاده مفضياً إلى حصول الإسلام لأكابر الصحابة مثل عثمان وطلحة والزبير وسعد بن أبي وقاص وعثمان بن مظعون وعلي رضي الله عنهم، وجاهد علي يوم أحد ويوم الأحزاب في قتل الكفار،ولكن جهاد أبي بكررضي الله عنه أفضى إلى حصول الإسلام لمثل الذين هم أعيان الصحابة، وجهاد علي أفضى إلى الكفار،ولا شك أن الأول أفضل،وأيضاً فأبو بكر جاهد في أول الإسلام حين كان النبي ﷺ في غاية الضعف،وعلي إنما جاهد يوم أحد ويوم الأحزاب،وكان الإسلام قوياً،في هذه الأيام،ومعلوم أن الجهاد وقت الضعف أفضل من الجهاد وقت القوة،ولهذا المعنى قال تعالى:﴿لا يستوي منكم من أنفق قبل الفتح وقاتل أولئك أعظم درجة من الذين أنفقوا من بعد وقاتلوا﴾[الحديد:١٠]فبين أن نصرة الإسلام وقت ما كان ضعيفاً أعظم ثواباً من نصرته وقت ما كان قوياً،فثبت من مجموع ما ذكرنا أن أولى الناس بهذا الوصف هو الصديق، فلهذا أجمع المسلمون على تسليم هذا اللقب له إلا من لا يلتفت إليه فإنه ينكره،ودل تفسير الصديق بما ذكرناه على أنه لا مرتبة بعد النبوّة في الفضل والعلم إلا هذا الوصف وهو كون الإنسان صديقاً،وكما دلّ الدليل عليه فقد دل لفظ القرآن عليه،فإنه أينما ذكر الصديق النبي لم يجعل بينهما واسطة،فقال في وصف إسماعيل:﴿إنه كان صادق الوعد﴾[مريم:٥٤]وفي صفة إدريس﴿إنه كان صديقاً نبياً﴾[مريم:٥٦]وقال :في هذه الآية:﴿من النبيين والصديقين﴾ يعني إنك إن ترقيت من الصديقية وصلت إلى النبوة،وإن نزلت من النبوة وصلت إلى الصديقية،ولا متوسط بينهما، وقال في آية أخرى:﴿والذي جاء بالصدق وصدق به ﴾[الزمر:٣٣]فلم يجعل بينهما واسطة،وكما دلت هذه الدلائل على نفي الواسطة فقد وفق الله هذه الأمة الموصوفة بأنها خير أمة حتى جعلوا الإمام بعد الرسول عليه الصلاة والسلام أبابكر على سبيل الإجماع،ولماتوفي رضوان الله عليه دفنوه إلى جنب رسول الله ﷺ،

وما ذاك إلا أن الله تعالیٰ رفع الواسطة بين النبيين والصديقين في هذه الآية فلا جرم ارتفعت الواسطة بينهما في الوجوه التي عددناها.

الصفة الثانية:الشهادة:والكلام في الشهداء قد مر في مواضع من هذاالكتاب ولا بأس بأن نعيد البعض فنقول:لا يجوز أن تكون الشهادة مفسرة بكون الإنسان مقتول الكافر،والذي يدل عليه وجوه:الأول:أن هذه الآية دالة علی أن مرتبة الشهادة مرتبة عظيمة في الدين،وكون الإنسان مقتول الكافر ليس فيه زيادة شرف،لأن هذا القتل قد يحصل في الفساق ومن لامنزلة له عند الله. الثاني:أن المؤمنين قد يقولون:اللهم ارزقنا الشهادة،ولوكانت الشهادة عبارة عن القتل الكافر إياه لكانوا قد طلبوا من الله ذلك القتل وانه غير جائز،لأن طلب صدور ذلك القتل من الكافر كفر،فكيف يجوز أن يطلب من الله ما هو كفر،الثالث:روي أنه ﷺ قال:المبطون شهيد والغريق شهيد،فعلمنا أن الشهادة ليست عبارة عن القتل،بل نقول:الشهيد فعيل بمعنی الفاعل،وهو الذي يشهد بصحة دين الله تعالیٰ تارة بالحجة والبيان،وأخری بالسيف والسنان،فالشهداء هم القائمون بالقسط، وهم الذين ذكر الله في قوله:﴿شهد الله أنه لاإله إلا هو والملٰئكة وأولو العلم قائماً بالقسط﴾[آل عمران:١٨]ويقال للمقتول في سبيل الله شهيد من حيث أنه بذل نفسه في نصرة دين الله،وشهادته له بأنه هو الحق وما سواه هو باطل، وإذا كان من شهداء الله بهذ المعنی كان من شهداء الله في الآخرة، كما قال:﴿وكذالك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء علی الناس﴾[البقرة:١٤٣].

الصفة الثالثة:الصالحون: والصالح هو الذي يكون صالحاً في إعتقاده وفي عمله، فإن الجهل فساد في الإعتقاد، والمعصية فساد في العمل، وإذا عرفت تفسير الصديق والشهيد والصالح ظهر لك ما بين هذه الصفات من التفاوت، وذلك لأن كل من كان اعتقاده ثواباً وكان عمله طاعة وغير معصية فهو صالح، ثم إن الصالح قد قد يكون بحيث يشهد لدين الله بأنه هو الحق وأن ما سواه هو الباطل، وهذه الشهادة تارة تكون بالحجة والدليل وأخری بالسيف، وقد لا يكون الصالح موصوفاً

بكونه قائماً بهذه الشهادة، فثبت أن كل من كان شهيداً كان صالحاً، وليس كل من كان صالحاً شهيداً، فالشهيد أشرف أنواع الصالح، ثم إن الشهيد قد يكون صديقاً وقد لا يكون: ومعنى الصديق الذي كان أسبق إيماناً من غيره، وكان إيمانه قدوة لغيره، فثبت أن كل من كان صديقاً كان شهيداً، وليس كل من كان شهيداً كان صديقاً، فثبت أن أفضل الخلق هم الأنبياء عليهم السلام، وبعدهم الصديقون، وبعدهم من ليس له إلا محض درجة الشهادة، وبعدهم من ليس له إلا محض درجة الصلاح، فالحاصل ان أكابر الملٓئكة يأخذون دين الحق عن الله، والأنبياء يأخذون عن الملٓئكة، كما قال: ﴿ينزل الملا ئكة بالروح من أمره على من يشاء من عباده﴾[النحل:٢] والصديقون يأخذون عن الأنبياء .والشهداء يأخذون عن الصديقين، لأنا بينا أن الصديق هو الذي يأخذ في المرة الأولى عن الأنبياء وصار قدوة لمن بعده، والصالحون يأخذون عن الشهداء، فهذا هو تقرير هذه المراتب وإذا عرفت هذا ظهر لک أنه لا أحد يدخل الجنة إلا وهو داخل في بعض هذه النعوت والصفات.

ثم قال تعالى: ﴿وحسن أولٓئک رفيقاً﴾ وفيه مسائل:

المسألة الأولى: قال صاحب "الكشاف": فيه معنى التعجب. كأنه قيل: ما أحسن أولٓئک رفيقاً.

المسألة الثانية: الرفق في اللغة لين الجانب ولطافة الفعل، وصاحبه رفيق. هذا معنيه في اللغة ثم الصاحب يسمى رفيقاً لا رفاق بعضهم لبعض.

المسألة الثالثة: قال الواحدي: إنما وحد الرفيق وهو صفة لجمع، لأن الرفيق والرسول والبريد تذهب به العرب إلى الواحد وإلى الجمع قال تعالى: ﴿إنا رسول رب العالمين﴾[الشعراء:١٦] ولا يجوز أن يقال: حسن أولٓئک رجلاً، وبالجملة فهذا إنما يجوز في الاسم الذي يكون صفة، أما إذا كان اسماً مصرحاً مثل رجل وامرأة لم يجز، وجوز الزجاج ذلک في الاسم أيضاً وزعم أنه مذهب سيبويه، وقيل: معنى قوله: ﴿وحسن أولٓئک رفيقاً﴾ أي حسن كل واحد منهم رفيقاً، كما قال: ﴿يخرجكم طفلاً﴾ [غافر:٦٧]

المسألة الرابعة: ﴿رفيقا﴾نصب على التميز، وقيل على الحال: أي حسن واحد منهم رفيقاً،

المسألة الخامسة: اعلم أنه تعالى بين فيمن أطاع الله ورسوله أنه يكون مع النبين والصديقين والشهداء والصالحين، ثم لم يكترث بذلك،بل ذكر أنه يكون رفيقاً له، وقد ذكرنا أن الرفيق هو الذي يرتفق به في الحضر والسفر، فبين إن هؤلاء المطيعين يرتفقون بهم، وإنما يرتفقون بهنم إذا نالو منهم رفقا وخيراً، ولقد ذكرنا مراراً كيفية هذا الارتفاق، وأما على حسب الظاهر فلأن الإنسان قد يكون مع غيره ولا يكون رفيقاً له، فاما إذا كان عظيم الشفقة عظيم الاعتناء بشأنه كان رفيقاً له،فبين تعالىٰ أن الأنبياء والصديقين والشهداء والصالحين يكونون له كا الرفقاء من شدة محبتهم له وسرورهم برؤيته،

تفسیر ابن کثیر (ص۲۸۳ج۱)

﴿ومن يطع الله والرسول فاولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبين والصديقين والشهداء والصلحين وحسن اولئك رفيقا﴾أي من عمل بما أمره الله به ورسوله وترك ما نهاه الله عنه ورسوله فإن الله عزوجل يسكنه دار كرامته ويجعله مرافقاً للأنبياء ثم لمن بعدهم في المرتبة وهم الصديقون، ثم الشهداء والصالحون الذين صلحت سرائرهم وعلانيتهم ثم أثنى عليهم تعالىٰ فقال:﴿وحسن اولئك رفيقا﴾وقال البخاري: ردثنا محمد بن عبدا لله بن حوشب،حدثنا إبراهيم بن سعد عن أبيه، عن عروة، عن عائشة، قالت : سمعت رسول الله ﷺ يقول: "مامن نبي يمرض إلاخير بين الدنيا والآخرة" وكان في شكواه التي قبض فيها أخذته بحة شديدة فسمعته يقول: "مع اللذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين " فعلمت أنه خير، وكذا رواه مسلم من حديث شعبة عن سعد بن ابراهيم به. وهذامعنى قوله ﷺ في الحديث الآخرة "اللّٰهم الرفيق الاعلى" ثلاثاً ثم قضى عليه أفضل الصلاة والتسليم

(ذكر سبب نزول هذه الآية الكريمة)

قال ابن جرير . حدثنا ابن حميد حدثنا يعقوب القمي عن جعفر بن أبي المغيرة، عن سعيد بن جبير، قال: جاء رجل من الانصار الىٰ رسول لله ﷺ وهو محزون، فقال له النبي ﷺ: "يافلان مالي أراك محزوناً؟" فقال يا نبي الله شيء فكرت فيه، فقال: ماهو؟ قال: نحن نغد و عليك ونروح ننظر الىٰ وجهك ونجالسك وغداً ترفع مع النبيين فلا نصل إليك، فلم يرد النبي ﷺ شيئاً فأتاه جبريل بهذه الآية ﴿ومن يطع الله ورسول فأولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين﴾ الآية، فبعث النبي ﷺ فبشره وقد روي هذا الأثر مرسلاً عن مسروق، وعن عكرمة، وعامر الشعبي وقتادة، وعن الربيع بن أنس وهو من أحسنها سنداً، قال ابن جرير: حدثنا المثنى، حدثنا ابن أبي جعفر عن أبيه عن الربيع قوله: ﴿ومن يطع الله والرسول﴾ الآية، وقال: ان أصحاب النبي ﷺ قالوا: قد علمنا أن النبي ﷺ له فضل على من آمن به في درجات الجنة ممن اتبعه وصدقه، وكيف لهم إذا جتمعوا في الجنة أن يرى بعضهم بعضاً. فأنزل الله في ذالك، يعني هذه الآية، فقال: يعني رسول الله "إن الأعلين ينحدرون إلى من هو أسفل منهم، فيجتمعون في رياض فيذكرون ما أنعم الله عليهم ويثنون عليه، وينزل لهم أهل مرفوعاً من وجه آخر، فقال أبوبكر بن مردوية: حدثنا عبد الرحيم بن محمد بن مسلم، حدثنا إبرهيم، عن الأسود، عن عن عائشة، قالت: جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: يارسول الله، انك لأحب اليّ من نفسي، وأحب إليّ من أهلي، وأحب إليّ من ولدي، وانّي لأكون في البيت فأذكرك فما أصبر حتي آتيك فانظر إليك، وإذا ذكرت موتي وموتك، عرفت أنك إذا دخلت الجنة رفعت مع النبيين، وإن دخلت الجنة خصيت أن لا أراك، فلم يرد عليه النبي ﷺ حتي نزلت عليه ﴿ومن يطع الله ورسول فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصدقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقاً﴾ وهكذا رواه الحافظ أبو عبد الله المقدسي في كتابه في صفة الجنة من طريق الطبراني عن أحمد بن عمرو بن مسلم الخلال، عن عبد الله بن عمران

العابدي به، ثم قال : لا أرى باسناده بأساً، والله أعلم. وقال ابن مردويه أيضاً : حدثنا سليمان بن أحمد، حدثنا العباس بن الفضل الأسفاطي،حدثنا أبوبكربن ثابت ابن عباس المصرى، حدثنا خالد بن عبد الله عن عطاء بن السائب، عن عامر الشعبي، عن ابن عباس : أن رجلاً أتى النبيﷺ فقال: يارسول الله إني لأحبک حتى إني لأذكرک في المنزل فيشق ذلک علي، وأحب أن أكون معک في الدرجة، فلم يردعليه النبيﷺ شيئاً، فأنزل الله عزوجل هذه الآية وقد رواه ابن جرير عن ابن حميد عن جرير عن عطاء، عن الشعبي مرسلاً، وثبت في صحيح مسلم من حديث هقل بن زياد عن الأوزاعي، عن يحيىٰ بن أبي كثير، عن أبي سلمة بن عبد الرحمن، عن ربيعة بن كعب الأسلمي أنه قال : كنت أبيت عند النبي ﷺفاتيته بوضوئه وحاجته، فقال لي"سل"فقلت: يا رسول الله اسالک موافقتک في الجنة، فقال : "أو غير ذلک . قال: فأعني على نفسک بكثرة السجود".

وقال الامام أحمد، حدثنا يحيى بن إسحاق، أخبرنا بن لهيعة عن عبيد الله بن أبي جعفر، عن عيسىٰ بن طلحة، عن عمرو بن مرة الجهني، قال: جاء رجل الى النبيﷺ فقال : يا رسول الله، شهدت أن لا اله الا الله، وأنک رسول الله، وصليت الخمس، وأديت زكاة مالي، وصمت شهر رمضان، فقال رسول الله ﷺ : "من مات على ذلک كان مع النبيين والصديقين والشهداء يوم القيامة وهكذا، ونصب اصبعيه. مالم يعق والديه"تفردبه احمد. قال الامام أحمد أيضاً حدثنا أبو سعيد مولى أبي هاشم، حدثنا ابن لهيعة عن زبان بن فائد، عن سهل بن معاذ بن أنس، عن أبيه، أن رسول الله ﷺ قال: "من قرأألف آية في سبيل الله كتب يوم القيامة مع النبيين والصديقين والشهداء والصالحين، وحسن أولئک رفيقاً إن شاء الله "وروى الترمذى من ريق سفيان الثورى، عن أبي حمزة، عن الحسن البصري عن أبي سعيد، قال: قال رسول الله ﷺ: "التا جرالصدوق الامين مع النبيين والصديقين والشهداء "ثم قال: هذا

حديث حسن لا نعرفه الا من هذا الوجه، وأبو حمزة اسمه عبد الله بن جابرشيخ بصري، واعلم من هذا كله بشارة ماثبت في الصحيح والمسانيد وغيرهما من طرق متواترة عن جماعة من الصحابة، أن رسول الله ﷺ سئل عن الرجل يحب القوم ولمايلحق بهم، فقال: "المرء مع من أحب"، قال أنس: فما فرح المسلمون فرحهم بهذا الحديث. وفي رواية عن أنس أنه قال: اني لأحب رسول الله ﷺ وأحب أبابكر وعمر رضي الله عنهما، وأرجو أن الله يبعثني معهم وان لم أعمل كعملهم، قال الامام مالك بن أنس، عن صفوان بن سليم، عن عطاء بن يسار عن أبي سعيد الخدري، قال: قال رسول الله " ان أهل الجنة ليتراءون أهل الغرف من فوقهم، كما تراءون الكوكب الدري الغابر في الأفق من المشرق أو المغرب. لتفاضل ما بينهم" قالوا: يارسول الله، تلك منازل الأنبياء لا يبلغها غيرهم، قال "بلى، والذي نفسي بيده رجال آمنوا بالله وصدقوا المرسلين" أخرجاه في الصحيحين من حديث مالك واللفظ لمسلم، ورواه الامام أحمد، حدثنا فزارة أخبرني فليح عن هلال يعني بن علي، عن عطاء، عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: ان أهل الجنة ليتراءون في الجنة كما تراءون. أو ترون. الكوكب الدري الغبر في الأفق الطالع في تفاضل الدرجات". قالوا: يارسول الله، أولئك النبيون، قال: "بلى، والذي نفسي بيده، رجال آمنوا بالله وصدقوا المرسلين" قال الحافظ الضياء المقدسي هذا الحديث على شرط البخاري، والله أعلم.

وقال الحافظ أبو القاسم الطبراني في معجمه الكبير، حدثنا علي بن عبد العزيز، حدثنا محمد بن عمار الموصلي، حدثنا عفيف بن سالم عن أيوب بن عتبة، عن عطاء عن ابن عمر، قال: أتى رجل من الحبشة إلى رسول الله ﷺ يسأله فقال له رسول الله: "سل واستفهم" فقال، يا رسول الله فضلتم علينا بالصور والألوان والنبوة، ثم قال: أفرأيت إن آمنت بما آمنت به وعملت به، إني لكائن معك في الجنة، قال رسول الله ﷺ: "نعم، والذي نفسي بيده، انه ليضيء بياض الأسود في الجنة من مسيرة

ألف عام " ثم قال رسول الله ﷺ: "من قال : لا اله الا الله، كان له بها عهد عند الله، ومن قال: سبحان الله وبحمده، كتب له بها مائة ألف حسنة وأربعة وعشرون ألف حسنة "فقال رجل: كيف نهلك بعد هذا ي رسول الله، فقال رسول الله ﷺ" ان الرجل ليأتي يو م القيامة بالعمل لو وضع على جبل الآيات لأثقله فتقوم النعمة من نعم الله، فتكاد أن تستنفد ذلك كله الا أن يتغمده الله برحمته" ونزلت هذه الآيات ﴿هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيأ مذكوراً﴾ الىٰ قوله. ﴿نعيما وملكاً كبيراً﴾فقال الحبشيء وان عيني لتريان ما ترى عيناك في الجنة ؟ فقال رسول الله ﷺ :"نعم" فاستبكى حتى فاضت نفسه، قال ابن عمر : فلقد رايت رسول الله ﷺ يدليه في حفرته بيديه، فيه غرابة ونكارة وسنده ضعيف، ولهذا قال تعالىٰ : ﴿ذلك الفضل من الله﴾ أي من عند الله برحمته وهو الذي أهلهم لذالک لا بأعمالهم ﴿وكفى بالله عليما﴾ أي هو عليم بمن يستحق الهداية والتوفيق.

آیت:(۷)

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (مائدہ:۳)

ترجمہ:۔ آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔ پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں لیکن گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

خلاصہ:۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ نے تکمیل دین اور اتمام نعمت کا اعلان فرمایا ہے۔ یعنی قوت یا احکام وقواعد کے لحاظ سے اب دین میں کسی ترمیم' اضافہ' تصرف کی گنجائش نہ رہی اور دین کی تکمیل خود ایک نعمت ہے، جس کو عام اور تام کر دیا گیا۔ اگر ختم نبوت پر صاف وصریح دلائل نہ ہوتے تو اثبات ختم نبوت کے لئے یہی ایک آیت کافی تھی۔ چنانچہ مرزا قادیانی جیسے ملحد نے بھی اس آیت سے ختم نبوت پر ہی استدلال کیا ہے۔ اور مفسرین نے اس آیت سے کیا سمجھا؟ مفسر شہیر ابن کثیر فرماتے ہیں فلا یحتاجون إلى دين غيره ولا إلى نبي غير نبيهم۔ اس اعلان کے بعد اب نہ کسی اور دین کی ضرورت ہے نہ مسلمان کسی اور نبی کے محتاج ہیں۔

لیکن قادیانیوں کو بلی کی طرح ہمیشہ خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے گرو مرزا قادیانی کا بھی لحاظ نہ کیا اور اس آیت سے اجرائے نبوت ثابت کرنے کی فکر میں ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے قادیانی فلسفہ اور سفسطہ۔

ہیں تہی مغز، مگر غرہ علم و تحقیق
فکر کوتاہ، مگر دعویٰ علم و عرفاں
فہم و دانائی کے سرخیل بنے ہیں ناداں
ہائے یہ گردش دوراں مجھے لائی ہے کہاں

قادیانی استدلال:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگ منصب نبوت پر فائز ہوا کریں گے کیوں کہ جب خدا تعالیٰ نے ہمیں نعمت تامہ دیدی ہے تو سب سے اعلیٰ نعمت تو نبوت کی نعمت ہے وہ ضرور ہمیں ملنی چاہیے۔

جواب:۔

اپنے گھر کی خبر لو! تمھارا پیر و مرشد اس آیت کو ختم نبوت کے لئے پیش کررہا ہے اور تم اس سے نفی ختم نبوت کو ثابت کرنا چاہ رہے ہو۔ معلوم نہیں الٹی سمجھ کس کی ہے؟ مرزا کی یا مرزائیوں کی؟ مرزا نے لکھا ہے۔

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" اور آیت وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ" میں صریح نبوت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر چکا ہے (تحفہ گولڑویہ خ ص ۱۷۳ ج ۱۷)

مغالطہ:

قرآن شریف کو مکمل شریعت قرار دیا ہے..... اب قرآن مجید مکمل شریعت ہے یہ خدا کے ساتھ ہمارا تعلق بھی کامل پیدا کرتی ہے اور سب سے کامل تعلق جو ایک انسان کا خدا کے ساتھ ہوسکتا ہے وہ نبوت ہے۔ اگر کہو کہ قرآن مجید کسی انسان کو نبوت کے مقام تک نہیں پہنچا سکتا تو دوسرے لفظوں میں یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید کامل نہیں بلکہ ناقص شریعت ہے اور یہ باطل ہے۔ لہذا تمہارا خیال بھی باطل۔ (تبلیغی پاکٹ بک ۲۶۹)

جواب:۔۱

مرزائی پوپ کو اگر بدفہمی نہیں تو اپنی اصلاح کرے اس کے گرو نے اس آیت سے ختم نبوت ثابت کی ہے۔ جیسا کہ اوپر گزرا۔

۲۔ مرزائیوں نے نہ معلوم کس جاہل سے عقیدہ کے باب میں الٹی سیدھی منطق سے استدلال کرنا سیکھا ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ عقائد میں قطعی الثبوت قطعی

الدلالۃ دلیل کی ضرورت ہے جیسا کہ ختم نبوت کے ثبوت میں ہم پیش کرچکے ہیں۔ لہذا اس مرزائی سفسطہ کی کوئی حیثیت نہیں۔

۳۔ مرزائی کیا اپنے اس الٹی منطق کی تائید میں کسی مفسر، مجدد کا قول پیش کرسکتے ہیں، اگر نہیں پیش کرسکتے تو یہ باطل استدلال ان کے مسلمات سے بھی باطل ٹھہرا۔

۴۔ بقول تمہارے اگر قرآن مجید نبوت تک پہنچاتا ہے، تو وہ نبوت ناقص ظلی بروزی، برازی ہوتی ہے یا کامل؟ تمہاری نبوت تو بروزی اور برازی والی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس دلیل سے تم نے یہ تخصیص پیدا کی ہے؟ جب قرآن تعلق کامل پیدا کرتا ہے تو نبوت بھی تو کامل ہی دلائے گا! جس دلیل سے تم اپنی بروزی نبوت کی تخصیص کروگے اسی دلیل سے یہ ثابت ہوگا کہ قرآن مجید خدا تک یقیناً کامل درجہ تک پہنچاتا ہے۔ مگر نبوت کا منصب نہیں دلاتا یہ منصب تو خدا تعالیٰ جسے دینا ہوتا ہے از خود دیتا ہے۔ مرزا نے لکھا ہے

"نبوت ایک جوہر خداداد ہے اگر کسب سے ہوتا تو سب لوگ نبی بن جاتے"

(ملفوظات ج اص ۳۵۹)

لہٰذا نبوت کو کسبی بتانا یا کسبی بتانا مرزائی مذہب کی غلط ترجمانی ہے۔

کار شیطاں میکند، نامش وکیل
گر وکیل این است لعنت بر وکیل

مغالطہ۲۔

اس آیت میں اتمام نعمت کا ذکر ہے اور نعمت صرف نبوت نہیں بلکہ بادشاہت بھی ہے، صدیقیت اور شہادت بھی ہے اور یہ سب تو بند نہیں ہوئیں؟۔ (تبلیغی پاکٹ ۲۹۹)

جواب:۔

اتمام نعمت کو "نبوت" میں خاص کرکے اپنے سید ھے مفروضے قائم کرنا قادیانی مذہب کی وکالت نہیں، جہالت ہے۔ اتمام دین میں دینی اور دنیوی

تمام طرح کی نعمتیں داخل ہیں۔ جس میں ایک بڑی نعمت نبوت بھی ہے۔ اور ان نعمتوں کا اتمام کیا گیا ہے، انھیں ختم نہیں کیا گیا، جیسا کہ مرزائی وکیل نے سمجھا۔ چنانچہ آج تک ہمیں یہ ساری نعمتیں حاصل ہیں۔ حضور ﷺ کی نبوت آج بھی ہے اور قیامت تک رہیگی۔ ختم نبوت کے معنیٰ یہ نہیں کہ نبوت حضورؐ کی اب باقی نہ رہی، بلکہ یہ ہیں کہ حضورؐ کے بعد اب کسی کو منصب نبوت ملنا ختم ہوگیا۔ لہذا مرزائی تمام مفروضے غلط ہیں، اور یہ بات سچ ہے کہ

زمیں پر جب نکاح آسمانی ہو نہیں سکتا
تو پھر ہرگز پیمبر قادیانی ہو نہیں سکتا

میرے خالق نے بخشا ہے مجھے اسلام سا مذہب
کوئی اس دین کا دنیا میں ثانی ہو نہیں سکتا

کیا فرماتے ہیں مفسرین

معارف القرآن ۔(ص ۲۷ ج ۳)

بیان القرآن:

آج کے دن تمھارے لئے تمھارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کردیا (قوت میں بھی جس سے کفار کو مایوسی ہوئی اور احکام قواعد میں بھی) اور (اس اکمال سے) میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا (دینی انعام بھی کہ احکام کی تکمیل ہوئی اور دنیوی انعام بھی کہ قوت حاصل ہوئی اور اکمال دین میں دونوں آگئے) اور میں نے اسلام کو تمھارا دین بننے کے لئے (ہمیشہ کو) پسند کرلیا (یعنی قیامت تک تمھارا یہی دین رہے گا اس کو منسوخ کرکے دوسرا دین تجویز نہ کیا جاوے گا۔ پس تم کو چاہئے کہ میری نعمت کا شکر کرکے اس دین پر پورے پورے قائم رہو) پھر (اشیاء مذکورہ بالا کی حرمت دریافت کرلینے کے بعد یہ بھی معلوم کرلو کہ) بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو (یعنی نہ قدر ضرورت سے زیادہ کھاوے اور نہ لذت مقصود ہو جس کو سورہ بقرۃ میں غیر باغ ولا عاد سے تعبیر فرمایا ہے) تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں (اگر قدر ضرورت کا پورا اندازہ نہ ہو اور ایک آدھ لقمہ زیادہ بھی کھا گیا، اور) رحمت والے ہیں (کہ ایسی حالت میں اجازت دیدی)۔

معارف و مسائل:

یہ سورہ مائدہ کی تیسری آیت ہے جس میں بہت سے اصول اور فروعی احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا مسئلہ حلال و حرام جانوروں کا ہے۔ جن جانوروں کا گوشت انسان کے لئے مضر ہے، خواہ جسمانی طور پر کہ اس سے انسان کے بدن میں بیماری کا خطرہ ہے، یا روحانی طور پر کہ اس سے انسان کے اخلاق اور قلبی کیفیات خراب ہونے کا خطرہ ہے، ان کو قرآن نے خبائث قرار دیا اور حرام کردیا، اور جن جانوروں میں کوئی انسانی مضرت نہیں ہے، ان کو طیب اور حلال قرار دیا۔ ...

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً۔

اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے' عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں سید الایام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا۔ جس کے فضائل معروف ہیں' مقام میدان عرفات کا جبل رحمت کے قریب ہے' جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول رحمت کا خاص مقام ہے۔ وقت عصر کے بعد کا ہے۔ جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے۔ اور خصوصاً یوم جمعہ میں کہ قبولیت دعا کی گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے۔ اور عرفہ کے روز اور بھی زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔

حج کیلئے مسلمانوں کا سب سے بڑا پہلا عظیم اجتماع ہے۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ شریک ہیں۔ رحمۃ للعلمین صحابہ کرامؓ کے ساتھ جبل رحمت کے نیچے اپنی ناقہ "عضباء" پر سوار ہیں اور حج کے بڑے رکن یعنی وقوف عرفات میں مشغول ہیں۔

ان فضائل و برکات اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیت کریمہ رسول کریم ﷺ پر نازل ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ جب آپ پر یہ آیت بذریعہ وحی نازل ہوئی تو حسب دستور وحی کا ثقل اور بوجھا تنا محسوس ہوا کہ اونٹنی اس سے دبی جا رہی تھی یہاں تک کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن کی آخری آیت ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت احکام سے متعلق نازل نہیں ہوئی۔ صرف ترغیب و ترہیب کی چند آیتیں ہیں۔ جن کا نزول اس آیت کے بعد بتلایا گیا ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول کریم ﷺ اس دنیا میں صرف اکیاسی روز بقید حیات رہے' کیوں کہ دس ہجری کی نویں ذی الحجہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اور ۱۱ ہجری کی بارہویں ربیع الاول کو آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی۔

یہ آیت جو اس خاص شان اور اہتمام سے نازل ہوئی اس کا مفہوم بھی ملت اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری اور بھاری انعام اور اسلام کا طرۂ

امتیاز ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دین حق اور نعمت الٰہی کا انتہائی معیار جو اس عالم میں بنی نوع انسان کو عطا ہونے والا تھا' آج وہ مکمل کر دیا گیا۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے جو دین حق اور نعمت الٰہیہ کا نزول اور ترویج شروع کی گئی تھی اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مناسب حال اس نعمت کا ایک حصہ اولاد آدم کو عطا ہوتا رہا آج وہ دین اور نعمت مکمل صورت میں خاتم الانبیاء رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کو عطا کر دی گئی۔

اس میں تمام انبیاء و رسل کے زمرہ میں سید الانبیاء ﷺ کی سعادت اور امتیازی شان کا تو اظہار ہے ہی اس کے ساتھ تمام امیوں کے مقابلہ میں امت مرحومہ کی بھی ایک خاص امتیازی شان کا واضح ثبوت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ چند علماء یہود حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تمھارے قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر یہود پر نازل ہوتی تو وہ اس کے نزول کا ایک جشن عید مناتے۔ فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ وہ کون سی آیت ہے۔ انھوں نے یہی آیت۔ الیوم اکملت لکم دینکم پڑھ دی۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ اور کس دن نازل ہوئی۔ اشارہ اسی بات کی طرف تھا کہ وہ دن ہمارے لئے دوہری عید کا دن تھا ایک عرفہ دوسرے جمعہ۔

عید اور تہوار منانے کا اسلامی اصول:

فاروق اعظمؓ کے اس جواب میں ایک اسلامی اصول کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو تمام دنیا کی اقوام و مذاہب میں صرف اسلام ہی کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں ہر قوم اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اپنے اپنے حالات و خصوصیات کے ماتحت اپنے خاص خاص تاریخی واقعات کے دنوں کی یادگاریں مناتے ہیں' اور ان ایام کو ان کے یہاں ایک عید یا تہوار کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

کہیں قوم کے بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کا یا تخت نشینی کا دن منایا جاتا ہے اور کہیں کسی خاص ملک یا شہر کی فتح یا اور کسی عظیم تاریخی واقعہ کا جس کا حاصل اشخاص

خاص کی عزت افزائی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام اشخاص پرستی کا قائل نہیں ہے۔ اس نے ان تمام رسوم جاہلیت اور شخصی یادگاروں کو چھوڑ کر اصول اور مقاصد کی یادگاریں قائم کرنے کا اصول بنادیا۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو "خلیل اللہ" کا خطاب دیا گیا اور قرآن کریم میں ان کے امتحانات اور ان سب میں مکمل کامیابی کو سراہا گیا۔ وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ۔ کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن نہ ان کی پیدائش یا موت کا دن منایا گیا نہ ان کے صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی پیدائش وموت یا دوسرے حالات کی کوئی یادگار قائم کی گئی۔

ہاں ان کے اعمال میں جو چیزیں مقاصد دین سے متعلق تھیں' ان کی یادگاروں کو نہ صرف محفوظ رکھا گیا' بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے دین و مذہب کا جز اور فرض واجب قرار دیدیا گیا۔ قربانی' ختنہ' صفاو مروہ کے درمیان دوڑنا' منا میں تین جگہ کنکریں مارنا' یہ سب انھیں بزرگوں کے ایسے افعال کی یادگار ہیں جو انھوں نے اپنے نفسانی جذبات اور انسان کے طبعی تقاضوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے مقابلے میں کچلتے ہوئے ادا کئے۔ اور جن میں ہر قرن اور ہر زمانے کے لوگوں کو اس کا سبق ملتا ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے اپنی محبوب سے محبوب چیز کو قربان کردینا چاہئے۔

اسی طرح اسلام میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کی موت وحیات یا شخصی حالات کا کوئی دن منانے کے بجائے ان کے اعمال کے دن منائے گئے۔ جو کسی خاص عبادت سے متعلق ہیں جیسے شب براءت' رمضان المبارک' شب قدر' یوم عرفہ' یوم عاشورہ وغیرہ' عیدین صرف دو رکھی گئیں' وہ بھی خالص دینی لحاظ سے۔ پہلی عید رمضان المبارک کے اختتام اور اشہر حج کے شروع ہونے پر رکھی گئی اور دوسری عید عبادت حج سے فراغت کے بعد رکھی گئی۔

خلاصہ:۔

یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے اس جواب نے یہ بتلادیا کہ یہود ونصاریٰ کی طرح ہماری عیدیں تاریخی وقائع کے تابع نہیں۔ کہ جس تاریخ میں کوئی اہم واقعہ پیش

آ گیا اس کو عید منا دیں۔ جیسا کہ جاہلیت اولیٰ کی رسم تھی۔ اور آج کل کی جاہلیت جدیدہ نے تو اس کو بہت ہی پھیلا دیا ہے۔ یہاں تک کہ دوسری قوموں کی نقل کر کے مسلمان بھی اس میں مبتلا ہونے لگے۔

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش کی عید منائی۔ ان کو دیکھ کر کچھ مسلمانوں نے رسول کریم ﷺ کی پیدائش پر عید میلاد النبی کے نام سے ایک عید بنا دی۔ اسی روز بازاروں میں جلوس نکالنے اور اس میں طرح طرح کی خرافات کو اور رات میں چراغاں کرنے کو عبادت سمجھ کر کرنے لگے۔ جس کی کوئی اصل صحابہؓ وتابعینؒ اور اسلاف امت کے عمل میں نہیں ملتی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دن منانے کا طریقہ اُن قوموں میں تو چل سکتا ہے کہ جو باکمال افراد اور حیرت انگیز کارناموں کے لحاظ سے مفلس ہیں۔ دو چار شخصیتیں قوم میں کل اس قابل ہوئی ہیں اور ان کے بھی کچھ مخصوص کام ایسے ہوتے ہیں جن کی یادگار منانے کو قومی فخر سمجھتے ہیں۔

اسلام میں یہ دن منانے کی رسم چلے تو ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد تو انبیاء علیہم السلام ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی نہ صرف یوم پیدائش بلکہ ان کے حیرت انگیز کارناموں کی طویل فہرست ہے جن کے دن منانے چاہئیں۔ انبیاء کے بعد خاتم الانبیاء ﷺ کی حیات طیبہ کو دیکھا جائے تو آپ کی زندگی کا شاید کوئی دن بھی ایسے کارناموں سے خالی نہیں ان کا دن منانا چاہیے۔ بچپن سے لیکر جوانی تک کے وہ کمالات جنھوں نے پورے عرب میں آپ کو امین کا لقب دیا تھا۔ کیا وہ ایسے نہیں ہیں کہ مسلمان ان کی یادگار منائیں پھر نزول قرآن، ہجرت، غزوہ بدر، احد، خندق، فتح مکہ، حنین اور تبوک، اور تمام غزوات رسول کریم ﷺ سے ہیں۔ ایک بھی ایسا نہیں جس کی یادگار نہ منائی جائے۔ اسی طرح آپؐ کے ہزاروں معجزات یادگار منانے کی چیزیں ہیں۔ اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ کی حیات طیبہ کا ہر دن نہیں ہر گھنٹہ یادگار منانے کا داعیہ رکھتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے بعد تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ وہ ہیں جن میں سے ہر ایک درحقیقت رسول اللہ ﷺ کا زندہ معجزہ ہے۔ کیا یہ بے انصافی نہیں ہوگی کہ ان کی یادگاریں نہ منائی جائیں۔ اور یہ رسم چل پڑے تو پھر صحابہ کرام کے بعد امت کے اکابر اولیاء اللہ اور علماء اور مشائخ پر نظر ڈالو جو کروڑوں کی تعداد میں ہونگے۔ اگر یادگاری دن منائے جائیں تو ان کو چھوڑ دینا کیا ان کے حق میں بے انصافی اور قدر ناشناسی نہیں ہوگی اور اگر یہ طے کر لیا جائے کہ سبھی کے یادگاری دن منائے جائیں تو سال بھر میں ایک دن بھی یادگار منانے سے خالی نہیں رہے۔ بلکہ ہر دن کے ہر گھنٹہ میں کئی کئی یادگاریں اور کئی کئی عیدیں منانی پڑیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے اس رسم کو جاہلیت کی رسم قرار دے کر نظرانداز کیا ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت کے معنی و مطالب کی تفصیل سنئے۔ اس میں حق تعالیٰ شانہ نے رسول کریم ﷺ اور آپ کی امت مرحومہ کو تین خصوصی انعام عطا فرمانے کی بشارت دی ہے۔ ایک اکمال دین، دوسرے اتمام نعمت، تیسرے شریعت اسلام کا اس امت کے لئے انتخاب۔

اکمال دین کے معنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ آج دین حق کے تمام حدود و فرائض اور احکام و آداب مکمل کر دیئے گئے ہیں۔ اب اس میں نہ کسی اضافہ اور زیادتی کی ضرورت باقی ہے اور نہ کمی کا احتمال (روح) یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد احکام اسلام میں سے کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا جو چند آیتیں اس کے بعد نازل ہوئیں ان میں یا تو ترغیب و ترہیب کے مضامین ہیں اور یا انہیں احکام کی تاکید جن کا بیان پہلے ہو چکا تھا۔

اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ اصول واجتہاد کے ماتحت ائمہ مجتہدین نئے نئے پیش آنے والے واقعات و حالات کے متعلق اپنے اجتہاد سے احکام شرعیہ بیان کریں کیوں کہ قرآن کریم نے جس طرح احکام شرعیہ کے حدود و فرائض وغیرہ بیان فرمائے ہیں اسی طرح اصول اجتہاد بھی قرآن ہی نے متعین فرمادیئے ہیں۔ ان کے

ذریعہ جو احکام قیامت تک نکالے جائیں وہ سب ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کئے ہوئے احکام ہیں۔ کیونکہ ان اصول کے ماتحت ہیں جو قرآن نے بیان کئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اکمال دین کا مطلب۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ دین کے تمام احکام کو مکمل کردیا گیا۔ اب نہ اس میں کسی زیادتی کی ضرورت باقی ہے نہ منسوخ ہوکر کمی کا احتمال۔ کیونکہ اس کے بعد ہی متصل سلسلہء وحی وفات رسول کریم ﷺ کے ساتھ منقطع ہونے والا تھا اور بغیر وحی الٰہی کے قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا اور جو بظاہر زیادتی احکام کی اصول اجتہاد کے تحت فقہاء ومجتہدین کی طرف سے ہوئی۔ وہ در حقیقت زیادتی نہیں بلکہ احکام قرآنی کی توضیح وبیان ہے۔

اور اتمام نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج اور انکے مخالفین کا مغلوب ومفتوح ہونا ہے' جس کا ظہور مکہ مکرمہ کی فتح اور رسوم جاہلیت کے مٹانے سے اور اس سال حج میں کسی مشرک کے شریک نہ ہونیکے ذریعہ ہوا۔

یہاں الفاظ قرآن میں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ دین کے ساتھ لفظ اکمال استعمال فرمایا گیا اور نعمت کے ساتھ لفظ اتمام' حالانکہ یہ دونوں لفظ بظاہر ایک دوسرے کے ہم معنیٰ اور مرادف سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن درحقیقت ان دونوں کے مفہوم میں ایک فرق ہے جس کو مفردات القرآن میں امام راغب اصفہانیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ کسی چیز کا "اکمال اور تکمیل" اس کو کہتے ہیں کہ اس چیز سے جو غرض اور مقصود تھا وہ پورا ہوگیا۔ اور لفظ اتمام کے معنیٰ یہ ہیں کہ اب دوسری چیز کی ضرورت اور حاجت نہیں رہی۔ اس لئے "اکمال دین" کا حاصل یہ ہوا کہ قانون الٰہی اور احکام دین کے اس دنیا میں بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ آج پورا کردیا گیا۔ اور اتمام نعمت کا مطلب یہ ہوا کہ اب مسلمان کسی کے محتاج نہیں۔ ان کو خود حق تعالیٰ جل شانہ نے غلبہ' قوت' اور اقتدار عطاء فرمادیا جس کے ذریعہ وہ اس دین حق کے احکام کو جاری اور نافذ کرسکیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں دین کی نسبت تو مسلمانوں کی طرف فرمائی گئی ہے اور نعمت کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف' وجہ یہ ہے کہ دین کا ظہور ان اعمال وافعال کے ذریعہ ہوتا ہے جو امت کے افراد کرتے ہیں اور نعمت تکمیل براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (ابن قیم تفسیر القیم)۔

اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اکمال دین آج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا دین ناقص تھا۔ بلکہ جیسا تفسیر بحر محیط میں ہے۔ بحوالہ قفال مروزی رحمۃ اللہ علیہ نقل کیا ہے کہ دین تو ہر نبی ورسول کا اس کے زمانہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھا یعنی جس زمانہ میں جس پیغمبر پر کوئی شریعت ودین اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا اُس زمانہ اور اُس قوم کے لحاظ سے وہی کامل و مکمل تھا۔ لیکن اللہ جل شانہ کے علم میں یہ تفصیل پہلے سے تھی کہ جو دین اس زمانہ اور اس قوم کے لئے مکمل ہے وہ اگلے زمانہ اور آنے والی قوموں کے لئے مکمل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین وشریعت نافذ کیا جائے گی۔ بخلاف شریعت اسلام کے جو سب سے آخیر میں نازل کی گئی کہ وہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے۔ نہ وہ کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی خاص خطۂ ملک' یا قوم کے ساتھ۔ بلکہ قیامت تک ہر زمانہ اور ہر خطہ اور ہر قوم کے لئے یہ شریعت کامل و مکمل ہے۔

تیسرا انعام جو اس امت مرحومہ کے لئے اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کے لئے اللہ جل شانہ نے اپنے تکوینی انتخاب کے ذریعہ دین اسلام کو منتخب فرمایا جو ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے۔ اور جس پر نجات کا انحصار ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت نے یہ بتلا دیا کہ امت مرحومہ کے لئے دین اسلام ایک بڑی نعمت ہے جو ان کو بخشی گئی ہے اور یہی دین ہے جو ہر حیثیت اور ہر جہت سے کامل و مکمل ہے' نہ اس کے بعد کوئی نیا دین آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جائے گی یہی وجہ تھی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سن کر خوش ہو رہے تھے۔ مگر۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے

رونے کی وجہ پوچھی تو عرض کیا اس آیت سے اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے۔ کیونکہ تکمیل کے ساتھ ارسال رسول کی ضرورت بھی پوری ہو چکی۔ رسول کریم ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر، بحر محیط وغیرہ) چنانچہ آنے والے وقت نے بتلا دیا کہ اس کے صرف اکیاسی روز بعد آنحضرت ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

آخر آیت میں فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ کا تعلق اُن جانوروں سے ہے، جن کی حرمت کا بیان شروع آیت میں آیا ہے۔ اور اس جملہ کا مطلب ایک خاص حالت کو عام قاعدہ سے مستثنیٰ کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جائے اور خطرہ موت کا لاحق ہو جائے۔ ایسی حالت میں اگر وہ مذکورہ بالا حرام جانوروں میں سے کچھ کھا لے تو اس کے لئے گناہ نہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ پیٹ بھرنا اور لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ صرف اتنا کھا لے جس سے اضطرار کی کیفیت رفع ہو جائے۔

آیت میں غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ کا یہی مطلب ہے کہ اس کھانے میں اس کا میلان گناہ کی طرف نہ ہو بلکہ اضطرار کا رفع کرنا ہو۔ آخر میں فان اللہ غفور رحیم سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ محرمات اس وقت بھی اپنی جگہ حرام و ناجائز ہی ہیں، صرف اس شخص کو اضطرار کی وجہ سے معاف کیا گیا ہے۔

تفسیر ماجدی۔

ترجمہ:۔ آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین کے پسند کر لیا۔ ۱۸؎

تفسیر:

۱۸؎ (قیامت تک کیلئے) اکملت لکم دینکم۔ یہ اکمال دین بلحاظ قوت بھی ہے اور بلحاظ احکام و قواعد بھی۔ اتممت علیکم نعمتی۔ یہ اتمام نعمت اسی دین کی تکمیل سے ہوا۔ اس اکمال دین و اتمام نعمت کے بعد ظاہر ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم، اضافہ

ہوا تصرف کی گنجائش نہ رہی۔ نہ کسی نبی کی بعثت کی حاجت۔ ختم نبوت پر اگر دلائل صریح نہ
بت موجود ہوتے، تو یہاں سے بھی مسئلہ کا استنباط ہو سکتا تھا۔ شیعی عقیدہ امامت کا
ار جو در حقیقت اجراء نبوت ہی کی ایک شکل ہے، رد بھی یہیں سے نکل آتا ہے۔ البتہ
یہ ہر دور میں نئے نئے مسائل کا انکشاف اہل علم واجتہاد اپنی بصیرت سے کتاب وسنت
فر کے اصول وقواعد کے مطابق وماتحت قیامت تک کرتے رہیں گے۔ اشیاء کی حلت
وحرمت کا ذکر اوپر سے چلا آرہا تھا۔ تو یہ مسئلہ بھی اسی کتاب واضح کے اندر آ گیا اور اسمیں
بھی اب کسی تغیر وتصرف کی گنجائش نہ رہی۔ الیوم۔ دین الٰہی چلا تو شروع ہی سے
نما آرہا تھا، لیکن ہر نبی کے عہد میں زمان ومکان کے مصالح ومقتضیات کے لحاظ سے
پینسل احکام شریعت وقت ومقام کے ساتھ محدود ومخصوص رہتے تھے۔ دین اب پہلی بار عالمگیر
اپنے جزئیات وتفصیلات کے ساتھ ہو رہا ہے۔ الیوم میں اشارہ اسی جانب ہے کہ اب
سر خدائی پروگرام میں وحدت نسل انسانی کا زمانہ شروع ہونے کو ہے دنیا اب تک مختلف
زل جغرافی حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر نہایت
دشوار تھا، اور اس میں نامہ وپیام کی بھی کوئی آسان راہ نہ تھی۔ ہر علاقہ کہنا چاہیے اپنے
جغرافی وطبعی سرحدوں کے اندر محفوظ تھا۔ دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جو راہ میں حائل رہتے،
آن ان کا عبور کرنا گویا محال تھا۔ ریل، موٹر لاری، تار، ٹیلیفون وغیرہ خواب وخیال میں بھی نہ
یئے تھے۔ اب کائنات ارضی کی تاریخ میں پہلی بار اس کا وقت آرہا تھا کہ انسانیت کے ٹکڑے
نی ید ایک دوسرے سے ملیں۔ رسل ورسائل کے ذرائع وسیع ہوں۔ اور جس طرح نظام تکوینی
بانو میں ہر فرد کے لئے، اس کے وجود میں آنے سے قبل ہی اس کے لئے ہوا کا، اور روشنی کا
اور پانی کا سامان حکمت الٰہی موجود رکھتی ہے اسی طرح نظام تشریعی میں رحمت حق نے
(مر چاہا کہ نوع انسان کی انفرادی واجتماعی دونوں زندگیوں کی روحانی واخلاقی تربیت کا
صار انتظام پیشتر سے موجود رہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ فقہاء ظاہر اور حکماء باطن نصوص
سلا، سے جو مستنبط کرتے ہیں، وہ بھی سب دین ہی میں داخل ہیں، ورنہ اکمال دین کے بعد
رد وکسی کی اجازت نہ ہوتی۔

ترجمہ کنز الایمان۔

ترجمہ: آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا ۱۵ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ۱۶ اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا ۱۷

تفسیر:۔

۱۵ اور امور تکلیفیہ میں حلال و حرام کے جو احکام ہیں وہ اور قیاس کے قانون سب مکمل کر دیئے اسی لئے اس آیت کے نزول کے بعد بیان حلال و حرام کی کوئی آیت نازل نہ ہوئی اگرچہ واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ نازل ہوئی مگر وہ آیت موعظت و نصیحت ہے بعض مفسرین کا قول ہے کہ دین کامل کرنے کے معنی اسلام کو غالب کرنا ہے جس کا یہ اثر ہے کہ حجۃ الوداع میں جب یہ آیت نازل ہوئی کوئی مشرک مسلمانوں کے ساتھ حج میں شریک نہ ہوسکا ایک قول یہ ہے کہ معنی یہ ہیں کہ میں نے تمہیں دشمن سے امن دی ایک قول یہ ہے کہ دین کا اکمال یہ ہے کہ وہ پچھلی شریعتوں کی طرح منسوخ نہ ہوگا اور قیامت تک باقی رہے گا۔

شان نزول:۔

بخاری اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک یہودی آیا اور اس نے کہا اے امیر المومنین آپ کی کتاب میں ایک آیت ہے اگر وہ ہم یہودیوں پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم روز نزول کو عید مناتے فرمایا کون آیت اس نے یہی آیت الیوم اکملت لکم پڑھی آپ نے فرمایا میں اس دن کو جانتا ہوں جس میں یہ نازل ہوئی تھی اور اس کے مقام نزول کو بھی پہچانتا ہوں وہ مقام عرفات کا تھا اور دن جمعہ کا آپ کی مراد اس سے یہ تھی کہ ہمارے لئے وہ دن عید ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آپ سے بھی ایک یہودی نے ایسا ہی کہا آپ نے فرمایا کہ جس روز یہ نازل ہوئی اس دن دو عیدیں تھیں جمعہ و عرفہ۔

مسئلہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی دینی کامیابی کے دن کو خوشی کا دن منانا جائز اور صحابہ سے ثابت ہے ورنہ حضرت عمر و حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم صاف فرما دیتے کہ جس دن کوئی خوشی کا واقعہ ہو اس کی یادگار قائم کرنا اور اس روز کو عید منانا ہم بدعت جانتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ عید میلاد منانا جائز ہے کیونکہ وہ اعظم نعم الٰہیہ کی یادگار و شکر گزاری ہے۔ ۱۶۔ مکہ مکرمہ فتح فرما کر۔ ۱۷۔ کہ اس کے سوا کوئی اور دین قبول نہیں۔

تفسیر ثنائی۔

ترجمہ: آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کی ہے اور اسلام تمہارا مذہب میں نے پسند کیا ہے۔

شان نزول:۔

الیوم اکملت لکم آنحضرت ﷺ کے آخری حج یعنی حجۃ الوداع میں بطریق۔۔۔ آخری پیغام کے یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:۔

آج میں نے بذریعہ قرآن اور رسول تمہارا دین بنسبت اصول شرائع کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت بذریعہ فتوحات اور اظہار اسلام پوری کی ہے اور اسلام ہاں اصل اسلام ٹھیٹھ اسلام نہ کہ بناوٹی اسلام جسمیں قبر پرستی تعزیہ پرستی وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا ہے تمہارا مذہب میں نے پسند کیا ہے پس تم احکام شرعی کی تعمیل کرو جو حلال ہے اسکو حلال سمجھو جو حرام ہے اسکو حرام جانو۔

تفہیم القرآن۔ (ص ۴۴۳ ج ۱)

ترجمہ: آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے (لہٰذا حرام و حلال کی جو قیود تم پر عائد کر دی گئی ہیں ان کی پابندی کرو ۱۲)

تفسیر:۔

۲۶۔ دین کو مکمل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظام فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب وتمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کے لئے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ نعمت تمام کرنے سے مراد ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔ اور اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے میری اطاعت وبندگی اختیار کرنے کا جو اقرار کیا تھا اس کو چونکہ تم اپنے سعی وعمل سے سچا اور مخلصانہ اقرار ثابت کر چکے ہو اس لئے میں نے اسے درجہ قبولیت عطا فرمایا ہے۔ اور تمہیں عملاً اس حالت کو پہونچا دیا ہے کہ اب فی الواقع میرے سوا کسی کی اطاعت وبندگی کا جوا تمہاری گردنوں پر باقی نہیں رہا۔ اب جس طرح اعتقاد میں تم میرے مسلم ہو اسی طرح عملی زندگی میں بھی میرے سوا کسی اور کے مسلم بن کر رہنے کے لئے کوئی مجبوری تمہیں لاحق نہیں رہی ہے۔ ان احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ سکوت اختیار فرماتا ہے مگر انداز کلام سے یہ بات خود بخود نکل آتی ہے کہ جب یہ احسانات میں نے تم پر کئے ہیں تو ان کا تقاضا یہ ہے کہ اب میرے قانون کی حدود پر قائم رہنے میں تمہاری طرف سے بھی کوئی کوتاہی نہ ہو۔

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ھ میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن جس سلسلہ کلام میں واقع ہوئی ہے وہ صلح حدیبیہ سے متصل زمانہ (۶ھ) کا ہے اور سیاق عبارت میں دونوں فقرے کچھ ایسے پیوستہ نظر آتے ہیں کہ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ ابتداء میں یہ سلسلہ کلام ان فقروں کے بغیر نازل ہوا تھا اور بعد میں جب یہ نازل ہوئے تو انھیں یہاں لا کر نصب کر دیا گیا۔ میرا قیاس یہ ہے۔ واللہ اعلم عند اللہ۔ کہ ابتداءً یہ آیت اسی سیاق کلام میں نازل ہوئی تھی اس لئے اس کی حقیقی اہمیت لوگ نہ سمجھ سکے۔ بعد میں جب تمام عرب مسخر ہو گیا اور اسلام کی طاقت اپنے شباب پر پہونچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ یہ فقرے اپنے نبی پر نازل فرمائے اور ان کے اعلان کا حکم دیا۔

جامع البیان، طبری: (ص۱۰۶تا۱۰۷، ج۴)

القول في تأويل قوله تعالىٰ: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾.

اختلف أهل التأويل في تأويل ذلك، فقال بعضهم: يعني جلّ ثناؤه بقوله: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾: اليوم اكملت لكم أيها المؤمنون فرائضي عليكم وحدودي، وأمري إياكم ونهيي، وحلالي وحرامي، و تنزيلي من ذلك ما أنزلت منه في كتابي، وتبياني ما بينت لكم منه بوحي على لسان رسولي، والأدلّة التي نصبتها لكم على جميع ما بكم الحاجة إليه من أمر دينكم، فأتممت لكم جميع ذلك، فلا زيادة فيه بعد هذا اليوم. قالوا: وكان ذلك في يوم عرفة، عام حج النبي ﷺ حجة الوداع. وقالوا: لم ينزل على النبي ﷺ بعد هذه الآية شيء من الفرائض ولا تحليل شيء ولا تحريمه، وإن النبي ﷺ لم يعش بعد نزول هذه الآية إلا إحدى وثمانين ليلة. ذكر من قال ذلك:

۸۷۰۹—حدثني المثنى، قال: ثنا عبدالله، قال: ثني معاوية، عن علي، عن ابن عباس، قوله: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ وهو الإسلام، قال أخبر الله نبيه ﷺ والمؤمنين أنه قد أكمل لهم الإيمان فلا يحتاجون إلى زيادة أبداً، وقد أتمه الله عزّ ذكره فلا ينقصه أبداً، وقد رضي الله فلا يسخطه أبداً.

۸۷۱۰—حدثنا محمد بن الحسين، قال: ثنا أحمد بن المفضل، قال: ثنا أسباط، عن السدي، قوله: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ هذا نزل يوم عرفة، فلم ينزل بعدها حلال ولا حرام، ورجع رسول الله ﷺ فمات، فقالت أسماء بنت عميس: حججت مع رسول الله ﷺ تلك الحجة، فبينما نحن نسير إذ تجلّى له جبرئيل ﷺ على الراحلة، فلم تطق الراحلة من ثقل ما عليها من القرآن، فبركت، فأتيته فسجّيت عليه برداء كان عليّ.

۸۷۱۱—حدثنا القاسم، قال: ثنا الحسين قال: ثني حجاج عن ابن جريج، قال: مكث النبي ﷺ بعد ما نزلت هذه الآية إحدى وثمانين ليلة، قوله: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾.

٨٤١٢– حدثنا سفيان، قال: ثنا ابن فضيل، عن هارون بن عنترة، عن أبيه، قال: لما نزلت: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ وذلک يوم الحج الأكبر، بكى عمر، فقال له النبي ﷺ: "ما يبكيک"؟ قال ابكاني أنا كنا في زيادة من ديننا، فأما إذ كمل فإنه لم يكمل شيء إلا نقص، فقال: "صدقت".

–حدثنا ابن وكيع، قال: ثنا أحمد بن بشير، عن هارون بن ابي وكيع، عن ابيه، فذكر نحو ذلک.

وقال آخرون: معنى ذلک: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾: حجكم، فافردتم بالبلد الحرام تحجونه أنتم أيها المؤمنون دون المشركين لا يخالطكم في حجكم مشرک. ذكر من قال ذلک:

٨٤١٣ –حد ثنا ابن وكيع، قال: ثنا يحي بن ابي عتبة، عن أبيه، عن الحكم: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ قال: اكمل لهم دينهم، أن حجوا ولم يحجّ معهم مشرک.

٨٤١٤–حد ثنا الحسن بن يحي، قال: أخبرنا عبد الرزاق، قال: أخبرنا معمر، عن قتادة: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ قال: اخلص الله لهم دينهم، ونفى المشركين عن البيت.

٨٤١٥–حد ثنا أحمد بن حازم، قال: ثنا أبو نعيم، قال: ثنا قيس، عن أبي حصين، عن سعيد بن جبير: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ قال: تمام الحج، ونفي المشركين عن البيت.

واولى الأقوال في ذلک بالصواب أن يقال: إن الله عزّوجلّ أخبر نبيه ﷺ والمؤمنين به، انه أكمل لهم يوم أنزل هذه الآية على نبيه دينهم، بإفرادهم بالبلد الحرام، وإجلائه عنه المشركين، حتى حجه المسلمون دونهم، لا يخالطونهم المشركون. فأما الفرائض والأحكام، فإنه قد اختلف فيها، هل كانت أكملت ذلک اليوم أم لا ؟ فرُوي عن ابن عباس والسديّ ما ذكرنا عنهما قبل. ورُوي عن البراء بن عازب أن آخر آية نزلت من القرآن: ﴿يَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾. ولا يدفع ذوعلم أن الوحي لم ينقطع عن رسول ﷺ إلى أن قبض، بل كان الوحي قبل وفاته أكثرما كان تتابعاً. فإذاكان ذلک كذلک. وكان قوله:

﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾ آخرها نزولاً، وكان ذلك من الأحكام والفرائض، كان معلوما أن معنى قوله. ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ على خلاف وجه الذي تأوله من تأوّله، أعني: كمال العبادات والأحكام والفرائض.

فإن قال قائل: فما جعل قول من قال: قد نزل بعد ذلك فرض أولى من قول من قال: لم ينزل؟ قيل لأن الذي قال لم ينزل، مخبر أنه لا يعلم نزول فرض، والنفي لا يكون شهادة، والشهادة قول من قال: نزل، وغير جائز دفع خبر الصادق فيما أمكن أن يكون فيه صادقا القول في تأويل قوله تعالى: ﴿وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾.

يعني جلّ ثناؤه بذلك: وأتممت عليكم نعمتي أيها المؤمنون بإظهاركم على عدوي وعدوّكم من المشركين، ونفيي إياهم عن بلادكم، وقطعي طمعهم من رجوعكم، وعودكم إلى ما كنتم عليه من الشرك.

وبنحو الذي قلنا في ذلك قال أهل التأويل، ذكر من قال ذلك:

—حدثني المثنى، قال: ثنا عبدالله، قال: ثني معاوية، عن عليّ، عن ابن عباس، قال: كان المشركون والمسلمون يحجون جميعاً، فلما نزلت براءة، فنفى المشركين عن البيت، وحجّ المسلمون لا يشاركهم في البيت الحرام أحد من المشركين، فكان ذلك من تمام النعمة: ﴿وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾.

٨٤١٦—حدثنا بشر، قال: ثنا يزيد، قال: ثنا سعيد، عن قتادة، قوله: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾... الآية. ذُكر لنا أن هذه الآية نزلت على رسول الله ﷺ يوم عرفة يوم جمعة، حين نفى الله المشركين عن المسجد الحرام، وأخلص للمسلمين حجهم.

٨٤١٧—حدثنا أبو كريب، قال: ثنا ابن إدريس، قال: ثنا داود، عن الشعبي، قال: نزلت هذه الآية بعرفات، حيث هدم منار الجاهلية، واضمحلّ الشرك، ولم يحُجّ معهم في ذلك العام مشرك.

—حدثنا ابن المثنى قال: ثنا عبد الأعلى، قال: ثنا داود، عن عامر في هذه الآية: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ قال: نزلت

علي رسول الله ﷺ وهو واقف بعرفات، وقد أطاف به الناس، وتهدمت منار الجاهلية ومناسكهم، واضمحلّ الشرك، ولم يطف حول البيت عُريان، فانزل الله: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾.

–حدثني يعقوب، قال: ثنا ابن علية، عن داود، عن الشعبي، بنحوه.

القول في تأويل قوله: ﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلامَ دِيناً﴾

يعني بذلك جلّ ثناؤه: ورضيت لكم الاستسلام لأمري وانقياد لطاعتي، على ما شرعت لكم من حدوده وفرائضه ومعالمه، ﴿ديناً﴾ يعني بذلك: طاعة منكم لي.

فإن قال قائل: أوَ ماكان الله راضياً الإسلام لعباده، إلا يوم أنزل هذه الآية؟ قيل: لم يزل الله راضياً لخلقه الإسلام ديناً، ولكنه جلّ ثناؤه لم يزل يصرّف نبيه محمداً ﷺ وأصحابه في درجات ومراتبه درجة بعد درجة ومرتبة بعد مرتبة وحالاً بعد حال، حتي أكمل لهم شرائعه ومعالمه وبلغ بهم أقصي درجاته ومراتبه، ثم قال حين انزل عليهم هذه الآية: ﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلامَ دِيناً﴾ بالصفة التي هو بها اليوم، والحال التي أنتم عليها اليوم منه، ﴿ديناً﴾ فالزموه ولا تفارقوه. وكان قتادة يقول في ذلك ما:

٨٤١٨–حدثنا بشر، قال: ثنا يزيد، قال: ثنا سعيد، عن قتادة، قال: ذكر لنا أنه يمثّل لأهل كل دين دينهم يوم القيامة، فأما الإيمان فيبشر أصحابه وأهله، ويعد هم في الخير حتي يجيء الإسلام، فيقول: ربّ أنت السلام وأنا الإسلام، فيقول: إياك اليوم أقبل، وبك اليوم أجزي.

وأحسب أن قتادة وجّه معني الإيمان بهذ الخبر إلي معني التصديق والإقرار باللسان، لأن ذلك معني الإيمان عند العرب، ووجه معني الإسلام إلي استسلام القلب وخضوعه لله بالتوحيد، وانقياد الجسد له بالطاعة فيما أمر ونهي، فلذلك قيل للإسلام: إياك اليوم أقبل، وبك اليوم أجزي.

ذكر من قال: نزلت هذه الآية بعرفة في حجة الوداع علي رسول الله ﷺ:

٨٤١٩–حدثنا محمد بن بشار وابن وكيع، قالا: ثنا عبد الرحمن، قال: ثنا سفيان، عن قيس بن مسلم، عن طارق بن شهاب، قال: قالت

اليهود لعمر: إنكم تقرؤن آية لو أنزلت فينا لاتخذ ناها عيدا! فقال عمر: إني لأعلم حين أنزلت، وأين نزلت، وأين رسول الله ﷺ حين أنزلت: أنزلت يوم عرفة ورسول الله ﷺ واقف بعرفة. قال سفيان: وأشك، كان يوم الجمعة أم لا. ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلامَ دِينًا﴾

حدثنا أبو كريب وابن وكيع، قالا: ثنا ابن إدريس، قال: سمعت أبي، عن قيس بن مسلم عن طارق بن شهاب، قال: قال يهودي لعمر: لوعلمنا معشر اليهود حين حين نزلت هذه الآية: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلامَ دِينًا﴾ لو نعلم ذلك اليوم اتخذ نا ذلك اليوم عيداً. فقال عمر: قد علمت اليوم الذي نزلت فيه والساعة، وأين رسول الله ﷺ حين نزلت؛ نزلت ليلة الجمعة ونحن مع رسول الله ﷺ بعرفات. لفظ الحديث لأبي كريب، وحديث ابن وكيع نحوه.

—حدثنا ابن وكيع، قال: ثنا جعفر بن عون، عن أبي العميس، عن قيس بن مسلم، عن طارق، عن عمر، نحوه.

٨٧٢٠—حدثنا ابن وكيع، قال: ثنا أبي، عن حماد بن سلمة، عن عمار مولى بني هاشم، قال: قرأ ابن عباس: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ وعنده رجل من أهل الكتاب، فقال: لو علمنا أي يوم نزلت هذه الآية لاتخذناه عيداً، فقال ابن عباس: فإنها نزلت يوم عرفة يوم جمعة.

—حدثنا أبو كريب، قال: ثنا قبيصة، قال: ثنا حماد بن سلمة، عن عمار: أن ابن عباس قرأ: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلامَ دِينًا﴾ فقال يهودي: لو نزلت هذه الآية علينا لاتخذ نا يومها عيداً، فقال ابن عباس: فإنها نزلت في يوم عيدين اثنين: يوم عيد، ويوم جمعة.

—حدثني المثنى، قال: ثنا الحجاج بن المنهال، قال: ثنا حماد، عن عمار بن أبي عمار، عن ابن عباس نحوه.

–حدثني يعقوب بن إبراهيم، قال: ثنا ابن علية، قال: ثنا رجاء بن أبي سلمة، قال:أخبرنا عبادة بن نسيّ، قال: ثنا أميرنا إسحاق، قال أبوجعفر إسحاق. هو ابن خرشة. عن قبيصة قال: قال كعب: لو أن غير هذه الأمة نزلت عليهم هذه الآية لنظروا اليوم الذي أنزلت فيه عليهم فاتخذوه عيداً يجتمعون فيه، فقال عمر: أيّ آية يا كعب ؟ فقال: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُم﴾ فقال عمر:قد علمت اليوم الذي أنزلت فيه، والمكان الذي أنزلت فيه، يوم جمعة، ويوم عرفة، وكلاهما بحمد الله لنا عيد.

–حدثنا ابن حميد، قال: ثنا حكام، عن عنبسة، عن عيسى بن حارثة الأنصاري، قال :كنا جلوساًفي الديوان، فقال لنا نصراني : يا أهل الإسلام : لقدنزلت عليكم آية لونزلت علينا لاتخذ نا ذلك اليوم وتلك الساعة عيداً ما بقي منا اثنان:﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾فلم يجبه أحد منا، فلقيت محمد بن كعب القرظيّ، فسئلته عن ذلك، فقال: الا رددتم عليه ؟ فقال: قال عمر بن الخطاب: أنزلت على النبي ﷺ وهو واقف على الجبل يوم عرفة، فلا يزال ذلك اليوم عيدًا للمسلمين ما بقي منهم أحد .

٨٧٤١–حدثنا حميد بن مسعدة، قال: ثنابشربن المفضل، قال: ثنا داود، عن عامر، قال: أنزلت على رسول الله ﷺ:﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإسلامَ دِيْناً﴾عشية عرفة وهو في الموقف.

٨٧٤٢–حد ثنا ابن المثني،قال: ثنا عبد الوهاب، قال: ثنا داود، قال : قلت لعامر: إن اليهود تقول :كيف لم تحفظ العرب هذااليوم الذي أكمل الله لها دينها فيه ؟ فقال عامر: أو ما حفظته؟ قلت له: فأيّ يوم ؟ قال: يوم عرفة، أنزل الله في يوم عرفة .

٨٧٤٣–حد ثنا الحسن بن يحي، قال: أخبرنا عبد الرزاق، قال : أخبرنا معمر،عن قتادة،قال:بلغنا أنها نزلت يوم عرفة، ووافق يوم الجمعة.

٨٧٤٤–حد ثنا الحسن بن يحي، قال:أخبرنا عبد الرزاق، قال : أخبرنا معمر، عن حبيب عن إبن أبي نجيح، عن عكرمة:أن عمر بن الخطاب، قال: نزلت سورة المائدة يوم عرفة، ووافق يوم الجمعة.

٨٧٥٢ـ حدثنا الحسن بن يحي، قال: أخبرنا عبد الرزاق، قال: أخبرنا ابن عيينة، عن ليث، عن شهر بن حوشب، قال: نزلت سورة المائدة على النبي ﷺ وهو واقف بعرفة على راحلته، فتنوّخت لأن يُدق ذراعها.

٨٧٢٦ـ حدثنا ابن حميد، قال: ثنا جرير، عن ليث، عن شهر بن حوشب، عن أسماء بنت يزيد، قالت: نزلت سورة المائدة جميعاً وأنا آخذة بزمام ناقة رسول الله ﷺ العضباء، قالت: فكادت من ثقلها أن يدق عضد الناقة.

٨٧٢٧ـ حدثني أبو عامر إسماعيل بن عمرو السكوني، قال: ثنا هشام بن عمار، قال: ثنا ابن عياش، قال: ثنا عمر بن قيس السكوني أنه سمع معاوية بن أبي سفيان على المنبر ينتزع بهذه الآية: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنكُم﴾ حتى ختمها، فقال: نزلت في يوم عرفة، في يوم جمعة.

وقال آخرون: بل نزلت هذه الآية، أعني قوله: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنكُم﴾ يوم الإثنين، وقالوا: أنزلت سورة المائدة بالمدينة، ذكر من قال ذلك:

٨٧٢٨ـ حدثني المثنى قال: ثنا إسحاق، قال: أخبرنا محمد بن حرب، قال: ثنا ابن لهيعة، عن خالد، عن أبي عمران، عن حنش، عن ابن عباس: ولد نبيكم يوم الاثنين، وخرج من مكة يوم الإثنين، ودخل المدينة يوم الاثنين، وأنزلت سورة المائدة يوم الاثنين، ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنكُم﴾ ورفع الذكر يوم الاثنين.

٨٧٢٩ـ حدثني المثنى، قال: ثنا الحجاج بن المنهال، قال: ثنا همام، عن قتادة، قال: المائدة مدنية.

وقال آخرون: نزلت على رسول الله ﷺ في مسيره في حجة الوداع. ذكر من قال ذلك:

٨٧٣٠ـ حدثني المثنى، قال: ثنا إسحاق، قال: ثنا عبد الله بن أبي جعفر، عن أبيه، عن الربيع بن أنس، قال: نزلت سورة المائدة على رسول الله ﷺ في المسير في حجة الوداع، وهو راكب راحلته، فبركت به راحلته من ثقلها.

وقال آخرون: ليس ذلك بيوم معلوم عند الناس، وإنما معناه اليوم الذي أعلمه أنا دون خلقي، أكملت لكم دينكم. ذكر من قال ذلك:

۸۶۳۱—حدثني محمد بن سعد، قال ثني ابي، قال: ثني عمي، قال: ثني ابي،عن ابيه، عن ابن عباس:﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُم﴾ يقول: ليس يوم معلوم يعلمه الناس.

وأولى الأقوال في وقت نزول الآية، القول الذي رُوي عن عمر بن الخطاب أنها نزلت يوم عرفة يوم جمعة، لصحة سنده ووَهْي أسانيد غيره.

تفسیر کشاف:

(اليوم)لم يرد به يوما بعينه وانّما اراد به الزمان الحاضر وما يتصل به وبدانيه من ازمنة الماضيةوالآتية كقولك :كنت با الأمس شاباوأنت اليوم اشيب' فلاتريد بالأمس اليوم الذى قبل يومك ولا باليوم يومك ونحوه الآن في قوله:

الآن لما ابيض مسربتي   وغضضت من نابي على جذم

وقيل اريد يوم نزولها وقد نزلت يوم الجمعة وكان يوم عرفة بعد العصر في حجة الوداع"يئس الذين كفروامن دينكم "يئس منه أن يبطلوه وان ترجعوا محللين لهذه الخبائث بعد ما حرمت عليكم . وقيل يئسوامن دينكم أن يغلبوه لأن الله عزوجلّ وفى بوعده من أظهاره على الدين كله (فلاتخشوهم) بعد أظهار الدين وزوال الخوف من الكفار وانقلابهم مغلوبين مقهورين بعدما كانوا غالبين (واخشون)واخلصوا الى الخشية (أكملت لكم دينكم)كفيتكم أمرعدوكم 'وجعلت اليد العليا لكم كما تقول الملوك : اليوم كمل لنا الملك وكمل لنا ما نريد ' اذا كفوا من ينازعهم الملك ووصلوا الى أغراضهم ومباغيهم او أكملت لكم ما تحتاجون أليه في تكليفكم من تعليم الحلال والحرام والتوقيف على الشرائع وقوانين القياس وأصول الأجتهاد (وأتممت عليكم نعمتي) بفتح مكة ودخولها آمنين ظاهرين وهدم منارالجاهلية ومناسكهم وان لم يحج معكم مشرك ولم يطف بالبيت عريان وأتممت نعمتى عليكم با كمال امرالدين والشرائع كأنه قال : اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت

عليكم نعمتي بذالک لأنه لانعمة أتم من نعمة الاسلام ﴿ورضيت لكم الاسلام دينا﴾يعني اخترته من بين الأديان وأذنت كم بأنه هو الدين المرضى وحده. ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه .أن هذه أمتكم أمة واحدة.

معالم التنزيل :۔ (ص ۱۰ ج ۲)

"﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾، نزلت هذه الآية يوم الجمعة، يوم عرفة بعد العصر في حجة الوداع، والنبي ﷺ واقف بعرفات على ناقته العضبا،فكادت عضدالناقة تندق من ثقلها فبركت، أخبرناعبد الواحد المليحي أنا أحمد بن عبدالله النعيمي أنا محمد بن يوسف أنا محمد بن إسماعيل، حد ثني الحسن بن الصباح سمع جعفربن عون أنا أبو العميس أنا قيس بن مسلم عن طارق بن شهاب عن عمربن الخطاب رضي اللهعنه أن رجلامن اليهود قال له : ياأمير المؤمنين آية في كتابكم تقرؤ ونها، لوعلينا معشر اليهودنزلت لاتخذنا ذلک اليوم عيداً، قال: أيةُ آية؟ قال:﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾قال عمر: قد عرفنا ذلک اليوم والمكان الذي نزلت فيه على النبي ﷺ وهوقائم بعرفة يوم الجمعة، أشار عمرإلى أن ذلک اليوم كان عيدا لنا، قال ابن عباس: كان في ذلک اليوم خمسة أعياد: جمعة وعرفة وعيد اليهود والنصارى والمجوس، ولم تجتمع أهل الملل في يوم قبله ولا بعده، وروى هرون بن عنترة عن أبيه قال : لمانزلت هذ ه الآية بكى عمررضي الله عنه، فقال له النبي ﷺ:"ما يُبكيک ياعمر"؟ فقال: أبكاني أنا كنا في زيادة من ديننا، فأما إذاكمل فإنه لم يكن شيء إلانقص، قال: صدقت، وكانت هذه الآية نعي النبي ﷺ وعاش بعد هاإحدى وثمانين يوماً، ومات يوم الإثنين بعد مازاغت الشمس لليلتين خلتا من شهرربيع الأوّل إحدى عشرة من الهجرة، وقيل: تُوفي يوم الثاني عشرمن شهرربيع الأول وكانت هجرته في الثاني عشرمن شهرربيع الأول، أما تفسيرالآية قوله عزّوجلّ:﴿اليومَ اكملتُ لكم دينكُم﴾يعني : يوم نزول هذه الآية أكملت لكم دينكم،

يعني الفرائض والسنن والحدود والجهاد والأحكام والحلال والحرام، فلم ينزل بعد هذه الآية حلال ولا حرام، ولا شيءٌ من الفرائض والسنن والحدود والأحكام هذا معنى قول ابن عباس رضي الله عنهما، ويُروى عنه أن آية الرّبا نزلت بعدها، وقال سعيد بن جبير وقتادة: أكملت لكم دينكم فلم يحج معكم مشرك، وقيل: أظهرتُ دينكم وأمّنتُكُمْ من العدو، وقوله عزّوجلّ: ﴿وأتممتُ عليكم نعمتي﴾، يعني: وانجزتُ وعدي في قوله: ﴿ولأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ﴾ فكان من تمام نعمته أن دخلوا مكة آمنين وعليها ظاهرين، وحجوا مطمئنين لم يخالطهم أحد من المشركين، ﴿ورضيتُ لَكُمُ الإسْلامَ دِيْناً﴾ سمعت عبد الواحد قال: سمعت عبد الواحد المليحي قال: سمعتُ أبامحمد بن حاتم، قال: سمعت أبابكر النيسابوري سمعت أبا بكر محمد بن الحسن بن المسيب المروزي، سمعت أباحاتم محمد بن إدريس الحنظلي، سمعت عبد الملك بن مسلمة أنا مروان المصري سمعت إبراهيم بن أبي بكر بن المنكدر رضي الله عنه، سمعت عمي محمد بن المنكدر سمعت جابر بن عبد الله يقول: سمعت رسول الله ﷺ يقول: "قال جبرئيل قال الله تعالى: هذا دين ارتضيتُه لنفسي ولن يصلحه إلا السخاء وحُسْنُ الخلق، فاكرموه بهما ما صحبتموه".

تفسیر کبیر:۔ (ص۲۸۷۔۲۸۹ج۳)

ثم قال تعالى: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلامَ دِيْناً﴾ وفيه مسائل:

المسألة الأولى: في الآية سؤال وهو أن قوله: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ يقتضي أن الدين كان ناقصاً قبل ذلك، وذلك يوجب أن الدين الذي كان ﷺ مواظباً عليه أكثر عمره كان ناقصاً، وإنه إنما وجد الدين الكامل في آخر عمره مدة قليلة.

واعلم أن المفسرين لأجل الاحتراز عن هذا الاشكال ذكروا وجوهاً:
الأوّل: أن المراد من قوله: ﴿اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ هو إزالة الخوف عنهم وإظهار القدرة لهم على أعدائهم، وهذا كما يقول الملك عند ما

يستولي على عدوه ويقهره قهراً كلياً: اليوم كمل ملكنا، وهذا الجواب ضعيف لأن ملك ذلك الملك كان قبل قهر العدو ناقصاً. الثاني: أن المراد: إني أكملت لكم ما تحتاجون إليه في تكاليفكم من تعلم الحلال والحرام، وهذا أيضاً ضعيف لأنه لولم يكمل لهم قبل هذا اليوم ما كانوا محتاجين إليه من الشرائع كان ذلك تاخير البيان عن وقت الحاجة، وأنه لايجوز. الثالث: وهو الذي ذكره القفال وهو المختار: أن الدين ما كان ناقصاً البتة، بل كان أبداً كاملاً، يعني كانت الشرائع النازلة من عند الله في كل وقت كافية في ذلك الوقت، إلا أنه تعالىٰ كان عالماً في أول وقت المبعث بأن ما هو كامل في هذااليوم ليس بكامل في الغد ولا صلاح فيه، فلا جرم كان ينسخ بعد الثبوت وكان يزيد بعد العدم، وأما في آخر زمان المبعث فأنزل الله شريعة كاملة وحكم ببقائها إلى يوم القيامة، فالشرع أبداً كان كاملاً، إلا أن الاول كمال إلى زمان مخصوص، والثاني كمال إلى يوم القيامة فلأجل هذاالمعنى قال: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾

المسألة الثانية: قال نفاة القياس: دلت الآية على أن القياس باطل، وذلك لأن الآية دلت على أنه تعالىٰ قد نص على الحكم في جميع الوقائع، إذ لو بقي بعضها غير مبين الحكم لم يكن الدين كاملاً، وإذا حصل النص في جميع الوقائع فالقياس إن كان على وفق ذلك النص كان عبثاً، وإن كان خلافه كان باطلاً.

أجاب مثبتو القياس بأن المراد بإكمال الدين أنه تعالىٰ بين حكم جميع الوقائع بعضها بالنص وبعضها بأن بين طريق معرفة الحكم فيها على سبيل القياس، فإنه تعالىٰ لما جعل الوقائع قسمين أحدهما التي نص على أحكامها، والقسم الثاني أنواع يمكن استنباط الحكم فيها بواسطة قياسها على القسم الأول، ثم أنه تعالىٰ لما أمر بالقياس وتعبد المكلفين به كان ذلك في الحقيقة بياناً لكل الأحكام، وإذا كان كذلك كان إكمالا للدين.

قال نفاة القياس: الطريق المقتضية لإلحاق غير المنصوص بالمنصوص إما أن تكون دلائل قاطعة أو غير قاطعة، فإن كان القسم الأول فلا نزاع في صحته، فإنا نسلم أن القياس المبني على المقدمات اليقينية حجة، إلا

أن مثل هذا القياس يكون المصيب فيه واحداً، والمخالف يكون مستحقاً للعقاب، وينقض قضاء القاضي فيه وأنتم لا تقولون بذلك. وإن كان الحق هو القسم الثاني كان ذلك تمكيناً لكل أحد أن يحكم بما غلب على ظنه من غير أن يعلم أنه هل هو دين الله أم لا، وهل هو الحكم الذي حكم به الله أم لا، ومعلوم أن مثل هذا لا يكون إكمالاً للدين، بل يكون ذلك إلقاء للخلق في ورطة الظنون والجهالات، قال مثبتو القياس: إذا كان تكليف كل مجتهد أن يعمل بمقتضى ظنه كان ذلك إكمالاً للدين، ويكون كل مكلف قاطعاً بأنه عامل بحكم الله فزال السؤال.

المسألة الثالثة: قال أصحابنا: هذه الآية دالة على بطلان قول الرافضة، وذلك لأنه تعالىٰ بين أن الذين كفروا يئسوا من تبديل الدين، وأكد ذلك بقوله﴿فلا تخشوهم واخشون﴾فلو كانت إمامة عليّ بن أبي طالب رضي الله عنه منصوصاً عليها من قبل الله تعالىٰ وقبل رسوله ﷺ نصاً واجب الطاعة لكان من أراد إخفائه وتغيره آيساً من ذلك بمقتضي هذه الآية، فكان يلزم أن لا يقدر أحد من الصحابة على إنكار ذلك النص وعلى تغيره وإخفائه، ولما لم يكن الأمر كذلك، بل لم يجر لهذا النص ذكر، ولا ظهر منه خبر ولا أثر، علمنا أن إدعاء هذاالنص كذب، وأن عليّ بن أبي طالب رضي الله عنه ما كان منصوصاً عليه بالإمامة.

المسألة الرابعة: قال أصحاب الآثار: إنه لما نزلت هذه الآية على النبي ﷺلم يعمر بعد نزولها إلا أحداً وثمانين يوماً، أواثنين وثمانين يوماً، ولم يحصل في الشريعة بعدها زيادة ولا نسخ ولا تبديل البتة، وكان ذلك جارياً مجرى اخبار النبي ﷺ عن قرب وفاته، وذلك إخبار عن الغيب فيكون معجزاً، ومما يؤكد ذلك ما روي أنه ﷺ لما قراهذه الآية على الصحابة فرحوا جداً وأظهروا السرورالعظيم إلا أبابكر رضي الله عنه فإنه بكى فسئل عنه فقال: هذه الآية تدل على قرب وفاة رسول الله ﷺ فإنه ليس بعد الكمال إلا الزوال، فكان ذلك دليلاً على كمال علم الصديق حيث وقف من هذه الآية على سر لم يقف عليه غيره.

المسألة الخامسة: قال أصحابنا: دلت الآية على أن الدين لا يحصل إلا بخلق الله تعالیٰ وإيجاده، والدليل عليه أنه أضاف إكمال الدين إلى نفسه فقال:﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ولن يكون إكمال الدين منه إلا وأصله أيضاً منه.

واعلم أنا سواء قلنا: الدين عبارة عن العمل، أو قلنا إنه عبارة عن المعرفة، أو قلنا إنه عبارة عن مجموع الاعتقاد والاقرار والفعل فالاستدلال ظاهر.

وأما المعتزلة فإنهم يحملون ذلك على إكمال بيان الدين وإظهار شرائعه، ولا شك أن الذي ذكروه عدول عن الحقيقة إلى المجاز.

ثم قال تعالیٰ:﴿وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ومعنى اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ باكمال امرالدين والشريعة كأنه قال: اليوم اكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي بسبب ذلك الاكمال لأنه لا نعمة أتم من نعمة الإسلام.

واعلم أن هذه الآية أيضاً دالة على أن خالق الإيمان هوالله تعالیٰ، وذلك لأنا نقول:الدين الذي هو الإسلام نعمة، وكل نعمة فمن الله، فيلزم أن يكون دين الإسلام من الله.

إنما قلنا: إن الإسلام نعمة لوجهين: الأول: الكلمة المشهورة على لسان الأمة وهي قولهم: الحمد لله على نعمة الإسلام.

والوجه الثاني: أنه تعالیٰ قال في هذه الآية: ﴿اليوم اكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي﴾ ذكر لفظ النعمة مبهمة، و الظاهر أن المراد بهذه النعمة ما تقدم ذكره وهو الدين.

فإن قيل: لم لا يجوز أن يكون المراد بإتمام النعمة جعلهم قاهرين لأعدائهم، أو المراد به جعل هذاالشرع بحيث لا يتطرق إليه نسخ.

قلنا:أن الأول فقد عرف بقوله﴿اليوم يئس الذين كفروا من دينكم﴾ فحمل هذه الآية عليه أيضاً يكون تكريراً.

وأما الثاني فلأن إبقاء هذاالدين لما كان إتماماً للنعمة وجب أن يكون أصل هذاالدين نعمة لا محالة، فثبت أن دين الإسلام نعمة.

وإذا ثبت هذ افنقول: كل نعمة فهي من الله تعالى، الدليل عليه قوله تعالى: ﴿وما بكم من نعمة فمن الله﴾ وإذا ثبت هاتان المقدمتان لزم القطع بأن دين الإسلام إنما حصل بتخليق الله تعالىٰ وتكوينه وإيجاده.

ثم قال تعالىٰ: ﴿رضيت لكم الإسلام دينا﴾ والمعنى أن هذ الدين هو دين المرضي عند الله تعالىٰ ويؤكده قوله تعالىٰ: ﴿ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه﴾.

تفسیر ابن کثیر:۔ (ص۱۹۔۲۰ ج۲)

وقوله ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي ورضيت لكم الإسلام ديناً﴾ هذه أكبر نعم الله تعالىٰ على هذه الأمة حيث أكمل تعالىٰ لهم دينهم، فلا يحتاجون إلى دين غيره، ولا إلى نبى غير نبيهم صلواة الله وسلامه عليه، ولهذا جعله الله تعالىٰ خاتم الأنبياء وبعثه إلى الإنس والجنّ، فلا حلال إلا ما أحله، ولا حرام إلا ما حرمه، ولا دين إلا ما شرعه، وكل شيء أخبر به فهو حق وصدق لا كذب فيه ولا خلف كما قال تعالىٰ: ﴿وتمت كلمة ربک صدقاً وعدلا﴾ أى صدقاً في الأخبار، و عدلاً في الأوامر والنواهي، فلما أكمل لهم الدين، تمت عليهم النعمة، ولهذا قال تعالىٰ: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي ورضيت لكم الإسلام ديناً﴾ أي فارضوه أنتم لأنفسكم، فإنه الدين الذي أحبه الله ورضيه، وبعث به أفضل الرسل الكرام، وأنزل به أشرف كتبه.
وقال عليّ بن أبي طلحة عن ابن عباس قوله: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ وهو الإسلام، أخبر الله نبيه صلى الله عليه وسلم والمؤمنين أن لهم قد أكمل لهم الإيمان، فلا يحتاجون إلى زيادة أبداً، وقد أتمه الله فلا ينقصه أبداً، وقد رضيه الله فلا يسخطه أبداً، وقال أسباط عن السديّ: نزلت هذه الآية يوم عرفة، ولم ينزل بعدها حلال ولا حرام، ورجع رسول الله صلى الله عليه وسلم فمات قالت أسماء بنت عميس: حججت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم تلك الحجة فبينما نحن نسير إذ تجلى له جبريل، فمال رسول الله صلى الله عليه وسلم على الراحلة، فلم تطق الراحلة من ثقل ما عليها من القرآن، فبركت، فأتيته فسجيت عليه

برداً كان علي . وقال ابن جرير وغير واحد: مات رسول الله ﷺ بعد يوم عرفة بأحد وثمانين يوماً، رواهما ابن جرير، ثم قال :حدثنا سفيان بن وكيع، حدثنا ابن فضيل عن هارون بن عنترة، عن أبيه، قال: لما نزلت ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾وذلك يوم الحج الأكبر، بكى عمر،فقال له النبي ﷺ"ما يبكيك ؟"قال:"أبكاني أنا كنا في زيادة من ديننا، فأما إذا أكمل فإنه لم يكمل شيء إلا نقص، فقال"صدقت"ويشهد لهذا المعنى الحديث الثابت"إن الإسلام بدأ غريباً، وسيعود غريباً، فطوبي للغرباء"

قال الإمام أحمد :حدثنا جعفر بن عون، حدثنا أبو العميس عن قيس بن مسلم، عن طارق بن شهاب قال : جاء رجل من اليهود إلى عمر بن الخطاب فقال: يا أمير المؤمنين، إنكم تقرؤون آية في كتابكم لو علينا معشر اليهودنزلت، لاتخذنا ذلك اليوم عيداً، قال: وأي آية ؟ قال : قوله ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾فقال عمر: والله إني لأعلم اليوم الذي نزلت على رسول الله ﷺ،والساعة التي نزلت فيها على رسول الله ﷺ: عشية عرفة في يوم جمعة، ورواه البخارى عن الحسن بن الصباح عن جعفر بن عون به، ورواه أيضاً مسلم والترمذي والنسائي أيضاً من طرق عن قيس بن مسلم به . ولفظ البخارى عند تفسير هذه الآية من طرق سفيان الثوري، عن قيس، عن طارق قال: قالت اليهود لعمر: والله إنكم تقرؤون آية لونزلت فينا لاتخذناها عيداً. فقال عمر: إني لأعلم حين أنزلت، وأين أنزلت، وأين رسول الله ﷺ حيث أنزلت : يوم عرفة، وأنا والله بعرفة، قال سفيان: وأشك، كان يوم الجمعة أم لا ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾الآية، وشك سفيان رحمه الله إن كان في الرواية، فهو تورع حيث شك هل أخبره شيخه بذلك أم لا، وإن كان شك في كون الوقوف في حجة الوداع كان يوم جمعة، فهذا ما أخاله عن الثورى رحمه الله، فإن هذا أمر معلوم مقطوع به، لم يختلف فيه أحد من أصحاب المغازي والسير، ولا من فقهاء وقد وردت في ذلك أحاديث متواترة لا يشك في صحتها، والله أعلم، وقد روي هذا الحديث من غير وجه عن عمر.

وقال ابن جرير: حدثني يعقوب بن ابراهيم، حدثنا إبن علية، أخبرنا رجاء بن أبي سلمة، أخبرنا عبادة بن نسي، أخبرنا أميرنا إسحاق، قال أبوجعفربن جرير وهو إسحاق بن حرشة عن قبيصة يعني إبن أبي ذنب، قال: قال كعب: لو أن غير هذ ه الأمة نزلت، عليهم هذ ه الآية، لنظروا اليوم الذى أنزلت فيه عليهم، فاتخذ وه عيداً يجتمعون فيه، فقال عمر: أيّ آية يا كعب؟ فقال: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ فقال عمر: قد علمت اليوم الذي أنزلت، والمكان الذي انزلت فيه: نزلت في يوم الجمعة، و يوم عرفة، وكلاهما بحمد الله لنا عيد. وقال: حدثنا ابو بكر، حدثنا قبيصة، حدثنا حمادبن سلمة، عن عمارهومولى بني هاشم: ان ابن عباس قرأ ﴿اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام ديناً﴾ فقال يهودي: لو نزلت هذ ه الآية علينا، لاتخذ نا يومهاعيداً، فقال ابن عباس: فانهانزلت فييوم عيد ين اثنين: يوم عيد، ويوم جمعة. وقال ابن مردويه: حدثنا أحمد بن كامل، حدثنا موسى بن هارون، حدثنا يحي بن الحماني، حد ثناقيس بن الربيع عن اسماعيل بن سليمان، عن أبي عمر البزار، عن ابن الحنفية، عن عليّ قال: نزلت هذ ه الآية على رسول الله صلى الله عليه وسلم وهوقائم عشيةعرفة ﴿اليوم اكملت لكم دينكم﴾

وقال ابن جرير: حدثناأبوعامراسماعيل بن عمرو السكوني، حدثنا هشام بن عمار، حدثناابن عياش حدثنا عمروبن قيس السكوني، أنه سمع معاوية بن أبي سفيان على المنبرينتزع بهذه الآية ﴿اليوم اكملت لكم دينكم﴾ حتى ختمها، فقال: نزلت في يوم عرفة فييوم جمعة وروى ابن مردوية من طريق محمد بن إسحق عن عمربن موسى بن دحية، عن قتادة عن الحسن، عن سمرة قال: نزلت هذه الآية ﴿اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام ديناً﴾ يوم عرفة، ورسول الله صلى الله عليه وسلم واقف على الموقف، فأمامارواه ابن جريروابن مردوية والطبراني من طريق ابن لهيعة عن خالد بن أبي عمران، عن حنش بن عبدالله الصغاني، عن ابن عباس قال: ولد نبيكم صلى الله عليه وسلم

يوم الإثنين، وخرج من مكة يوم الإثنين، ودخل المدينة يوم الإثنين، وفتح بدرا يوم الإثنين، وأنزلت سورة المائدة يوم الإثنين .﴿اليوم اكملت لكم دينكم﴾ورفع الذكريوم الإثنين، فإنه أثرغريب،وإسناده ضعيف،وقدرواه الإمام أحمد: حدثنا موسى بن داود، حدثنا ابن لهيعة عن خالد بن أبي عمران،عن حنش الصنعاني، عن ابن عباس قال: ولدالنبي ﷺ يوم الإثنين، واستنبىء يوم الإثنين، وخرج مهاجرامن مكة إلى المدينة يوم الإثنين، وقدم المدينة يوم الإثنين، وتوفي يوم الإثنين، ووضع الحجرالأسود يوم الإثنين، هذ الفظ أحمد، ولم يذكرنزول المائدة يوم الإثنين، فالله أعلم، ولعل ابن عباس أرادأنهانزلت يوم عيدين إثنين، كماتقدم فاشتبه على الراوي، والله أعلم.

وقال ابن جرير:وقدقيل:ليس ذلک بيوم معلوم عندالناس، ثم روى من طريق العوفي عن ابن عباس في قوله﴿اليوم اكملت لكم دينكم﴾ يقول: ليس ذلک بيوم معلوم عند الناس قال : وقدقيل : إنها نزلت على رسول الله ﷺ في مسيره إلى حجة الوداع، ثم رواه من طريق أبي جعفر الرازي عن الربيع بن أنس . قلت : وقد روى ابن مردويه من طرق أبي هارون العبدي عن أبي سعيد الخدري : أنها نزلت على رسول الله ﷺ يوم غدير خم حين قال لعليّ "من كنت مولاه فعلي مولاه " ثم رواه عن أبي هريرة، وفيه أنه اليوم الثامن عشر من ذي الحجة يعني مرجعه عليه السلام من حجة الوداع، ولا يصح هذا ولا هذا بل الصواب الذي لا شک فيه ولا مرية أنها أنزلت يوم عرفة،وكان يوم جمعة كما روى ذلک امير المؤمنين عمر بن الخطاب وعلي بن أبي طالب،وأول ملوک الإسلام معاوية بن أبي سفيان، وترجمان القرآن عبدالله بن عباس،وسمرة بن جندب رضي الله عنهم، وأرسله الشعبي وقتادة بن دعامة وشهر بن حوشب وغير واحد من الأئمة والعلماء، واختاره ابن جرير طبري رحمه الله."

آیت:(۸)

"یٰبَنِیْ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ. وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ." (اعراف: ۳۶،۳۵)

ترجمہ: اے اولاد آدم کی اگر آئیں تمھارے پاس رسول تم میں کے کہ سنائیں تم کو آیتیں میری تو جو کوئی ڈرے اور نیکی پکڑے تو نہ خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ اور جنھوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے، وہی ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

خلاصہ:۔

ابن جریر طبریؒ نے حضرت ابو یسار سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ خطاب تمام اولاد آدم کو عالم ارواح میں ہوا تھا۔ جبکہ بعض محققین کے نزدیک جو خطاب ہر زمانے میں ہر قوم کو ہوتا رہا۔ جس میں شیطان کے مکروفریب سے ہوشیار رہنے اور اخلاص و عبودیت کا راستہ اختیار کرنے کی تاکید کی جاتی رہی ہے، یہ اس کی حکایت ہے۔ کہ جنت سے نکلنے کے بعد جنت جیسی بے فکری اور خوشحالی یہاں اگرچہ میسر نہیں تاہم آرام و آسائش کا جو موقع یہاں تمھیں دیا گیا ہے اس اثنا اگر خدا تعالیٰ کسی وقت تمھیں میں سے کوئی پیغمبر مبعوث فرمائے تو ان کی پیروی کرو۔ جو لوگ اُن کو جھٹلائیں گے انھیں ابدی عذاب اور ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔

بہر حال جو لوگ اس آیت سے قیامت تک کے لئے نبوت کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں ان کے لئے اپنی مقصد براری کا یہاں کوئی موقع نہیں۔

قادیانی استدلال:

یہ آیت آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی۔ لہٰذا اس میں حضور ﷺ کے بعد آنے والے رسولوں کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ کے بعد بنی آدم کو خطاب ہے لہٰذا جب تک بنی آدم دنیا میں موجود ہیں اس وقت تک نبوت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

جواب ا-

اس آیت کریمہ سے قبل اسی رکوع میں تین بار "یابنی آدم" آیا ہے۔ اور اول "یابنی آدم" کا تعلق "اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (البقرہ ۳۶) سے ہے۔ اِهْبِطُوْا کے مخاطب سیدنا آدم علیہ السلام وسیدہ حواء ہیں۔ لہٰذا اس آیت میں بھی آدم علیہ السلام کے وقت کے اولادِ آدم کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ پھر زیر بحث آیت نمبر ۳۵ ہے۔ آیت نمبر ۱۰ سے سیدنا آدم علیہ السلام کا ذکر شروع ہے۔ اس تسلسل کے تناظر میں دیکھا جائے تو دو رکوع سے پہلے جو مضمون چلا آرہا ہے اس کی ترتیب وتنسیق خود ظاہر کرتی ہے کہ جب آدم وحوا کو اپنے اصلی مسکن (جنت) سے عارضی طور پر جدا کیا گیا تو انکی مخلصانہ توبہ وانابت پر نظر کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ اس حرمان کی تلافی اور تمام اولادِ آدم کو اپنی میراث آبائی واپس دلانے کے لئے کچھ ہدایات دی جائیں۔ چنانچہ ھبوطِ آدم کا قصہ ختم ہونے کے بعد "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا" (اعراف ۲۶) سے خطاب شروع کرکے تین چار رکوع تک انہی ہدایات کا مسلسل بیان ہوا ہے۔ تو حقیقت میں یہ خطاب اولین اولادِ آدم علیہ السلام کو ہے اس پر قرینہ اس کا سباق ہے۔ تسلسل اور سباق آیات کی صراحتہ دلالت موجود ہے کہ یہاں پر حکایت کی گئی ہے۔

۲-قرآن مجید کے اسلوب بیان سے یہ بات ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی امت اجابت کو "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور آپ ﷺ کی امت دعوت کو "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ" سے خطاب ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی آپ ﷺ کی امت اجابت کو یابنی آدم سے خطاب نہیں کیا گیا۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ آیت بالا میں حال ماضیہ کی حکایت ہے۔

ضروری وضاحت

ہاں البتہ "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ" کی عمومیت کے حکم میں آپ ﷺ کی امت کے لئے وہی سابقہ احکام ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ منسوخ نہ ہوگئے ہوں۔ اور اگر وہ منسوخ

ہو گئے یا کوئی ایسا حکم جو آپ ﷺ کی امت کو اس عمومیت میں شمول سے مانع ہو تو پھر آپ ﷺ کی امت کا اس عموم سے سابقہ نہ ہو گا۔

۳- کبھی قادیانی کرم فرماؤں نے یہ بھی سوچا کہ بنی آدم میں ہندو، عیسائی، یہودی، سکھ، سبھی شامل ہیں۔ کیا ان میں سے نبی پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر نہیں تو پھر ان کو اس آیت کے عموم سے کیوں خارج کیا جاتا ہے؟ ثابت ہوا کہ خطاب عام ہونے کے باوجود حالات و واقعات و قرائن کے باعث اس عموم سے کئی چیزیں خارج ہیں۔ پھر بنی آدم میں تو عورتیں، ہجڑے بھی شامل ہیں۔ تو کیا اس عموم سے ان کو خارج نہ کیا جائے گا؟ اگر یہ کہا جائے کہ عورتیں وغیرہ تو پہلے نبی نہ تھیں اس لئے وہ اب نہیں بن سکتیں تو پھر ہم عرض کریں گے کہ پہلے رسول مستقل آتے تھے، اب تم نے رسالت کو اطاعت سے وابستہ کر دیا ہے۔ تو اس میں ہجڑے و عورتیں بھی شامل ہیں۔ لہٰذا مرزائیوں کے نزدیک عورتیں و ہجڑے بھی نبی ہونے چاہئیں۔

۴- اگر ''یابنی آدم اما یاتینکم رسل'' سے رسولوں کے آنے کا وعدہ ہے تو ''اما یاتینکم منی ھدی'' میں وہی یاتینکم ہے اس سے ثابت ہوا کہ نئی شریعت بھی آسکتی ہے۔ تو مرزائیوں کے عقیدہ کے خلاف ہوا۔ کیونکہ تمہارے نزدیک تو اب تشریعی نبی نہیں آسکتا۔ کیونکہ خود مرزا نے کہا ''رسول کا لفظ عام ہے جس میں رسول اور نبی اور محدث داخل ہیں'' (آئینہ کمالات ص۳۲۲ ج۵)

اگر کہا جائے کہ ''قلنا اھبطوا منھا جمیعا'' قرینہ ہے کہ ہبوط آدم کے وقت کے لئے یہ آیت مخصوص ہے تو ہم عرض کریں گے کہ ''یابنی آدم'' قرینہ ہے کہ یہ حکم اولین اولاد آدم کو تھا۔ اس میں آپ ﷺ کی امت کو خطاب نہیں کیا گیا۔ بلکہ حکایت حال ماضیہ کی گئی ہے۔

۵:- اما حرف شرط ہے۔ جس کا تحقق ضروری نہیں۔ یاتینکم مضارع ہے اور ہر مضارع کے لئے استمرار ضروری نہیں۔ جیسا کہ فرمایا ''اما ترین من البشر احدا'' (مریم ۲۶) کیا حضرت مریم قیامت تک زندہ رہیں گی اور کسی بشر کو دیکھتی رہیں گی؟ مضارع

اگرچہ بعض اوقات استمرار کے لئے آتا ہے مگر استمرار کیلئے قیامت تک رہنا ضروری نہیں جو فعل دو چار دفعہ پایا جائے اسکے لئے مضارع استمرار سے تعبیر کرنا جائز ہے اس کی ایک مثال گزر چکی ہے[1]

۶۔ آیت زیر بحث میں ہے "یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ" تو معلوم ہوا کہ آنے والے رسول شریعت لائیں گے۔ جیسا کہ مفسرین نے اور بالخصوص امام فخر الدین رازی نے وضاحت کی ہے اور جیسا کہ "نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ" سے ثابت ہے۔ تو یہ آیت مرزائیوں کے دعویٰ کے خلاف ہوئی کیونکہ ان کے نزدیک تو اب صاحب شریعت نبی نہیں آئیں گے۔ چنانچہ مرزا صاحب بھی شریعت کے اجرا کے قائل نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> "میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء حقیقی معنوں کی رو سے سمجھتا ہوں اور قرآن کو خاتم الکتب تسلیم کرتا ہوں" (سراج منیر خ ص ۶ ج ۱۲)

۷۔ درمنثور ج ۳ ص ۸۲ میں زیر بحث آیت ھذا لکھا ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ الآیۃ

اخرج ابن جریر عن ابی یسار السلمی فقال ان اللہ تبارک وتعالیٰ جَعَلَ آدم وذریتہ فی کفہ فقال یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ ثم نظر الی الرسل فقال یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا

> ابی یسار سلمی سے روایت ہے کہ اللہ رب العزت نے سیدنا آدم علیہ السلام اور ان کی جملہ اولاد کو (اپنی قدرت و رحمت کی) مٹھی میں لیا اور فرمایا "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ" الآیہ پھر نظر (رحمت) رسولوں پر ڈالی تو ان کو فرمایا یاایھا الرسل الآیہ۔

---

[1] اس کی مزید چند مثالیں یہ ہیں (۱) "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ ... یَحْکُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ" مائدہ ۴۴۔ ظاہر ہے کہ تورات کے موافق حکم کرنے والے گزر چکے۔ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد کسی کو حق ہے کہ صاحب تورات کو بھی حق حاصل نہیں اس کی تبلیغ کا (۲) "وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ" الانبیاء ۷۹۔ تسبیح داؤدی زندگی تک ہی رہی پھر مسدود ہوگئی مگر ہر جگہ صیغہ مضارع کا ہے۔ (۳) "وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ" انعام ۱۹ اچنانچہ حضور ﷺ ایک زمانہ تک ڈراتے رہے مگر اب بلاواسطہ آپ کی انذار وتخویف مسدود ہے۔

غرض یہ کہ عالم ارواح کے واقعہ کی حکایت ہے۔ نہ کہ حضور خاتم النبیین ﷺ کے بعد نبوت جاری ہونے کی خبر!

مرزائی عذر۔ ا

اس آیت میں حضور ﷺ کے زمانہ کے بعد بنی آدم کو ہی خطاب ہے جیسے "یٰبنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد" میں کیونکہ اس میں مسجد کا لفظ ہے اور یہ لفظ محض امت محمدیہ ہی کی عبادت گاہ کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

جواب:۔

امم سابقہ کے لئے بھی مسجد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ کہف میں ہے "قال الذین غلبوا علی امرھم لنتخذن علیھم مسجدا" (کہف ۲۱)

بالفرض والتقدیر اگر اس آیت کو اجرائے نبوت کی دلیل مان بھی لیا جائے تب بھی مرزا غلام احمد قیامت کی صبح تک نبی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ وہ بقول خود آدم کی اولاد ہی نہیں اور یہ آیت تو صرف بنی آدم سے متعلق ہے۔ مرزا نے اپنا تعارف بایں الفاظ کرایا ہے۔ ملاحظہ ہو

کرم خاکی ہوں میرے پیارے نہ آدم زاد ہوں
ہوں بشر کی جائے نفرت اور انسانوں کی عار

(براہین احمدیہ پنجم خ ص ۱۲۷ ج ۲۱)

اب اگر وہ بنی آدم میں سے تھا جیسا کہ ہمارا اسکے بارے میں ابھی تک خیال ہے تو پھر اسنے اپنی آدمیت کا انکار کر کے سفید جھوٹ بولا ہے اور جھوٹا آدمی نبی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ واقعی دائرہ آدمیت سے خارج تھا تو پھر یا بنی آدم والی آیت سے اسکی نبوت نہیں ثابت کی جا سکتی۔ اس لئے مرزائیوں کا اس آیت سے اجراء نبوت کی دلیل پیش کرنا سراسر لاحاصل کوشش ہے۔

شعر میں تاویل

مذکورہ بالا شعر میں مرزائی یہ تاویل کرتے ہیں کہ دراصل ہمارے حضرت صاحب بہت ہی منکسر المزاج تھے۔ اس کسر نفسی کی بنا پر انھوں نے یہ شعر کہہ دیا اس سے اپنا تعارف کرانا مقصود نہ تھا۔ لہٰذا یہ شعر ہماری بحث سے خارج ہونا چاہئے۔

تاویل کا تجزیہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی عقل مند آدمی ایسی تواضع نہیں کرتا کہ اپنے آدمی ہونے ہی کا انکار کر دے، اور ساتھ میں اپنے کو بشر کی جائے نفرت (شرمگاہ) قرار دے۔ دوسری بات یہ کہ جو شخص متواضع ہوتا ہے وہ ہر جگہ اپنی تواضع اور کسر نفسی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک جگہ اپنے آدمی ہونے کا ہی انکار کر دے اور دوسری جگہ اپنے کو دنیا کا سب سے عظیم المرتبت انسان قرار دینے لگے۔ لیکن اس الٹی منطق کا ارتکاب مرزا جی ایک نہیں بے شمار جگہ کرتے ہیں۔ چند ایک انکی نام نہاد تواضع کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ جو مرزائیوں کی تاویل کا منہ چڑا رہے ہیں۔ دیکھئے!

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو   اس سے بہتر غلام احمد ہے!

(دافع البلاء خ ص ۲۴۰ ج ۱۸)

روضۂ آدم کہ جو تھا نامکمل اب تلک، میرے آنے سے ہوا کامل بجملہ برگ وبار

(براہین پنجم خ ص ۱۴۴ ج ۲۱)

کربلائے   است   سیر   ہر   آنم
صد   حسین   است   در   گریبانم
آدمم   نیز   احمد   مختار
در   برم   جامہ   ہمہ   ابرار
آنچہ   داد است   ہر   نبی   را   جام
داد   آں   جام   را   مرا   بتمام
انبیاء   گرچہ   بودہ   اند   بسے
من   بعرفاں   نہ   کمترم   زکسے

(نزول المسیح خ ص ۴۷۷ ج ۱۸)

خود ہی سوچیے ! کیا کوئی ہوشمند انسان ایسے متکبر اور گھمنڈی کو منکسر المزاج کہہ سکتا ہے؟

مرزا نے کہا: کربلائے ست سیرم ہر آنم تو مرزا کے بیٹے مرزا محمود نے اس پر یہ رنگ چڑھایا:

''حضرت مسیح موعود (مرزا مردود) نے فرمایا کہ میرے گریبان میں سو حسین ہیں۔ لوگ اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود نے فرمایا کہ میں سو حسین کے برابر ہوں۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر اس کا مفہوم یہ ہے کہ سو حسین کی قربانی کے برابر میری ہر گھڑی کی قربانی ہے۔ وہ شخص جو اہل دنیا کی فکروں میں گھلا جاتا ہے جو ایسے وقت میں کھڑا ہوتا ہے جبکہ ہر طرف تاریکی اور ظلمت پھیلی ہوئی ہے۔ اور اسلام کا نام مٹ رہا ہے۔ وہ دن رات دنیا کا غم کھاتا ہوا اسلام کو قائم کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی قربانی سو حسین کے برابر نہ تھی۔ یہ تو ادنیٰ سوال ہے کہ حضرت مسیح موعود امام حسین کے برابر تھے یا ادنیٰ۔ (خطبہ محمود مندرجہ اخبار الفضل قادیان ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء)

اب قادیانی بتائیں کہ کیا یہ منکسر المزاجی تھی؟

۲- کرم خاکی ہوں میرے پیارے نہ آدم زاد ہوں اگر یہ عاجزی ہے تو تمام مرزائی اجتماعی طور پر مرزا قادیانی کی سنت پر عمل کرکے عاجزی کریں اور اعلان کریں کہ وہ آدم زاد نہیں

۳- ہوں بشر کی جائے نفرت اور انسانوں کی عار، تو انسان کی جائے نفرت دو مقام ہیں۔ مرزائی وضاحت کریں کہ وہ کون سی جگہ تھا۔ (لاحول ولاقوة الا باللہ)

مغالطہ:۲۔

بعض مرزائی جہلاء بحوالہ تفسیر کبیر مغالطہ دیتے ہیں کہ یہاں آیاتی سے مراد صرف قرآن ہے یعنی اب جن رسولوں کی آمد کا وعدہ دیا جا رہا ہے وہ سب غیر تشریعی ہونگے جنکا کام قرآن پڑھ پڑھ کر سنانا ہوگا۔ (تبلیغی پاکٹ بک ۴۵۹)

جواب:۔

واضح رہے کہ امام رازیؒ نے یہاں تین اقوال ذکر کئے ہیں

"فقِیلَ تِلْکَ الآیاتُ ھِیَ القرآن وقِیلَ الدلائلُ وقِیلَ الاحکامُ و الشرائعُ والاَوْلٰی دخولُ الکلِّ فیہ لاَنَّ جَمیعَ ھٰذہ الاشیاءِ الآیاتُ.

معلوم ہوا کہ امام رازیؒ نے قرآن کے ساتھ تخصیص نہیں کی یہ قادیانی دیانت داری کے دیوالیہ ہونے کی شہادت اور قادیانیوں کا نرا مغالطہ ہے اور بس۔ تفصیل کے لئے امام رازیؒ کی آیت سے متعلق مکمل تفسیر اخیر میں ملاحظہ فرمالیجئے:

مغالطہ ۳۔

دھوکہ باز مرزائی نے یہاں پر مضارع اور نون تاکید کی بحث میں الجھا کر بیضاوی کی ایک عبارت نقل کی ہے "اتیان الرسل امر جائز غیر واجب" اور ترجمہ یوں کیا کہ 'رسولوں کا آنا جائز ہے اگرچہ ضروری نہیں' اس سے معلوم ہوا کہ نبی کا آنا ممکن ہے۔

جواب:۔

مرزائی پادری اپنے مقصد کا جملہ نقل کرتے ہیں اور اسی کے آگے جملہ کماخلنہ اهل التعلیم کو چھوڑ دیتے ہیں جس سے صاحب بیضاوی کا مقصد اور مراد واضح ہوتا ہے۔ بہر کیف شہاب علی البیضاوی نے کیا خوب قادیانیوں پر چپت رسید کی ہے ملاحظہ ہو۔

ذکره بحرف الشرط. ارسال الرسل لهدایة البشر واقع ولیس بواجب عندنا وقالت الفلاسفة انه واجب علی الله لانه یجب علیه تعالیٰ ان یفعل الاصلح وهم یسمون اهل التعلیم ..... ولیس المراد بالرسل نبینا ﷺ وبنی آدم امته کما قیل فانه خلاف الظاهر (شهاب علی البیضاوی ص ۱۶۶)

کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس آیت میں ''رسل'' سے مراد حضور ﷺ اور ''بنی آدم'' سے مراد حضور ﷺ کی امت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ امر جائز غیر واجب سے صاحب بیضاوی فلاسفہ کا رد کر رہے ہیں جو رسولوں کا بھیجنا خدا تعالیٰ پر واجب قرار دیتے ہیں نہ کہ مرزا جیسے بد طینت کے لئے نبوت جاری کر رہے ہیں۔ اسی مرزائیت کو تو کہتے ہیں۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

بیضاوی شریف درسی کتاب ہے، اس کی کئی ایک شروحات ہیں۔ کیا مرزائی اپنے من گھڑت معنی ومطلب کی تائید میں ان کی کوئی ایک سطر پیش کرنے کی جرات کریں گے؟ ولن تفعلوا فاتقوا النار التی اعدت.....

کیا فرماتے ہیں مفسرین:

معارف القرآن۔ (ص ۵۵۲ ج ۳)

بیان القرآن:

(ہم نے عالم ارواح ہی میں کہہ دیا تھا) اے اولاد آدم کی اگر تمہارے پاس پیغمبر آویں جو تم ہی میں سے ہوں گے جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے سو (ان کے آنے پر) ے جو شخص (تم میں ان آیات کی تکذیب سے) پرہیز رکھے اور (اعمال کی) درستی کرے (مراد یہ کہ کامل اتباع کرے) سو ان لوگوں پر (آخرت میں بھی نہ کچھ اندیشہ (کی بات واقع ہونے والی) ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ (تم میں سے) ہمارے ان احکام کو جھوٹا بتا دیں گے اور ان (کے قبول کرنے) سے تکبر کریں گے وہ لوگ دوزخ (میں رہنے) والے ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔"

تفسیر ماجدی۔

ترجمہ۔ اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آئیں (جو) تم سے میرے احکام بیان کریں، سو جو کوئی تقوی اختیار کرے اور (اپنی) اصلاح کرے تو ان لوگوں پر نہ کوئی خوف واقع ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۴۷)۔

تفسیر:۔

(۴۷) (ایسے آدم زادوں کو اپنی اصلی میراث یعنی جنت حاصل کر لینا کچھ بھی دشوار نہیں) یبنی آدم۔ یہ ذکر ارواح کا ہے۔ یہ خطبہ انسان سے اس وقت ہوا تھا جب اس کی آفرینش ابھی عالم ناسوت میں ہوئی بھی نہ تھی اور ابھی وہ عالم ارواح ہی میں تھا۔ اِمّا۔ اِنْ شرطیہ ہے اور ما صلہ کا۔ ماصلة ای ان یاتکم (قرطبی) ان شرطیة ضمت الیهاما موکدة بمعنی الشرط (کشاف) ایتی۔ یعنی میرے احکام وہدایت۔ ای فرائضی واحکامی (قرطبی) جن علماء محققین کا مسلک یہ ہے کہ قیامت میں مومنین مطیعین کو کوئی خوف وغم نہ ہوگا وہ اسی آیت سے استشہاد کرتے ہیں (کبیر)۔

ترجمہ کنزالایمان۔

ترجمہ۔ اے آدم کی اولاد اگر تمہارے پاس تم میں کے رسول آئیں (۵۳) میری آیتیں پڑھتے تو جو پرہیزگاری کرے (۵۴) اور سنورے (۵۵) تو اس پر نہ کچھ خوف نہ کچھ غم۔

تفسیر:۔

(۵۳) مفسرین کے اس میں دو قول ہیں ایک تو یہ کہ رسل سے مراد تمام مرسلین مراد ہیں دوسرا یہ کہ سید عالم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں جو تمام خلق کی طرف رسول بنائے گئے ہیں اور صیغہ جمع تعظیم کے لئے ہے۔ (۵۴) ممنوعات سے بچے (۵۵) طاعات وعبادات بجالائے۔

تفسیر ثنائی۔

ترجمہ: "اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے میرے رسول آویں تو جو تم کو میرے احکام سنا دیں تو جو ایمان لاویں گے اور صالح بنیں گے ان پر نہ تو خوف ہوگا اور نہ غمزدہ ہونگے۔"

تفسیر:۔

میں (خدا) نے پہلے ہی سے حکم دے رکھا ہوا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے میرے رسول آویں جو تم کو میرے احکام سنا دیں۔ تو سنو! جو ایمان لاویں گے اور صالح بنیں گے انپر نہ تو خوف ہوگا اور نہ کسی نقصان اعمال سے رنجیدہ اور غمزدہ ہونگے۔

تفہیم القرآن۔ (ص ۲۵ ج ۲)

ترجمہ: اے بنی آدم، یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویہ کی اصلاح کرے گا اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ اور جو لوگ

ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہونگے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۴۸)۔

تفسیر:۔

(۴۸) یہ بات قرآن مجید میں ہر جگہ اس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم وحوا علیہما السلام کے جنت سے اتارے جانے کا ذکر آیا ہے (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ، رکوع ۴، طٰہٰ، رکوع ۷) لہذا یہاں بھی اس کو اسی موقع سے متعلق سمجھا جائیگا، یعنی نوع انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہوا تھا اسی وقت یہ بات صاف طور پر سمجھادی گئی تھی

(ملاحظہ ہو سورہ آل عمران حاشیہ)

جامع البیان: (ص ج۵)

يقول تعالىٰ ذكره معرفاً لخلقه ما أعدّ لحزبه وأهل طاعته والإيمان به وبرسوله،وما أعدّ لحزب الشيطان وأوليائه والكافرين به وبرسله. ﴿يَابَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾يقول:إن يجيئكم رسلي الذين أرسلهم إليكم بدعائكم إلىٰ طاعته والانتهاء إلي أمري ونهيي منكم، يعني من أنفسكم، ومن عشائركم وقبائلكم. ﴿ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ﴾يقول: يتلون عليكم آيات كتابي، ويعرّفونكم أدلتي، وأعلامي علىٰ صدق ما جاءكم به من عندي، وحقيقة ما دعوكم إليه من توحيدي.﴿فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ ﴾ يقول:فمن آمن منكم بما أتاه به رسلي مما قصّ عليه آياتي وصدّق واتقى الله، فخافه بالعمل بما أمره به والانتهاء عما نهاه عنه، على لسان رسوله ﴿واَصْلَحَ﴾يقول.وأصلح أعماله التي كان لها مفسداً قبل ذلک من معاصي الله بالتحوّب منها﴿ فَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾يقول: فلا خوف عليهم يوم القيامة من عقاب الله اذا وردوا عليه﴿ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾على ما فاتهم من دنياهم التي تركوها، وشهواتهم التي تجتنبوها، اتباعاً منهم لنهي الله عنها إذا عاينوا من كرامة الله ما عاينوا هنالک.

۱۱۴۱۲ــحدثني المثنى، قال: ثنا إسحاق، قال: ثنا هشام أبو عبد الله، قال:ثنا هياج، قال: ثنا عبدالرحمن بن زياد، عن أبي يسار السلمي، قال: إن الله جعل آدم وذريته في كفه فقال:﴿يَابَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ

يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾
ثم نظر إلى الرسل فقال: ﴿يا أيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحا إني بما تعملون عليم وإن هذه أمتكم أمة واحدة وأنا ربكم فاتقون﴾ ثم يتهم.

فإن قال قائل: ماجواب قوله: ﴿ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾ قيل: قد اختلف أهل العربية في ذلك، فقال بعضهم في ذلك: الجواب مضمر، يدلّ عليه ما ظهر من الكلام، وذلك قوله: ﴿ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ﴾ وذلك لأنه حين قال: ﴿فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ﴾ كانه قال: فاطيعوهم.

وقال آخرون منهم: الجواب: "فَمَنِ اتَّقٰى" لأن معناه، فمن اتقى منكم وأصلح قال: ويدلّ على أن ذلك كذلك، تبعيضه الكلام، فكان في التبعيض إكتفاء من ذكر "منكم" القول في تأويل قوله تعالى:

﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

يقول جل ثناؤه: وأما من كذب بأنباء رسلي التي أرسلتها إليه وجحد توحيدي وكفر بما جاء به رسلي واستكبر عن تصديق حججي وأدلتي، ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ يقول: هم في نار جهنم ماكثون، لا يخرجون منها أبداً.

تفسیر کشاف:

﴿إما يأتينكم﴾ هي "إن" الشرطية ضمت إليها "ما" مؤكدة لمعنى الشرط. ولذلك لزمت فعلها النون الثقيلة أو خفيفة. فإن قلت: فما جزاء هذا الشرط؟ قلت: الفاء وما بعده من الشرط والجزاء. والمعنى: فمن اتقى واصلح منكم، والذين كذبوا منكم. وقرئ. تأتينكم، بالتاء.

تفسیر معالم التنزیل: (ص۱۵۸، ج۲)

قوله تعالى: ﴿يا بني آدم إما يأتينكم رسل منكم﴾، أي: إن يأتكم، قيل: أراد جميع الرسل. وقال مقاتل: أراد بقوله: ﴿يابني آدم﴾ مشركي العرب وبالرسل محمداً ﷺ وحده، ﴿يقصون عليكم آياتي﴾، قال ابن عباس: فرائض وأحكامي، ﴿فمن اتقى وأصلح﴾، أي: اتقى الشرك

وأصلح عمله، وقيل: أخلص ما بينه وبين ربه ﴿فلاخوف عليهم﴾ إذا خاف الناس، ﴿ولاهم يحزنون﴾ أي إذا حزنوا.

تفسیر کبیر۔(ص۲۳۵ج۵)

اعلم أنه تعالى لما بين أحوال التكليف وبين أن لكل أحد أجلاً معيناً لايتقدم ولايتأخر بين أنهم بعد الموت كانوا مطيعين فلا خوف عليهم ولاحزن وأن كانوامتمردين وقعوا في أشد العذاب وقوله: ﴿إما يأتينكم﴾ هي إن الشرطية ضمت إليها ما مؤكدة لمعنى الشرط ولذلك لزمت فعلها النون الثقيلة وجزاء هذا الشرط هو الفاء وما بعده من الشرط والجزاء، وهو قوله: ﴿فمن اتقى وأصلح﴾وإن كان خطاباً للرسول عليه الصلاة والسلام وهو خاتم الأنبياء عليه وعليهم السلام لأنه تعالى أجرى الكلام على ما يقتضيه سنته في الأمم و إنما قال: ﴿منكم﴾ لأن كون الرسول منهم أقطع لعذرهم وأبين للحجة عليهم من جهات: أحدها : أن معرفتهم بأحواله وبطهارته تكون متقدمة. وثانيها : أن معرفتهم بما يليق بقدرته تكون متقدمة فلاجرم لايقع في المعجزات التي تظهر عليه شك وشبهة في أنهاحصلت بقدرة الله تعالى لابقدرته فلهذا السبب قال تعالى: ﴿ولو جعلناه ملكاً لجعلناه رجلا﴾ [الأنعام:۹]. وثالثها : ما يحصل من الألفة وسكون القلب إلى أبناء الجنس، بخلاف ما لايكون من الجنس، فإنه لايحصل معه الألفة.

وأما قوله: ﴿يقصون عليكم آياتي﴾ فقيل تلك الآيات هي القرآن وقيل الدلائل، وقيل الأحكام والشرائع والأولى دخول الكل فيه، لأن جميع هذه الأشياء آيات الله تعالى لأن الرسل إذا جاؤا فلا بد وأن يذكروا جميع هذه الأقسام، ثم قسم تعالى حال الأمة فقال: ﴿فمن اتقى وأصلح﴾ وجمع هاتين الحالتين مما يوجب الثواب لأن المتقي هو الذي يتقي كل ما نهى الله تعالى عنه، ودخل في قوله: ﴿وأصلح﴾ أن أتى بكل ما أمر به.

ثم قال تعالى في صفته: ﴿فلا خوف عليهم﴾ أي بسبب الأحوال المستقبلة ﴿ولاهم يحزنون﴾ اي بسبب الأحوال الماضية لأن الإنسان، إذا جوز وصول المضرة إليه في الزمان المستقبل خاف وإذا تفكر فعلم

انه وصل إليه بعض ما لاينبغي في الزمان الماضي، حصل الحزن في قلبه، لهذا السبب والأولى في نفي الحزن أن يكون المراد أن لايحزن على ما فاته في الدنيا، لأن حزنه على عقاب الآخرة يجب أن يرتفع بما حصل له من زوال الخوف، فيكون كالمعاد و حمله على الفائدة الزائدة أولى فبين تعالى أن حاله في الآخرة تفارق حاله في الدنيا، فإنه في الآخرة لايحصل في قلبه خوف ولاحزن ألبتة، واختلف العلماء في أن المؤمنين من أهل الطاعات هل يلحقهم خوف، وحزن عند أهوال يوم القيامة فذهب بعضهم إلى أنه لايلحقهم ذلك، والدليل عليه هذه الآيه، وأيضاً قوله تعالى: ﴿لايحزنهم الفزع الأكبر﴾ [الأنبياء:۱۰۳] وذهب بعضهم إلى ان يلحقهم ذلك الفزع لقوله تعالى: ﴿يوم ترونها تذهل كل مرضعة عما أرضعت وتضع كل ذات حمل حملها وترى الناس سكارى وماهم بسكارى﴾ [الحج:۲] أي من شدة الخوف.

وأجاب هؤلاؤ عن هذه الآية : بأن معناه أن أمرهم يؤل إلى الامن والسرور، كقول الطبيب للمريض: لاباس عليك، أي أمرك يؤل إلي العافية والسلامة، وإن كان في الوقت في بأس من علته، ثم بين تعالى أن الذين كذبوا بهذه الآيات التي يجيء بها الرسل واستكبروا أن أنفوا من قبولها وتمردوا عن إلتزامها فاولئك اصحاب النار هم فيها خالدون وقد تمسك اصحابنا بهذه الآية على أن الفاسق من أهل الصلاة، لا يبقي مخلداً في النار، لأنه تعالىٰ بين أن المكذبين بآيات الله والمستكبرين عن قبولها، هم الذين يبقون مخلدين في النار، وكلمة ﴿هم﴾ تفيد الحصر، فذالك يقتضي أن من لا يكون موصوفاً بذلك التكذيب والإستكبار، لا يبقى مخلداً في النار. والله اعلم.

تفسیر ابن کثیر: (۲۱۸۵ج۲)

ثم أنذر تعالى بني آدم أنه سيبعث إليهم رسلاً يقصون عليهم آياته وبشر و حذر، فقال ﴿فمن اتقى واصلح﴾ اي ترك المحرمات وفعل الطاعات ﴿فلاخوف عليهم ولاهم يحزنون والذين كذبوا بآياتنا واستكبروا عنها﴾ اي كذبت بها قلوبهم واستكبروا عن العمل بها ﴿أولئك اصحاب النار هم فيها خالدون﴾ اي ماكثون فيها مكثاً مخلداً.

آیت:(۹)

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفاً وَّطَمَعاً اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

(اعراف:۵۵،۵۶)

ترجمہ: پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔ اس کو خوش نہیں آتے حد سے بڑھنے والے۔ اور مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد۔ اور پکارو اس کو ڈر اور توقع سے۔ بیشک اللہ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں کے۔

خلاصہ:۔

پہلی آیت میں ہر حاجت کے لئے خدا کو پکارنے کا طریقہ بتایا گیا۔ اور دوسری آیت میں خالق ومخلوق دونوں کے حقوق کی رعایت سکھلائی گئی ہے۔ یعنی جب بعثت انبیاء کے ذریعہ دینی اور دنیوی ہر اعتبار سے زمین کی اصلاح کردی گئی تو اب اس میں خدا کی مرضیات سے ہٹ کر اور کوئی راستہ نہ اپناؤ جو فساد کا موجب ہو۔ اور خوف ورجا کے ساتھ اس کی عبادت میں مشغول رہو، نہ اس کی رحمت سے مایوس ہو نہ اس کے عذاب سے بے فکر ہو کر گناہوں پر دلیر ہو جاؤ۔

قادیانی استدلال:

”اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ“ نبوت بھی ایک رحمت ہے وہ بھی نیکوں کو ملنی چاہیے۔

جواب نمبر ا

اس آیت میں جملہ رحمتیں مراد نہیں اور نہ ہر رحمت ہر ایک کیلئے ضروری ہے۔ ورنہ دولت، سلطنت، بارش وغیرہ سب رحمت ہیں جبکہ اکثر محسنین خصوصاً انبیاء علیہم السلام دولت اور سلطنت وغیرہ کی رحمتوں سے خالی تھے۔ تو کیا وہ نبی نہ تھے؟ معلوم ہوا

کہ بہت ساری رحمتوں کی طرح نبوت بھی ایک رحمت ہے جو باری تعالیٰ کی مرضی پر ہے۔ جب چاہیں اور جس کو چاہیں دیں اور جس پر جس نعمت کی چاہیں بندش فرمادیں۔ قادیانیوں کا استدلال تو خوب ہے لیکن

خوش نما الفاظ کا دل پر اثر ہوتا نہیں
جبکہ لفظوں کے پس منظر میں سچائی نہ ہو

۲- وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء:۱۰۷) اس امت کے لئے دنیا میں سب سے بڑی رحمت حضور پاک ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ جو شخص اب آنحضرت ﷺ کے بعد کسی اور رحمت، نبوت کو تلاش کرتا ہے یا جاری کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اللہ کی سب سے بڑی رحمت محمد عربی ﷺ سے منہ موڑتا ہے اس سے بڑھ کر بدنصیب اور کون ہوگا؟

حضور ﷺ نے فرمایا ہے "انا حظکم من الانبیاء و انتم حظی من الامم" نبیوں میں سے میں محمدؐ، تمہارے حصہ میں آیا ہوں اور امتوں میں سے تم میرے حصہ میں آئے ہو۔ معلوم ہوا کہ جو شخص کسی اور نبی کی تلاش میں ہے وہ حضور ﷺ کی امت میں نہیں رہے گا گویا وہ اللہ کی سب سے بڑی رحمت اور نعمت سے محروم ہو جائے گا اور جبکہ مرزا نے خود ہی لکھا ہے "فلا حاجة لنا الی نبی بعد محمد" (حمامۃ البشریٰ خ ص ۲۴۴ ج ۷) تو مرزائیوں کو نیا نبی اور وہ بھی مرزا جیسا کوڑھ مغز نبی ڈھونڈنے کی ضرورت کیا ہے!۔

۳- حضور ﷺ کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ اپنی وحی کی اتباع کا پابند ہوگا اور حضور ﷺ کی اتباع سے محروم ہو کر خدا کی سب سے بڑی رحمت سے محروم ہو جائے گا۔ اس محروم القسمت بدبخت کے لئے جو حضور ﷺ کی اتباع سے منہ موڑتا ہے مرزائی لوگ قرآن میں تحریف کر کے اس کی نبوت کے لئے دلائل تلاش کرتے ہیں۔ فیا للعجب!۔

۴- پھر جناب اگر نبوت رحمت ہے تو سب سے بڑی رحمت نبوت تشریعیہ ہے۔ تو مرزائی اس کو بند کیوں مانتے ہیں؟

۵- آیت "اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ" کے ساتھ ملحقہ اگلی آیت "هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ" (اعراف:۵۷) میں بارش کو رحمت کہا گیا ہے۔ مگر پوری دنیا کا اتفاق ہے کہ اگر بارش والی رحمت ضرورت سے بڑھ جائے تو رحمت کے بجائے زحمت یعنی عذاب بن جاتی ہے۔ لیجئے جناب! اس آیت شریفہ سے ہی قادیانی لغویات کا بھرپور ابطال نکل آیا۔ بارش رحمت ہے مگر جو ضرورت سے زیادہ بارش مانگے وہ عذاب خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کی نبوت رحمت ہے اس رحمت کے ہوتے ہوئے اگر اور نبوت کی رحمت کو کوئی مانگتا ہے تو وہ بھی عذاب خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔

کشادہ ذہن ودل وگوش کی ضرورت ہے
یہ عقائد ہیں یہاں ہوش کی ضرورت ہے

کیا فرماتے ہیں مفسرین:۔

معارف القرآن۔ (ص ۵۷۵ ج ۳)

بیان القرآن:۔

تم لوگ (ہر حالت میں اور ہر حاجت میں) اپنے پروردگار سے دعاء کیا کرو تذلل ظاہر کرکے بھی اور چپکے چپکے بھی (البتہ یہ بات) واقعی (ہے کہ) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند جو (دعا میں) حد (ادب) سے نکل جاویں (مثلاً محالات عقلیہ یا محرمات شرعیہ کی دعاء مانگنے لگیں) اور دنیا میں بعد اس کے کہ (تعلیم توحید اور بعثت انبیاء کے ذریعہ) اس کی اصلاح اور درستگی کردی گئی ہے، فساد مت پھیلاؤ۔"

معارف و مسائل:

"دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ اس میں دو لفظ متضاد اور متقابل آئے ہیں، صلاح اور فساد، صلاح کے معنی درستی اور فساد کے معنی خرابی کے آتے ہیں، امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ فساد کہتے ہیں کسی چیز کے اعتدال سے نکل جانے کو، خواہ یہ نکلنا تھوڑا سا ہو یا زیادہ، اور ہر فساد میں کمی بیشی کا مدار اسی اعتدال سے خروج پر ہے، جس قدر خروج بڑھے گا فساد بڑھے گا، افساد کے معنی خرابی پیدا کرنا اور اصلاح کے معنی درستی کرنا ہے اس لئے ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا، کے معنی یہ ہوئے کہ زمین میں خرابی نہ پیدا کرو بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی درستی فرما دی ہے۔"

امام راغب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کی اصلاح کرنا اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس کو اول ہی ٹھیک ٹھیک اور درست پیدا فرمایا، جیسے واصلح بالھم، دوسرے یہ کہ اس میں جو فساد آ گیا تھا اس کو دور کردیا، یصلح لکم اعمالکم۔ تیسرے یہ کہ اس کو صلاح کا حکم دیا جائے، اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے جب زمین کی اصلاح درستی فرمادی تو اس کے بعد تم اس میں فساد اور خرابی نہ ڈالو، اس میں زمین کی درستی کرنے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک ظاہری درستی کہ زمین کو کھیتی اور درخت اگانے کے قابل بنایا، اس پر بادلوں سے پانی برسا کر زمین سے پھل پھول نکالے، انسان اور دوسرے جانداروں کے لئے زمین سے ہر قسم کی ضروریات زندگی اور آسائش کے سامان پیدا فرمائے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زمین کی باطنی اور معنوی اصلاح فرمائی، اس طرح کہ زمین پر اپنے رسول، اپنی کتابیں اور ہدایات بھیج کر اس کو کفر و شرک اور گمراہی سے پاک کیا، اور ہو سکتا ہے یہ دونوں مفہوم یعنی ظاہری اور باطنی ہر طرح کی اصلاح مراد ہو، تو اب آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ظاہری اور باطنی طور پر درست فرمادیا ہے، اب تم اس میں اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے ذریعے فساد نہ مچاؤ، اور خرابی نہ پیدا کرو۔

زمین کی درستی اور خرابی کیا ہے جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں اسی طرح فساد کی بھی دو قسمیں ہیں، زمین کی ظاہری اصلاح تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا جسم بنایا ہے کہ نہ پانی کی طرح نرم ہے جس پر قرار نہ ہو سکے، اور نہ پتھر لوہے کی طرح سخت ہے جس کو کھودا نہ جا سکے، ایک درمیانی حالت میں رکھا گیا ہے، تا کہ انسان اس کو نرم کر کے اس میں کھیتی اور درخت اور پھل پھول اگا سکے، اور کھود کر اس میں کنویں اور خندقیں، نہریں بنا سکے، مکان کی بنیادیں مستحکم کر سکیں، پھر زمین کے اندر اور باہر ایسے سامان پیدا فرمادیئے جن سے زمین کی آبادی ہو، اس میں سبزی، اور درخت اور پھل پھول اگا سکیں، باہر سے ہوا، روشنی، گرمی، سردی پیدا کی، اور پھر بادلوں کے ذریعے اس پر پانی برسایا جس سے درخت پیدا ہو سکیں مختلف ستاروں اور سیاروں کی سرگرم کرنیں ان پر ڈالی گئیں، جن سے پھولوں اور پھلوں میں رنگ اور رس بھرے گئے، انسان کو فہم و عقل عطا کی گئی، جس کے ذریعہ زمین سے نکلنے والے خام مواد لکڑی، لوہا، تانبہ، پیتل، ایلومینیم وغیرہ کے جوڑ توڑ لگا کر مصنوعات کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی، یہ سب زمین کی اصلاح ظاہری ہے جو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے فرمائی۔

اور اصلاح باطنی اور روحانی کا مدار ذکر اللہ، تعلق مع اللہ اور اس کی اطاعت پر ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اول تو ہر انسان کے قلب میں ایک مادہ اور جذبہ خدا کی اطاعت اور یاد کا رکھ دیا ہے **فالھمھا فجورھا وتقوھا** اور انسان گردوپیش کے ہر ذرے ذرے میں اپنی قدرت کاملہ اور صنعت عجیبہ کے ایسے مظاہر رکھے کہ ان کو دیکھ کر معمولی فہم وادراک رکھنے والا بھی بول اٹھے کہ فتبارک اللہ احسن الخالقین، اس کے علاوہ اپنے رسول بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، جن کے ذریعہ مخلوق کا رشتہ خالق کے ساتھ جوڑنے کا پورا انتظام فرمایا۔

اس طرح گویا زمین کی مکمل اصلاح ظاہری اور باطنی ہوگئی، اب حکم یہ ہے کہ ہم نے اس زمین کو درست کر دیا ہے تم اس کو خراب نہ کرو۔

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی بیان کی گئی ہیں اسی طرح اس کے بالمقابل فساد کی بھی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں، اور اس ارشاد ربانی کے ذریعہ دونوں ہی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اگرچہ قرآن اور رسول کریم ﷺ کا اصل وظیفہ اور فرض منصبی اصلاح باطنی ہے، اور اس کے بالمقابل فساد باطنی سے روکنا ہے، لیکن اس دنیا میں ظاہر اور باطن کے صلاح وفساد میں ایک ایسا ربط ہے کہ ایک کا فساد دوسرے کے فساد کا موجب بن جاتا ہے، اس لئے شریعت قرآن نے جس طرح باطنی فساد کے دروازے بند کئے ہیں اسی طرح ظاہری فساد کو بھی منع فرمایا، چوری ڈاکہ، قتل اور بے حیائی کے تمام طریقے دنیا میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا فساد پیدا کرتے ہیں، اس لئے ان چیزوں پر خصوصیت سے پابندیاں اور سخت سزائیں مقرر فرمائی، اور عام گناہوں اور جرائم کو بھی ممنوع قرار دیا، کیونکہ ہر جرم وگناہ کہیں ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے کہیں باطنی فساد کا، اور غور سے دیکھا جائے تو ہر ظاہری فساد باطنی فساد کا سبب بنتا ہے، اور ہر باطنی فساد ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے،

ظاہری فساد کا باطنی کے لئے مستلزم ہونا تو اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اطاعت احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی ہے، اور خدا تعالیٰ نافرمانی ہی کا دوسرا نام فساد باطنی ہے، البتہ فساد

باطنی کس طرح فسادظاہری کا سبب بنتا ہے، اس کا پہچاننا کسی قدر غور وفکر کا محتاج ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ سارا جہان اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز سب مالک الملک والملکوت کی بنائی ہوئی اور اسی کے تابع فرمان ہے، جب تک انسان اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان رہتا ہے تو یہ سب چیزیں انسان کی صحیح صحیح خدمتگار رہتی ہیں، اور جب انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے لگے تو دنیا کی ساری چیزیں در پردہ انسان کی نافرمان ہو جاتی ہیں، جس کو بظاہر انسان اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا، لیکن ان چیزوں کے آثار وخواص اور نتائج وفوائد میں غور کرنے سے بدیہی طور پر اس کا ثبوت مل جاتا ہے۔

ظاہر میں تو دنیا کی ساری چیزیں انسان کے استعمال میں رہتی ہیں، پانی اس کے حلق میں اترے تو پیاس بجھانے سے انکار نہیں کرتا، کھانا اس کی بھوک رفع کرنے سے نہیں رکتا، لباس اور مکان اس کی سردی اور گرمی کی آسائشوں کو مہیا کرنے سے انکار نہیں کرتا۔

لیکن عواقب اور نتائج کو دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اپنا کام پورا نہیں کر رہی، کیونکہ اصل مقصد ان تمام چیزوں اور استعمال کا یہ ہے کہ انسان کو آرام وراحت میسر آئے، اس کی پریشانی اور تکالیف دور ہو اور بیماریوں کو شفاء ہو۔

اب دنیا کے حالات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ آج کل سامان راحت اور سامان شفاء کی زائد از قیاس فراوانی کے باوجود انسانوں کو اکثریت انتہائی پریشانیوں اور بیماریوں کا شکار ہے، نئے نئے امراض، نئی نئی مصیبتیں برس رہی ہیں، کوئی بڑے سے بڑا انسان اپنی جگہ مطمئن اور آسودہ نہیں ہے، بلکہ جوں جوں یہ سامان بڑھتے جاتے ہیں اسی انداز سے مصائب اور آفات وامراض اور پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

آج کا انسان جس کو برق وبھاپ اور دوسری رنگینیوں نے مسحور بنا رکھا ہے، ذرا ان چیزوں سے بلند ہو کر سوچے تو اس کو معلوم ہوگا کہ ہماری ساری کوششیں اور ساری مصنوعات اور ایجادات ہمارے اصل مقصد یعنی اطمینان وراحت کے حاصل کرنے میں فیل اور ناکام ہیں، اس کی وجہ بجز اس معنوی اور باطنی سبب کے نہیں ہے کہ

ہم نے اپنے رب اور مالک کی نافرمانی اختیار کی تو اس کی مخلوقات نے معنوی طور پر ہم سے نافرمانی شروع کردی،

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

کہ ہمارے لئے حقیقی آرام وراحت مہیا نہیں کرتی، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

با من و تو مردہ باحق زندہ اند

یعنی دنیا کی یہ سب چیزیں اگرچہ ظاہر میں بے جان و بے شعور نظر آتی ہیں، مگر حقیقت میں اتنا ادراک ان میں بھی ہے کہ مالک کے تابع فرما کام کرتی ہیں،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب غور سے دیکھا جائے تو ہر گناہ اور خدا تعالیٰ سے غفلت اور اس کی ہر نافرمانی دنیا میں نہ صرف باطنی فساد پیدا کرتی ہے بلکہ ظاہری فساد بھی اس کا لازمی ثمرہ ہوتا ہے، اسی کو مولانا رومی نے فرمایا ہے،

ابر نابید از پے منع زکوٰۃ وز زنا افتد وبا اندر جہالت

اور یہ کوئی شاعرانہ تخیل نہیں، بلکہ وہ حقیقت ہے جس پر قرآن وحدیث ناطق ہے، لیکن سزا کا ہلکا سا نمونہ اس دنیا میں امراض، وباؤں، طوفانوں، سیلابوں کی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے

اس لئے **لاتفسدوا فی الأرض بعد اصلاحھا،** کے مفہوم میں جیسے وہ جرائم اور گناہ داخل ہیں جن سے ظاہر طور پر دنیا میں فساد پیدا ہوتا ہے اسی طرح ہر نافرمانی اور خدا تعالیٰ سے غفلت ومعصیت بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے آیت مذکورہ میں اس کے بعد فرمایا **ادعوہ خوفاً وطمعاً** یعنی اللہ تعالیٰ کو پکارو خوف اور امید کے ساتھ، یعنی اسطرح کہ ایک طرف دعاء کے ناقابل قبول ہونے کا خوف لگا ہوا ہو اور دوسری طرف اس کی رحمت سے پوری امید بھی لگی ہوئی ہو، اور امید وبیم طریق استقامت میں روح انسانی کے دو بازو ہیں، جن سے وہ پرواز کرتی اور درجات عالیہ حاصل کرتی ہے،

اور ظاہر اس عبارت سے یہ ہے کہ امید وبیم دونوں مساوی درجہ میں ہونا چاہئے، اور بعض

علماء نے فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ حیات وتندرستی کے زمانہ میں خوف کو غالب رکھے تاکہ اطاعت میں کوتاہی نہ ہو، اور جب موت کا وقت قریب آئے تو امید کو غالب رکھے، کیونکہ اب عمل کی طاقت رخصت ہو چکی ہے، امید رحمت ہی اس کا عمل رہ گیا ہے، (بحر محیط)

اور بعض محققین نے فرمایا کہ اصل مقصد دین کے صحیح راستہ پر قائم رہنا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مداومت کرنا ہے، اور مزاج اور طبائع انسانوں کے مختلف ہوتے ہیں، کسی کو غلبۂ خوف سے یہ مقام استقامت اور دوام طاعت حاصل ہوتا ہے، کسی کو غلبۂ محبت ورجا سے، سو جس کو جس حالت سے اس مقصد میں مدد ملے اس کو حاصل کرنے کی فکر کرے،

خلاصہ یہ ہے کہ دعاء کے دو آداب اس سے پہلی آیت میں بتلائے گئے، ایک عاجزی تضرع کے ساتھ ہونا، دوسرے خفیہ وآہستہ ہونا، یہ دونوں صفتیں انسان کے ظاہر جسد سے متعلق ہیں، کیونکہ تضرع سے مراد یہ ہے کہ اپنی ہیئت بوقت دعاء عاجزانہ، فقیرانہ بنالے، متکبرانہ یا بے نیازانہ نہ ہو، اور خفیہ ہونے کا تعلق بھی منھ اور زبان سے ہے،

اس آیت میں دعاء کے لئے دو آداب باطنی اور بتلائے گئے، جن کا تعلق انسان کے دل سے ہے وہ یہ کہ دعاء کرنے والے کے دل میں اس کا خطرہ بھی ہونا چاہئے کہ شاید میری دعاء قبول نہ ہو، اور امید بھی ہونی چاہئے کہ میری دعاء قبول ہو سکتی ہے، کیونکہ اپنی خطاؤں اور گناہوں سے بے فکر ہو جانا بھی ایمان کے خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے مایوس ہو جانا بھی کفر ہے، قبولیت دعاء کی جب ہی توقع کی جا سکتی ہے جب کہ ان دونوں حالتوں کے درمیان درمیان رہے،

پھر آخر آیت میں فرمایا۔ اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ "یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے نیک عمل کرنے والوں سے" اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگرچہ بوقت دعا خوف اور امید دونوں ہی حالتیں ہونی چاہئیں۔ لیکن ان دونوں حالتوں میں سے امید ہی جانب راجح ہے۔ کیونکہ رب العٰلمین اور رحیم الرحماء کے جود واحسان میں نہ کوئی کمی ہے نہ بخل، وہ برے سے برے انسان بلکہ شیطان کی بھی دعا قبول

کرسکتا ہے ہاں اگر عدم قبولیت کا کوئی خطرہ ہوسکتا ہے تو وہ اپنی بداعمالی اور گناہوں کی نحوست سے ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہونے کے لئے محسن یعنی نیک عمل ہونا درکار ہے۔

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بعض آدمی لمبے لمبے سفر کرتے ہیں اور اپنی ہیئت فقیرانہ بناتے ہیں اور اللہ کے سامنے دعاء کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں مگر ان کا کھانا بھی حرام ہے پینا بھی حرام اور لباس بھی حرام کا ہے سو ایسے دی کی دعا کہاں قبول ہوسکتی ہے (مسلم ترمذی عن ابی ہریرۃ)

اور ایک حداث میں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بندہ کی دعا اس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے اور جلد بازی نہ کرے صحابہ کرام نے عرضکیا جلد بازی کا کیا مطلب ہے آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ یوں خیال کر بیٹھے کہ میں اتنے عرصے سے دعا مانگ رہا ہوں اب تک قبول نہیں ہوئی یہاں تک کہ مایوس ہوکر دعاء چھوڑ دے۔ (مسلم ترمذی)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعاء مانگو تو اس حالت میں مانگو کہ تمہیں اس کے قبول ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

مراد یہ ہیکہ رحمت خداوندی کو سامنے رکھ کر دل کو اس پر جماؤ کہ میری دعا ضرور قبول ہوگی یہ اس کے منافی نہیں کہ اپنے گناہوں کی شامت کے سبب یہ خطرہ بھی محسوس کرے کہ شاید میرے گناہ دعاء کی قبولیت میں آڑے آجائیں۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی نبینا وسلم

تفسیر ماجدی۔

ترجمہ: بیشک اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے بہت نزدیک ہے۔ ۸۷

تفسیر:۔

(سو تمہیں اجر ہی ملنا یقینی نہیں ہے اس کا جلد ملنا بھی یقینی ہے) ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ کائنات کی اصلاح و درستی قانون اسلام کے قبول کرنے اور اس

پر عمل کرنے ہی سے ہوتی ہے اور اس مکمل دستور العمل سے انکار ہی پہلے فساد عقائد اور پھر فساد اعمال، فساد اخلاق، جرائم و معاصی، قتل و خون ریزی ہر قسم کے فسادات کا باعث ہوتا ہے۔ وادعوہ خوفاً و طمعاً۔ خوف تو اس لحاظ سے کہ شرائط قبول دعا میں سے کوئی چیز چھوٹ نہ گئی ہو اور آرزو اس کی کہ کوئی شرط چھوٹنے نہ پائی ہو۔

ترجمہ کنز الایمان۔

ترجمہ: اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ (۱۰۱) اس کے سنورنے کے بعد (۱۰۲) اور اس سے دعا کرو ڈرتے اور طمع کرتے بیشک اللہ کی رحمت نیکوں سے قریب ہے"۔

تفسیر:۔

(۱۰۱) کفر و معصیت و ظلم کر کے (۱۰۲) انبیاء کے تشریف لانے حق کی دعوت فرمانے احکام بیان کرنے عدل قائم فرمانے کے بعد"

تفسیر ثنائی۔

ترجمہ: اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے بہت ہی قریب ہے۔

تفسیر:۔

کیونکہ جو لوگ اسے ہی پکارتے ہیں اللہ کی رحمت ان نیکوکاروں کے بہت ہی قریب ہے۔ کیا تمہیں اتنا بھی شعور نہیں کہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو۔

تفہیم القرآن:۔ (ص ۳۸ ج ۲)

ترجمہ: اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے ۴۴ اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ ۴۵ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

تفسیر:۔

۲۴۴ ''زمین میں فساد برپا نہ کرو'' یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کرو۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی بیشمار صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی متنبہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں جس پر صلاح عارض ہوئی ہو بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوتا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بدنظمی سے نہیں ہوئی ہے جس کو دور کرنے کے لئے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسان کی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے اور نظام حیات کو از سر نو درست کر دینے کے لئے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے اور انھوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا نظام جس صلاح پر قائم کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔

اس معاملہ میں قرآن کا نقطہ نظر ان لوگوں کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے جنھوں نے ارتقاء کا ایک غلط تصور لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ اور بنتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لئے بھیجتا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔ (سورہ بقرہ، حاشیہ نمبر ۴۳۰)

۲۵؎۔ اس فقرہ سے واضح ہو گیا کہ او پر کے فقرہ میں جس چیز کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل یہی ہے کہ انسان خدا کے بجائے کسی اور کو اپنا ولی اور سرپرست کارساز اور کارفرما قرار دے کر مدد کے لئے پکارے۔ اور اصلاح اس کے سوا کسی دوسری چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان کی اس پکار کا مرجع پھر سے محض اللہ کی ذات ہو جائے۔

خوف اور طمع کے ساتھ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں خوف بھی ہو تو اللہ سے ہو اور تمہاری امیدیں بھی اگر کسی سے وابستہ ہوں تو صرف اللہ سے ہوں۔ اللہ کو پکارو تو اس احساس کے ساتھ پکارو کہ تمہاری قسمت بالکلیہ اس کی نظر عنایت پر منحصر ہے۔ فلاح وسعادت کو پہنچ سکتے ہو تو صرف اس کی مدد اور رہنمائی سے، ورنہ جہاں تم اس کی اعانت سے محروم ہوئے پھر تمہارے لئے تباہی ونامرادی کے سوا دوسرا انجام نہیں ہے۔"

جامع البیان۔

يقول تعالىٰ ذكره: ادعوا أيها الناس ربكم وحده، فأخلصوا له الدعاء دون ما تدعون من دونه من الآلهة والأصنام. ﴿تَضَرُّعًا﴾ يقول: تذللاً واستكانة لطاعته. ﴿وَخُفْيَةً﴾ يقول: بخشوع قلوبكم وصحة اليقين منكم بوحدانيته فيما بينكم بينه، لا جهاراً مراءاة، وقلوبكم غير موقنة بوحدانيته وربوبيته، فعل لأهل النفاق والخداع لله ولرسوله. كما:

۱۴۲۶۸ ــ حدثني المثنى، قال: ثنا سويد بن نصر، قال: أخبرنا ابن المبارك، عن المبارك بن فضالة، عن الحسن، قال: إن كان الرجل لقد جمع القرآن وما يشعر جاره، وإن كان الرجل فقد فقه الفقه الكثير وما يشعر به الناس، وإن كان الرجل ليصلي الصلاة الطويلة في بيته وعنده الزوّار وما يشعرون به. ولقد ادركنا أقواماً كان على الأرض من عمل يقدرون على أن يعملوه في السر فيكون علانية أبداً. ولقد كان المسلمون يجتهدون في الدعاء وما يسمع لهم صوت إن كان إلا همساً بينهم وبين ربهم؛ وذلك أن الله يقول: ﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ وذلك أن الله ذكر عبداً صالحاً، فرضي فعله فقال: ﴿إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا﴾

١١٣٦٩ –حدثنا ابن حميد، قال: ثنا جرير،عن عاصم الأحول، عن أبي عثمان النهدي، عن أبي موسى، قال: كان النبي ﷺ في غزاة، فأشرفوا على واد يكبرون ويهللون ويرفعون أصواتهم،فقال:"أيها الناس اربعوا على أنفسكم، إنكم لا تدعون أصم ولا غائباً إنكم تدعون سميعاً قريباً معكم"

١١٣٧٠ –حدثنا القاسم، قال: ثنا الحسين، قال: ثني حجاج، عن ابن جريج، عن عطاء الخراساني، عن ابن عباس، قوله:﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾قال: السر.

وأما قوله: ﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ فإن معناه: إن ربكم لا يحب من اعتدى فتجاوز حدّه الذي حدّه لعباده في دعائه ومسألته ربه، ورفعه صوته فوق الحد الذي حدّ لهم في دعائهم إياه ومسألتهم وفي غير ذلك من الأمور. كما:

١١٣٧١ –حدثني يعقوب ابن ابراهيم، قال: ثنا معتمر بن سلمان، قال: أنبأنا إسماعيل بن حماد بن أبي سلمان عن عباد بن عباد،عن علقمة، عن أبي مجلز:﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾قال: لا يسأل منازل الأنبياء عليهم السلام.

١١٣٧٢ –حدثني القاسم، قال: ثنا الحسين، قال : ثني حجاج، عن ابن جريج، عن عطاء الخراساني، عن ابن عباس:﴿إنه لا يحب المعتدين﴾ في الدعاء ولا في غيره. قال ابن جريج : إن من الدعاء اعتداء يكره رفع الصوت والنداء والصياح بالدعاء، ويؤمر بالتضرّع والاستكانة. القول في تأويل قوله تعالى:

﴿ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ يعني تعالى ذكره بقوله:﴿ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا﴾ لا تشركو بالله في الأرض ولا تعصوه فيها ؛ وذلك هو الفساد فيها. وقد ذكرنا الرواية في ذلك فيما مضى وبينا معناه بشواهد.﴿بعد إصلاحها﴾يقول: بعد إصلاح الله إياه لأل طاعته بابتعاثه فيهم الرسل دعاة إلى الحق،وإيضاحه حججه لهم،﴿وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا﴾ يقول : وأخلصوا له الدعاء والعمل، ولا تشركوا في عملكم له شيئاً غيره من الآلهة والأصنام وغير ذلك، وليكن ما يكون منكم في ذلك خوفاً من عقابه وطمعاً في ثوابه ؛ وإن من كان دعاؤه إياه على غير ذلك فهو

بالآخرة من المكذبين، لأن من لم يخف عقاب الله ولم يرج ثوابه لم يبال ماركب من أمريسخطه الله ولايرضاه.﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ يقول تعالى ذكره: إن ثواب الله الذي وعد المحسنين على إحسانهم في الدنيا قريب منهم. وذلك هو رحمته! لأنه ليس بينهم وبين ان يصيروا إلى ذلك من رحمته وما أعد لهم من كرامته، إلا أن تفارق أرواحهم أجسادهم ؛ ولذلك من المعنى ذكر قوله:﴿قريبٌ﴾وهو من خبر الرحمة والرحمة مؤنثة، لأنه أريد به القرب في الوقت لا في النسب والأوقات بذلك المعنى، إذا رفعت أخباراً للأسماء أجرتها العرب مجرى الحال فوحدتها مع الواحد والإثنين والجمع وذكّرتها مع المؤنث، فقالوا : كرامة الله بعيد من فلان، وهي قريب من فلان، كمايقولون : هند قريب منا، والهند ان منا قريب، والهندات منا قريب، لأن معنى ذلك : هي في مكان قريب منا، فإذا حذفوا المكان وجعلوا القريب خلفاً منه، ذكروه ووحدوه في الجمع، كما كان المكان مذكرا وموحدا في الجمع . وأما إذا أنثوه أخرجوه مثنى مع الإثنين ومجموعاً مع الجميع فقالوا : هي قريبة منا، وهما منا قريبتان،.

الكشاف:

﴿تَضَرُّعاًوَّخُفْيَةً﴾ نصب على الحال، أي ذو تضرع وخفية . و كذالك خوفاً وطمعاً. والتضرع تفعل من الضراعة وهو الذل، أي تذللاً وتملقا . وقرئ وخفيه وعن الحسن رضى الله عنه : إن الله يعلم قلب التقي والدعاء الخفي، إن كان الرجل لقد جمع القرآن وما يشعر جاره، وإن كان الرجل لقد فقه الفقه الكثير ولا يشعر به الناس، وإن كان الرجل ليصلي الصلاة الطويلة في بيته وعنده الزوّار وما يشعرون به . ولقد ادركنا أقواماً كان على الأرض من عمل يقدرون على أن يعملوه في السر فيكون علانية أبداً . ولقدكان المسلمون يجتهدون في الدعاء وما يسمع لهم صوت، إن كان إلا همسابينهم وبين ربهم . وذلك أن الله تعالى يقول:﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً﴾وقد اثنى على زكريا. فقال : ﴿إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيّاً﴾بين دعوة السرور ودعوة العلانية سبعون ضعفاً.

﴿إنه لايحب المعتدين﴾أي المجاوزون ما أمروا به في كل شيء من الدعاء وغيره.وعن ابن جريج : هو رفع الصوت بالدعاء .وعنه الصياح في الدعاء مكروه وبدعة . وقيل: هو الإسهاب في الدعاء . وعن النبي ﷺ سيكون قوم يعتدون في الدعاء . وحسب المرء أن يقول: اللهم إني أسألك الجنة وما تقرب إليها من قول وعمل، وأعوذبك من النار وما قرب إليها من قول وعمل، ثم قرأ قوله تعالى:﴿ إنه لايحب المعتدين﴾ ﴿ إن رحمت الله قريب من المحسنين﴾ كقوله. (وإني لغفار لمن تاب وآمن وعمل صالحاً) وإنما ذكر ﴿قريب﴾على تأويل الرحمة بالرحم أو الترحم، أو لأنه صفة موصوف محذوف، أي شيء قريب، أو على تشبيهه بفعيل الذي هو بمعنى مفعول كما شبه ذلك به، فقيل قتلاء وأسراء، أو على أنه بزنة المصدر، الذي هو النقيض والضغيب، أو لأن تأنيث الرحمة غير حقيقي.

تفسیر معالم التنزیل:(ص۱۹۷،ج۲)

﴿ولا تفسدوا في الأرض بعد إصلاحها﴾ أي لا تفسدوا فيها بالمعاصي والدعاء إلى غيرطاعة الله بعدإصلاح الله إياها ببعث الرسل وبيان الشريعة . والدعاء إلى طاعة الله، وهذا معنى قول الحسن والسدي والضحاك والكلبي . وقال عطية : لا تعصوافي الأرض فيمسك الله المطرويهلك الحرث بمعاصيكم .فعلى هذامعنى قوله:﴿بعد إصلاحها﴾ أي: بعدإصلاح الله إياهابالمطر والخصب.﴿وادعوه خوفاً وطمعا﴾، أي: خوفامنه و من عذابه وطمعافيما عنده من مغفرته وثوابه . وقال ابن جريج:خوف العدل وطمع الفضل.﴿إن رحمة الله قريب من المحسنين﴾ ولم يقل قريبة، قال سعيد بن جبير: الرحمة ههنا للثواب فرجع النعت إلى المعنى دون اللفظ كقوله : ﴿ وإذاحضرالقسمة أولوالقربى واليتامى والمساكين فارزقوهم منه﴾، ولم يقل منهالأنه أراد الميراث والمال. وقال الخليل ابن أحمد: القريب والبعيد يستوي فيهما المذكر والمؤنث والواحد والجمع. قال أبو عمروبن العلاء: القريب في اللغة يكون بمعنى القرب وبمعنى المسافة، تقول العرب: هذه إمرأة قريبة منك إذاكانت بمعنى القرابة، وقريب منك إذاكانت بمعنى المسافة.

تفسیر کبیر:۔(ص۲۸۳۔۲۸۶ج۵)

ثم قال تعالى:﴿وَلا تُفْسِدُوا فِي الأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاحِهَا﴾معناه لاتفسدوا شيئاً في الأرض، فيدخل فيه المنع من إفساد النفوس بالقتل وبقطع الأعضاء، وإفساد الأموال بالغصب والسرقة ووجوه الحيل، وإفساد الأديان بالكفر والبدعة، وإفساد الأنساب بسبب الإقدام على الزنا واللواطة وسبب القذف، وإفساد العقول بسبب شرب المسكرات، وذلك لأن المصالح المعتبرة في الدنيا هي هذه الخمسة : النفوس والأموال والأنساب والأديان والعقول . فقوله:﴿ولا تفسدوا﴾ منع عن إدخال ماهية الإفساد في الوجود، والمنع من إدخال الماهية في الوجود يقتضي المنع من جميع أنواعه وأصنافه، فيتناول المنع من الإفساد في هذه الأقسام الخمسة، وأما قوله:﴿بعد إصلاحها﴾فيحتمل أن يكون المراد بعد أن أصلح خلقتها على الوجه المطابق لمنافع الخلق والموافق لمصالح المكلفين، ويحتمل أن يكون المراد بعد إصلاح الأرض بسبب إرسال الأنبياء وإنزال الكتب كأنه تعالى قال: لما أصلحت مصالح الأرض بسبب إرسال الأنبياء وإنزال الكتب وتفصيل الشرائع فكونوا منقادين لها، ولا تقدموا على تكذيب الرسل وإنكار الكتب والتمرد عن قبول الشرائع، فإن ذلك يقتضي وقوع الهرج والمرج في الأرض، فيحصل الإفساد بعد الإصلاح ، وذلك مستكره في بداهة العقول .

المسألة الثانية: هذه الآية تدل على أن الأصل في المضار الحرمة والمنع على الإطلاق.إذا ثبت هذا فنقول: إن وجدنا نصاً خاصاً دل على جواز الإقدام على بعض المضار قضينا به تقديماً للخاص على العام وإلا بقي على التحريم الذي دل عليه هذا النص.

واعلم أنا كنا قد ذكرنا في تفسير قوله:﴿قل من حرم زينة الله التي أخرج لعباده والطيبات من الرزق﴾[الاعراف:۳۲]أن هذه الآية تدل على أن الأصل في المنافع واللذات الإباحة والحل، ثم بينا أنه لما كان الأمر كذلك دخل تحت تلك الآية جميع أحكام الله تعالى، فكذلك في هذه الآية أنها تدل على أن الأصل في المضار والآلام : الحرمة .

وإذا ثبت هذا كان جميع أحكام الله تعالى داخلاً تحت عموم هذه الآية، وجميع ما ذكرناه من المباحث واللطائف في تلك الآية فهي موجودة في هذه الآية، فتلك الآية دالة على أن الأصل في المنافع الحل، وهذه الآية دالة على أن الأصل في جميع المضار الحرمة، وكل واحدة من هاتين الآيتين مطابقة للأخرى مؤكدة لمدلولها مقررة لمعناها، وتدل على أن أحكام جميع الوقائع داخلة تحت هذه العمومات، وأيضاً هذه الآية دالة على أن كل عقد وقع التراضي عليه بين الخصمين، فإنه إنعقد وصح وثبت،لأن رفعه بعد ثبوته يكون إفساداً بعدالإصلاح، والنص دل على أنه لايجوز.

إذا ثبت هذا فنقول: إن مدلول هذه الآية من هذا الوجه متأكد بعموم قوله:﴿وأوفوا بالعقود﴾[المائدة: ١]وبعموم قوله تعالى:﴿ لم تقولون ما لا تفعلون– كبر مقتاًعندالله ما لا تفعلون﴾ [الصف: ٢، ٣] وتحت قوله : ﴿والذين هم لأماناتهم وعهدهم راعون ﴾ [المؤمنون:٨، المعارج: ٣٢] وتحت سائرالعمومات الواردة في وجوب الوفاء بالعهود والعقود.

إذا ثبت هذا فنقول: إن وجدنا نصاً دالاً على أن بعض العقود التي وقع التراضي به من الجانبين غير صحيح، قضينافيه بالبطلان تقديماً للخاص على العام، وإلا حكمنا فيه بالصحة رعاية لمدلول هذه العمومات، وبهذا الطريق البين الواضح ثبت أن القرآن واف ببيان جميع أحكام الشريعة من أولها إلي آخرها.

ثم قال تعالى:﴿وادعوه خوفاً وطمعاً﴾وفيه سؤالات:

السؤال الأول: قال في أول الآية:﴿ادعوا ربكم﴾ثم قال:﴿ولا تفسدوا﴾ثم قال:﴿وادعوه﴾وهذا يقتضي عطف الشيء على نفسه وهو باطل.

والجواب: أن الذين قالوا في تفسير قوله:﴿ادعوا ربكم تضرعاً﴾ أي اعبدوه إنما قالوا ذلك خوفاً من هذا الإشكال.

فإن قلنا بهذا التفسير فقد زال السؤال، وإن قلنا المراد من قوله: ﴿ادعوا ربكم تضرّعاً﴾هو الدعاء كان الجواب أن قوله:﴿ادعُوا ربَّكُم تضرُّعاً وخفية﴾ يدل على أن الدعاء لا بد وأن يكون مقروناً بالتضرع وبالإخفاء، ثم بين في قوله﴿وادعوه خوفاً وطمعاً﴾أن فائدة الدعاء هو أحد هذين الأمرين، فكانت الآية الأولى في بيان شرط صحة الدعاء، والآية الثانية في بيان فائدة الدعاء ومنفعته.

السؤال الثاني: إن المتكلمين إتفقوا على أن من عبد ودعا لأجل الخوف من العقاب والطمع في الثواب لم تصح عبادته، وذلك لأن المتكلمين فريقان: منهم من قال التكاليف إنما وردت بمقتضى الإلٰهية والعبودية، فكونه إلٰهاً لنا وكوننا عبيداً له يقتضي أن يحسن منه أن يأمر عبيده بما شاء كيف شاء، فلا يعتبر منه كونه في نفسه صلاحاً وحسناً، وهذا قول أهل السنة. ومنهم من قال: التكاليف إنما وردت لكونها في أنفسها مصالح، وهذا هو قول المعتزلة.

إذا عرفت هذا فنقول: أما على القول الأول: فوجه وجوب بعض الأعمال، وحرمة بعضها مجرد أمر الله بما أوجبه ونهيه عما حرمه، فمن أتي بهذه العبادات صحت. أما من أتي بها خوفاً من العقاب، أو طمعاً في الثواب، وجب أن لا يصح، لأنه ما أتي بها لأجل وجه وجوبها، وأما على القول الثاني: فوجه وجوبها هو كونها في أنفسها مصالح، فمن أتي بها للخوف من العقاب، أو للطمع في الثواب فلم يأت بها لوجه وجوبها، فوجب أن لا تصح،فثبت أن على كلا المذهبين من أتي بالدعاء وسائر العبادات لأجل الخوف من العقاب،والطمع في الثواب،وجب أن لا يصح.

إذا ثبت هذا فنقول: ظاهر قوله:﴿وادعوه خوفاً وطمعاً﴾ يقتضي أنه تعالى أمر المكلف بأن يأتي بالدعاء لهذا الغرض، وقد ثبت بالدليل فساده، فكيف طريق التوفيق بين ظاهر هذه الآية وبين ما ذكرناه من المعقول.

والجواب: ليس المراد من الآية ما ظننتم، بل المراد: وادعوه مع الخوف من وقوع التقصير، في بعض الشرائط المعتبرة في قبول ذلك الدعاء، ومع الطمع في حصول تلك الشرائط بأسرها، وعلى هذا التقدير فالسؤال زائل؟

السؤال الثالث: هل تدل هذه الآية على أن الداعي لابد وأن يحصل في قلبه هذا الخوف والطمع؟

والجواب: أن العبد لايمكنه أن يقطع بكونه آتياً بجميع الشرائط المعتبرة في قبول الدعاء، ولأجل هذا المعنى يحصل الخوف، وأيضاً لايقطع بأن تلك الشرائط مفقودة، فوجب كونه طامعاً في قبولها فلاجرم قلنا: بأن الداعي لايكون داعيا إلا إذا كان كذلك فقوله: ﴿خوفا وطمعاً﴾ أي أن تكونوا جامعين في نفوسكم بين الخوف والرجاء في كل أعمالكم، ولا تقطعوا أنكم وإن اجتهد تم فقد أديتم حق ربكم. ويتأكد هذا بقوله: ﴿يؤتون ما آتوا وقلوبهم وجلة﴾ [المؤمنون: ٦٠]

ثم قال تعالى: ﴿إن رحمة الله قريب من المحسنين﴾ وفيه مسائل:

المسئلة الأولى: اختلفوا في أن الرحمة عبارة عن إيصال الخير و النعمة أو عن إرادة إيصال الخير والنعمة، فعلى التقدير الأول تكون الرحمة من صفات الأفعال، وعلى هذا التقدير الثاني تكون من صفات الذات، وقد استقصينا هذه المسئلة في تفسير ﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾ [الفاتحة: ١]

المسئلة الثانية: قال بعض أصحابنا: ليس لله في حق الكافر رحمة ولانعمة. واحتجوا بهذه الآية، وبيانه: أن هذه الآية تدل على أن كل ماكان رحمة فهي قريبة من المحسنين، فيلزم أن يكون كل مالا يكون قريباً من المحسنين، أن لايكون رحمة، والذي حصل في حق الكافر غير قريب من المحسنين، فوجب أن لا يكون رحمة من الله ولا نعمة منه.

المسئلة الثالثة: قالت المعتزلة: الآية تدل على أن رحمة الله قريب من المحسنين، فلما كان كل هذه الماهية حصل للمحسنين وجب أن لايحصل منها نصيب لغير المحسنين، فوجب أن لايحصل شيء من رحمة الله في حق الكافرين، والعفو عن العذاب رحمة، والتخلص من النار بعد الدخول فيها رحمة، فوجب أن لا يحصل ذلك لمن لم يكن من المحسنين، والعصاة وأصحاب الكبائر ليسوا محسنين، فوجب أن لا يحصل لهم العفو عن العقاب، وأن لايحصل لهم الخلاص من النار.

الجواب: أن من آمن بالله وأقر بالتوحيد والنبوة، فقد أحسن بدليل أن الصبي إذا بلغ وقت الضحوة، وآمن بالله ورسوله واليوم الآخر، ومات

قبل الوصول إلى الظهر فقد أجمعت الأمة على أنه دخل تحت قوله: ﴿للذين أحسنوا الحسنى﴾[يونس: ٢٦]ومعلوم أن هذا الشخص لم يأت بشيء من الطاعات سوى المعرفة والإقرار، لأنه لما بلغ بعد الصبح لم تجب عليه صلاة الصبح،ولما مات قبل الظهر لم تجب عليه صلاة الظهر، وظاهره أن سائر العبادات لم تجب عليه فثبت أنه محسن، وثبت أنه لم يصدر منه إلا المعرفة والإقرار، فوجب هذا المقدار إحساناً، فيكون فاعله محسناً.

إذا ثبت هذا فنقول: كل من حصل له الإقرار والمعرفة كان من المحسنين، فوجب بحكم هذه الآية أن تصل إلى صاحب الكبيرة من أهل الصلاة رحمة الله، وحينئذ تنقلب هذه الآية حجة عليهم.

فإن قالوا: المحسنون هم الذين أوتوا بجميع وجوه الإحسان.
فنقول: هذا باطل، لأن المحسن من صدر عنه مسمى الإحسان وليس من شرط كونه محسناً أن يكون آتياً بكل وجوه الإحسان كما أن العالم هو الذي له العلم وليس من شرطه أن يحصل جميع أنواع العلم فثبت بهذا أن السؤال الذي ذكروه ساقط وأن الحق ما ذهبنا إليه.

المسألة الرابعة: لقائل أن يقول مقتضى علم الإعراب أن يقال: إن رحمت الله قريبة من المحسنين فما السبب في حذف علامة التأنيث ؟ وذكروا في الجواب وجوهاً: الأول: أن الرحمة تأنيثها ليس بحقيقي وما كان كذلك فإنه يجوز فيه التذكير والتأنيث عند أهل اللغة.الثاني: قال الزجاج: إنما قال:﴿قريب﴾ لأن الرحمة والغفران والعفو الإنعام بمعنى واحد فقوله:﴿إن رحمة الله قريب من المحسنين﴾بمعنى إنعام الله قريب وثواب الله قريب فأجرى حكم أحد اللفظين على الآخر. الثالث: قال النضر بن شميل: الرحمة مصدر ومن حق المصادر التذكير كقوله: ﴿فمن جاءه موعظة﴾[البقرة: ٢٧٥]فهذا راجع إلى قول الزجاج لأن الموعظة أريد بها الوعظ، فلذلك ذكره قال الشاعر:

إن السماحة والمروءة ضمنا — قبراً بمرو على الطريق الواضح

قيل: أراد بالسماحة السخاء وبالمروءة الكرم. والرابع: أن يكون التأويل إن رحمة الله ذات مكان قريب من المحسنين كما قالوا: حائض

ولابن وتامر أي ذات حيض ولبن وتمر. قال الواحدي: أخبرني العروضي عن الأزهري عن المنذري عن الحراني عن ابن السكيت قال: تقول العرب: هو قريب مني وهما قريب مني وهم قريب مني وهي قريب مني؛ لأنه في تأويل هو في مكان قريب مني وقد يجوز أيضاً قريبة وبعيدة تنبيها على معنى قربت وبعدت بنفسها.

المسألة الخامسة: تفسير هذا القرب هو أن الإنسان يزداد في كل لحظة قرباً من الآخرة، وبعداً من الدنيا، فإن الدنيا كالماضي، والآخرة كالمستقبل، والإنسان في كل ساعة ولحظة ولمحة يزداد بعداً عن الماضي، وقرباً من المستقبل ولذلك قال الشاعر:

فلا زال ما تهواه أقرب من غد—ولازال ما تخشاه أبعد من أمس

ولما ثبت أن الدنيا تزداد في كل ساعة، وأن الآخرة تزداد قرباً في كل ساعة، وثبت أن رحمة الله إنما تحصل بعد الموت، لا جرم ذكر الله تعالى: ﴿إن رحمة الله قريب من المحسنين﴾ بناء على هذا التأويل.

تفسیر ابن کثیر: (ص۲۹۷ج۲)

وقوله تعالىٰ ﴿ولا تفسدوا في الأرض بعد إصلاحها﴾ ينهي تعالىٰ عن الفساد في الأرض وما أضره بعد الإصلاح فإنه إذا كانت الأمور ماشية على السداد ثم وقع الإفساد بعد ذلك كان أضر ما يكون على العباد فنهى تعالىٰ عن ذلك وأمر بعبادته ودعائه والتضرع إليه والتذلل لديه فقال ﴿وادعوه خوفاً وطمعاً﴾ أي خوفاً مما عنده من وبيل العقاب وطمعاً فيما عنده من جزيل الثواب ثم قال ﴿إن رحمت الله قريب من المحسنين﴾ أي إن رحمته مرصدة للمحسنين الذين يتبعون أوامره ويتركون زواجره كما قال تعالىٰ ﴿ورحمتي وسعت كل شيء فساكتبها للذين يتقون﴾ الآية وقال قريب ولم يقل قريبة لأنه ضمن الرحمة معنى الثواب أو لأنها مضافة إلى الله فلهذا قال قريب من المحسنين وقال مطر الوراق استنجزوا موعود الله بطاعته فإنه قضى أن رحمة الله قريب من المحسنين. رواه ابن أبي حاتم.

آیت:(۱۰)

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَابِاَنْفُسِھِمْ وَاَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (انفال ۵۳)

ترجمہ: اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو جو دی تھی اس نے کسی قوم کو جبتک وہی نے بدل ڈالیں اپنے جیوں کی بات، اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

خلاصہ:۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنا ایک عام قانون بیان فرماتے ہیں اپنی بے اعتدالی کے سبب جب لوگ اپنی فطری استعداد کو بدل ڈالتے ہیں تو حق جل مجدہ اپنی نعمتوں کو چھین لیتے ہیں اور انعام کو انتقام سے بدل دیتے ہیں۔ جیسا کہ کفار ومشرکین میں بھی اللہ نے ایمان لانے کی نعمت ودیعت فرمارکھی تھی لیکن جب انکار ومخالفت کر کے انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے انھیں محروم کردیا اوران کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگادی۔

قوت فکر وعمل پہلے فنا ہوتی ہے
پھر کسی قوم کی عظمت پہ زوال آتا ہے

نعمت چھیننے کے لئے تو یہ اصول ہے لیکن نعمت دینے کے لئے اللہ کا کوئی اصول نہیں بغیر کسی سبب کے بھی وہ نعمتوں سے نوازا کرتے ہیں۔ اور جس کو جتنا چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ مثلاً بن مانگے اللہ نے قادیانیوں کو اپنے پیارے حبیب محمد ﷺ کی امت میں پیدا کیا۔ اور آپ کی نبوت قیامت تک جاری رکھ کر مرزائیوں کو بھی یہ موقع دیا کہ آپ ﷺ کی نبوت کے تابع ہو کر اپنی دنیا اور آخرت بنائیں۔ لیکن جب مسلسل وہ اس کی ناقدری کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ یہ نعمت ان سے چھین لیتے ہیں اور وہ مرزا جیسے کوڑھ مغز کی نبوت منوانے کی فکر میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

قادیانی استدلال۔

یعنی اللہ تعالیٰ جس قوم پر کوئی نعمت کرتا ہے تو اس سے وہ نعمت دور نہیں کرتا۔ جب تک وہ قوم اپنی حالت نہ بدل لے۔ اگر اس امت پر خدا نے نبوت کی نعمت بند کردی ہے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ یہ امت بدکار ہوگئی ہے۔

جواب۔

اس آیت میں نعمت نبوت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ دیگر دنیوی نعمت کا ذکر ہے۔ جو آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوسکتا ہے۔ اس آیت کے پہلے بھی اور بعد میں بھی فرعون وغیرہ کا ذکر ہے کہ خدا تعالیٰ نے انکو کئی نعمتیں بخشی تھیں۔ لیکن انہوں نے نافرمانی کی تو خدا تعالیٰ نے ان پر تباہی ڈالی۔ کہاں نبوت اور کہاں دنیا کی نعمتیں خوشحالی وحکومت وغیرہ۔

قادیانی مغالطہ۔

نبوت بھی ایک نعمت ہے۔ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کیوں محروم ہو گئی ہے؟۔

جواب نمبرا۔

نبوت تشریعی اور نزول کتاب بھی اس سے بڑھ کر نعمت ہے۔ کیا آپ ﷺ کے بعد کوئی نئی کتاب یا کوئی نئی شریعت نازل ہوسکتی ہے؟ نہیں تو پھر وہی اعتراض لازم آیا کہ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد دنیا فیض شریعت سے محروم کر دی گئی کیونکہ جس طرح انبیاء آتے رہے اس طرح شریعت بھی وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ انعام شریعت بہ نسبت انعام نبوت کے بہت بڑی چیز ہے۔ ع۔ الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

الغرض نزول کتاب، ونبوت تشریعی بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ جب یہ نعمت بوجود بند ہونے کے امت میں نقص پیدا نہیں کرتی تو اگر مطلق نبوت نعمت ہو تو اس کے بند ہونے

کی صورت میں بھی کوئی نقص لازم نہیں آئیگا۔ کیونکہ نعمت اپنے وقت میں نعمت ہوتی ہے۔ مگر غیر وقت میں نعمت نہیں ہوتی ۔ جیسے بارش اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے مگر یہی بارش دوسرے وقت زحمت وعذاب ہوجاتی ہے۔

۲۔ ہم تو اس کے قائل ہیں کہ وہ نعمت پورے کمال کے ساتھ انسانوں کے پاس پہنچادی گئی ۔ ہم نعمت سے محروم نہیں ہیں بلکہ وہ اچھی صورت میں ہمارے پاس ہے ۔ جس طرح سورج نکلنے سے کسی چراغ کی ضرورت نہیں رہتی اس طرح آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں ہے ۔ چنانچہ قرآن مجید میں شجرہ طیبہ (اسلام) کے متعلق ہے کہ: تُؤْتِیْٓ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍ (ابراہیم ۲۵) شجرہ اسلام قیامت تک ثمر بار اور فیضان رساں رہے گا۔ اس کا فیضان قیامت تک منقطع نہیں ہوسکتا۔ قادیانی اگر خود کو اس نعمت سے محروم سمجھتے ہیں تو ان کی یہ بدفہمی ہے اس کی اصلاح کرلیں۔

نیز اگر نبوت نعمت ہی ہے تو مرزا کے بعد بھی اس نعمت کے مظاہر وجود پذیر ہونے چاہئیں۔ وہ کیونکر بند ہوگئے؟۔

ہیں فریب خوردہ اور آرزو نبوت کی
ایسی سادگی سے بڑی ہے کوئی حماقت کیا؟

کیا فرماتے ہیں مفسرین:

معارف القرآن۔ (ص ۲۶۰ ج ۴)

ترجمہ: اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو جو دی تھی اس نے کسی قوم کو جب تک وہی نہ دل ڈالیں اپنے جیوں کی بات اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

بیان القرآن:۔

اس سبب سے ہے (کہ ہمارا ایک قاعدہ کلیہ مقرر ہے اور بلا جرم سزا نہ دینا اسی قاعدہ کی ایک فرع ہے اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال کو نہیں بدل ڈالتے اور امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے جاننے والے ہیں (پس وہ تغیر قولی کو سنتے ہیں تغیر فعلی کو جانتے ہیں۔ سو ان کو کفار موجودین نے اپنی یہ حالت بدلی کہ ان میں باوجود کفر کے اول ایمان لانے کی استعداد قریب تھی انکار و مخالفت کر کر کے اس کو بعید کر ڈالا پس ہم نے اپنی نعمت امہال کو جو پہلے سے ان کو حاصل تھی مبدل بدار و گیر کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے بطریق مذکور نعمت قرب استعداد کو بدل ڈالا)۔

معارف و مسائل

چوتھی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے انعام و عطاء کے قائم اور باقی رکھنے کا ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ان اللہ لم یک مغیر انعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم یعنی اللہ تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو عطا فرماتے ہیں اس کو اس وقت تک بدلتے نہیں جب تک کہ یہ لوگ خود ہی اپنے حالات اور اعمال کو نہ بدلیں۔

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ حق تعالی نے عطاء نعمت کے لئے کوئی ضابطہ نہیں بیان فرمایا نہ اس کے لئے کوئی قید وشرط لگائی نہ اس کو کسی کے اچھے عمل پر موقوف رکھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلی نعمت جو خود ہمارا وجود ہے اور اس میں قدرت حق جل شانہ کی عجیب صنعت گری سے ہزاروں حیرت انگیز نعمتیں ودیعت رکھی گئی ہیں یہ نعمتیں ظاہر ہے کہ اس وقت عطا ہوئیں جب کہ نہ ہم تھے نہ ہمارا کوئی عمل تھا۔

ما نبودیم وتقاضا مانبودیم لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

اگر اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات بندوں کے نیک اعمال کے منتظر رہا کرتے تو ہمارا وجود ہی قائم نہ ہوتا۔

حق تعالی کی نعمت ورحمت تو اس کے رب العالمین اور رحمان ورحیم ہونے کے نتیجہ میں خود بخود ہے۔ ہاں اس نعمت ورحمت کے قائم اور باقی رہنے کا ایک ضابطہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ جس قوم کو اللہ تعالی کوئی نعمت دیتے ہیں اس سے اس وقت تک واپس نہیں لیتے جب تک وہ اپنے حالات اور اعمال کو بدل کر خود ہی اللہ کے عذاب کو دعوت نہ دے۔

حالات کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اچھے اعمال اور حالات کو بدل کر برے اعمال اور برے حالا اختیار کرلے یا یہ کہ اللہ کی نعمتیں مبذول ہونے کے وقت جن اعمال بد اور گناہوں میں مبتلا تھا نعمتوں کے ملنے کے بعد ان سے زیادہ برے اعمال میں مبتلا ہوجائے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن قوموں کا ذکر پچھلی آیات میں آیا ہے یعنی کفار قریش اور آل فرعون ان کا تعلق اس آیت سے اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اللہ تعالی کی نعمتیں ملنے کے وقت بھی کچھ اچھے حالات میں نہیں تھے سب کے سب مشرک اور کافر ہی تھے۔ لیکن انعامات کے بعد یہ لوگ اپنی بدعملیوں اور شرارتوں میں پہلے سے زیادہ تیز ہوگئے۔

آل فرعون نے بنی اسرائیل پر طرح طرح کے مظالم کرنے شروع کردیئے پھر حضرت موسی علیہ السلام کے مقابلہ اور مخالفت پر آمادہ ہوگئے جو ان کے پچھلے جرائم میں

ایک شدید اضافہ تھا جن کے ذریعہ انہوں نے اپنے حالات مزید برائی کی طرف بدل ڈالے تو اللہ نے بھی اپنی نعمت کو نقمت اور عذاب سے بدل دیا۔ اسی طرح قریش مکہ اگرچہ مشرک اور بدعمل تھے لیکن اس کے ساتھ ان میں کچھ اچھے اعمال صلہ رحمی، مہمان نوازی، حجاز کی خدمت، بیت اللہ کی تعظیم وغیرہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر دین و دنیا کی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے۔ دنیا میں ان کی تجارتوں کو فروغ دیا۔ اور ایسے ملک میں جہاں کسی کا تجارتی قافلہ سلامتی سے نہ گزر سکتا تھا ان لوگوں کے تجارتی قافلے ملک شام و یمن میں جاتے اور کامیاب آتے تھے جس کا ذکر قرآن کریم نے سورہ لایلف میں رحلۃ الشتاء والصیف کے عنوان سے کیا ہے۔

اور دین کے اعتبار سے وہ عظیم نعمت ان کو عطا ہوئی جو پچھلی کسی قوم کو نہیں ملی تھی کہ سید الانبیاء خاتم النبیین ﷺ ان میں مبعوث ہوئے اللہ تعالیٰ کی آخری اور جامع کتاب قرآن ان میں بھیجی گئی۔

مگر ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کے ان انعامات کی شکرگزاری اور قدر کرنے اور اس کے ذریعہ اپنے حالات کو درست کرنے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ گندے کر دیئے کہ صلہ رحمی کو چھوڑ کر مسلمان ہو جانے والے بھائی بھتیجوں پر وحشیانہ مظالم کرنے لگے۔ مہمان نوازی کے بجائے۔ ان مسلمانوں پر آب ودانہ بند کرنے کے عہد نامے لکھے گئے۔ حجاز کی خدمت کے بجائے مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکنے لگے۔ یہ وہ حالات تھے جن کو کفار قریش نے بدلا۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو نقمتوں اور عذاب کی صورت میں تبدیل کر دیا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوئے اور جو ذات رحمۃ للعلمین بن کر آئی تھی اسی کے ذریعہ انہوں نے اپنی موت وہلاکت کو دعوت دے دی۔

اور تفسیر مظہری میں معتمد کتب تاریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کلاب بن مرہ جو رسول اللہ ﷺ کے نسب میں تیسرے دادا ہیں ابتداء سے دین ابراہیم واسمٰعیل علیہ

السلام کے پابند اور اس پر قائم تھے اور نسلاً بعد نسل اس دین کی قیادت و سیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔ قصی بن کلاب کے زمانہ میں ان لوگوں میں بت پرستی کا آغاز ہوا۔ ان سے پہلے کعب بن لوی ان کے دینی قائد تھے جمعہ کے روز جس کو ان کی زبان میں عروبہ کہا جاتا تھا سب لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کرتے اور بتلایا کرتے تھے کہ ان کی اولاد میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے۔ ان کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ جو ان پر ایمان نہ لائے گا اس کا کوئی عمل قابل قبول نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں انکے عربی اشعار شعراء جاہلیت میں مشہور و معروف ہیں۔ اور یہی قصی بن کلاب تمام حجاز کے لئے کھانے اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں آپ کے عہد مبارک تک قائم رہیں۔ اس تاریخی تشریح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قریش کی تبدیلی حالات سے یہ مراد ہو کہ دین ابراہیمی کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کر لی۔

بہر حال مضمون آیت سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اوقات حق تعالیٰ اپنی نعمت بعض ایسے لوگوں کو بھی عطا فرماتے ہیں جو اپنے عمل سے اس کے مستحق نہیں ہوتے لیکن عطائے نعمت کے بعد اگر وہ اپنے اعمال کا رخ اصلاح و درستی کی طرف پھیرنے کے بجائے اعمال بد میں اور زیادتی کرنے لگیں تو پھر یہ نعمت ان سے چھین لی جاتی ہے اور وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا و ان اللہ سمیع علیم یعنی ان کی ہر گفتگو کو سننے والے اور ان کے تمام اعمال و افعال کو جاننے والے ہیں اس میں کسی غلطی یا غلط فہمی کا امکان نہیں۔"

تفسیر ماجدی۔

ترجمہ: یہ (سب) اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو جس کا انعام وہ کسی قوم پر کر چکا ہو نہیں بدلتا جب تک کہ وہی لوگ اس کو نہ بدل دیں، جو کچھ ان کے پاس ہے (۸۲) اور بیشک اللہ خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے (۸۳)

تفسیر:۔

(۸۲) یعنی جب تک کوئی قوم خود اپنی حالت اُس سے مختلف نہ کر لے جو نزولِ نعمت کے وقت اُسکی تھی اور اپنے اندر بجائے ایمان وطاعت کے کفر وخباثت پیدا کر لے۔ نعمت وخبث کا اجتماع خلاف حکمت الٰہی ہے۔ ذٰلک۔ یعنی یہی قانون جو اوپر بیان ہوا ہے۔ یہ کہ بے جرم شدید اللہ کسی کو سزا نہیں دیتا اور جب سزا دینا چاہتا ہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ نعمة کا لفظ عام ہے دنیوی، اخروی، مادّی روحانی، انفرادی قومی، سب ہی طرح کی نعمتیں اس میں آ گئیں۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت کے عموم میں وہ صورت بھی داخل ہے کہ سالک سے جب کوئی معصیت سرزد ہو جاتی ہے یا کوئی طاعت ترک ہو جاتی ہے تو اس سے انوار و برکات مقصودہ بھی منقطع ہو جاتے ہیں۔

(۸۳) چنانچہ وہ ہر تغیر قولی کو سن رہا ہے اور ہر تغیر فعلی کو جان رہا ہے۔

ترجمہ کنز الایمان۔

ترجمہ: یہ اس لئے کہ اللہ کسی قوم سے جو نعمت انھیں دی تھی بدلتا نہیں جب تک کہ وہ خود نہ بدل جائیں ۱۰۴ اور بیشک اللہ سنتا جانتا ہے۔

تفسیر:۔

۱۰۴ اور زیادہ بدتر حال میں مبتلا نہ ہوں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو روزی دے کر بھوک کی تکلیف رفع کی۔ امن دے کر خوف سے نجات دی اور ان کی طرف اپنے حبیب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر مبعوث کیا۔ انھوں نے ان نعمتوں پر شکر تو نہ کیا بجائے اس کے یہ سرکشی کی کی نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی تکذیب کی اُن کی خونریزی کے درپے ہوئے اور لوگوں کو راہ حق سے روکا۔ سدی نے کہا کہ اللہ کی نعمت حضرت سید انبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تفسیر ثنائی:۔

ترجمہ: یہ اس لئے کہ جو نعمت وہ کسی قوم پر انعام کرتا ہے کبھی نہیں بدلا کرتا جب تک وہ اپنے اعمال نہ بدلیں اور اللہ سنتا ہے اور جانتا ہے۔

تفسیر:۔

یہ گت ان کی اس لئے ہوئی کہ اللہ کی جناب میں یہ قاعدہ ہے کہ جو نعمت وہ کسی قوم پر انعام کرتا ہے، کبھی نہیں بدلا کرتا جب تک وہ اپنے اعمال اور اخلاق نہ بدلیں اور اس نعمت کی قابلیت نہ کھو دیں اور اللہ سب کی سنتا اور جانتا ہے کسی کے جتلانے یا رپوٹ کرنے کرانے کی اُسے حاجت نہیں۔ خدا نے ان مکہ کے مشرکوں پر جو یہ نعمت کی تھی کہ ان میں رسول پیدا کیا لیکن چونکہ انھوں نے اس کی ناقدری کی خدا نے ان کی ایسی گت کی کہ کسی کی نہ ہو۔ اور یہ نعمت ان سے چھین کر مدینہ والوں کو عنایت کی اور وہ اس خدمت پر مامور ہوئے جس کو انھوں نے پورا کیا۔

تفہیم القرآن:(۱۵۱ ج ۲)

ترجمہ: یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔ ؁ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

تفسیر:

؁ یعنی جب تک کوئی قوم اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی نعمت کا غیر مستحق نہیں بنا دیتی اللہ اس سے اپنی نعمت سلب نہیں کیا کرتا۔

جامع البیان: (ص ج۵)

يقول تعالىٰ ذكره: وأخذنا هؤلاء الذين كفروا بآياتنا من مشركي قريش ببدر بذنوبهم وفعلنا ذلك بهم، بأنهم غيروا ما أنعم الله عليهم به من ابتعاثه رسوله منهم وبين أظهرهم، بإخراجهم إياه من بينهم وتكذيبهم له وحربهم إياه ؛ فغيرنا نعمتنا عليهم بإهلاكنا إياهم، كفعلنا ذلك في الماضين قبلهم ممن طغى علينا وعصى أمرنا.

وبنحو ما قلنا في ذلك قال أهل التأويل. ذكر من قال ذلك:

١٢٥٨٦ — حدثني محمد بن الحسين، قال: ثنا أحمد بن المفضل، قال: ثنا أسباط، عن السدي: ﴿ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ يقول: نعمة الله محمد ﷺ، أنعم به على قريش وكفروا، فنقله إلى الأنصار.

وقوله: ﴿ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ يقول: لا يخفى عليه شيء من كلام خلقه، يسمع كلام كل ناطق منهم بخير نطق أو بشرّ، عليم بما تضمر صدورهم، وهو مجازيهم ومثيبهم على ما يقولون ويعملون، إن خيراً فخيراً وإن شراً فشراً.

تفسیر کشاف:

﴿ذٰلِكَ﴾ إشارة إلى ما حل بهم، يعني ذلك العذاب أو الإنتقام بسبب أن الله لم ينبغ له ولم يصحّ في حكمته أن يغير نعمته عند قوم ﴿حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا﴾ بهم من الحال فإن قلت: فما كان من تغيير آل فرعون ومشركي مكة حتىٰ غير الله نعمته عليهم؟ ولم تكن حال مرضية فيغيروها إلى حال مسخوطة قلت: كما تغير الحال المرضية إلى المسخوطة، تغير الحال المسخوطة إلى أسخط منها، وأولٰئك كانو قبل بعثة الرسول إليهم كفرة عبدة أصنام، فلما بعث إليهم بالآيات البينات فكذبوه وعادوه وتحزبو عليه ساعين في إراقة دمه، غيرو حالهم إلى أسوأ مما كانت، فغير

الله ما انعم به عليهم من الإمهال وعاجلهم بالعذاب﴿ وَأَنَّ اللهَ سَمِيعٌ﴾لما يقول مكذبو الرسل﴿ عَلِيمٌ ﴾بما يفعلون .

تفسیر معالم التنزیل: (ص ۲۵۵ ج ۲)

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَابِاَنْفُسِھِمْ﴾أراد أن الله تعالىٰ لا يغير ما أنعم على قوم حتى يغيروهم ما بهم بالكفر وترک الشکر، فإذا فعلوا ذلک غيّر الله ما بهم، فسلبهم النعمة . وقال السدي: نعمة الله محمد ﷺ أنعم الله به على قريش وأهل مكة، فكذبوه وكفروا به فنقله الله إلى الأنصار، ﴿وَأَنَّ اللهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

تفسیر کبیر: ۔ (۴۹۶ ج ۵)

﴿ذلک بأن الله لم يک مغيراً نعمة أنعمها على قوم حتى يغيروا ما بانفسهم﴾وفيه مسائل:

المسألة الأولىٰ: قوله:﴿لم يک﴾أكثر النحويين يقولون إنما حذفت النون . لأنها لم تشبه الغنة المحضة،فاشبهت حروف اللين ووقعت طرفاً، فحذفت تشبيها

بها كما تقول لم يدع ولم يرم ولم يل وقال الواحدي:وهذا ينتقض بقولهم لم يزن ولم يخن فلم يسمع حذف النون ههنا.

وأجاب علي بن عيسى عنه. فقال إن كان و يكون أم الأفعال من أجل أن كل فعل قد حصل فيه معنى كان فقولنا ضرب معناه كان ضرب ويضرب معناه يكون ضرب، وهكذا القول في كل فثبت أن هذه الكلمة أم الأفعال . فاحتيج إلى إستعمالها في أكثر الأوقات، فاحتملت هذا الحذف بخلاف قولنا لم يخن ولم يزن، فإنه لا حاجة إلى ذكرها كثيراً فظهر الفرق. والله اعلم.

المسألة الثانية: قال القاضي: معنى الآية أنه تعالىٰ أنعم عليهم بالعقل والقدرة وإزالة الموانع وتسهيل السبل والمقصود أن يشتغلوا بالعبادة

والشكر ويعدلوا عن الكفر، فإذا صرفوا هذه الأحوال إلى الفسق والكفر، فقد غيروا نعمة الله تعالى على أنفسهم، فلاجرم استحقوا تبديل النعم بالنقم والمنح بالمحن قال: وهذا من أوكد مايدل على أنه تعالى لا يبتدىء أحدا بالعذاب والمضرة، والذي يفعله لايكون الأجزاء على معاص سلفت، ولوكان تعالى خلقهم وخلق جسمانهم وعقولهم ابتداء للنار كمايقوله القوم، لما صح ذلک، قال أصحابنا: ظاهر الآية مشعر بما قاله القاضي الإمام إلا أنالو حملنا الآية عليه لزم أن يكون صفة الله تعالى معللة بفعل الإنسان، وذلک لأن حكم الله بذلک التغيير وإرادته لما كان لايحصل إلا عند إتيان الإنسان بذلک الفعل، فلو لم يصدر عند ذلک الفعل لم يحصل لله تعالى ذلک الحكم وتلک الإرادة، فحينئذ يكون فعل الإنسان مؤثرا في حدوث صفة في ذات الله تعالى، ويكون الإنسان مغيراً صفة الله ومؤثراً فيها، وذلک محال في بديهة العقل، فثبت أنه لا يمكن حمل هذا الكلام على ظاهره، بل الحق أن صفة الله غالبة على صفات المحدثات، فلولا حكمه وقضاؤه أوّلاً لما أمكن للعبد أن يأتي بشيء من الأفعال والأقوال"

تفسیر ابن کثیر: (ص۳۲۲ج۲)

يخبر تعالى عن تمام عدله وقسطه في حكمه بأنه تعالى لا يغير نعمةً أنعمها على أحد، إلا بسبب ذنب إرتكبه، كقوله تعالى: ﴿إنّ الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم، وإذا أراد الله بقوم سوء اً فلا مرد له وما لهم من دونه من وال﴾ وقوله ﴿كدأب آل فرعون﴾ أي كصنعه كعال فرعون وأمثالهم، حين كذبوا بآياته، أهلكهم بسبب ذنوبهم وسلبهم تلک النعمة التي أسداها إليهم، من جنات وعيون وزروع وكنوز ومقام كريم، ونعمة كانوا فيها فاكهين، وما ظلمهم الله في ذلک بل كانوا هم الظالمين.

ہمیں ضرور پڑھیں

تحفظ ختم نبوت اور رد قادیانیت کے موضوع پر آڈیو سی ڈی(Audio CD) مندرجہ ذیل علماء کرام کے بیانات پر مشتمل تیار ہے

ا۔حضرت مولانا منظور احمد صاحب چنیوٹی مدظلہ فاتح قادیانیت وفاتح ربوہ ۔

۲۔مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری نائب ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند نیز تربیتی کیمپ دارالعلوم دیوبند، تربیتی کیمپ آسام، تربیتی کیمپ مدراس، تربیتی کیمپ بھاگلپور، تربیتی کیمپ بنگلور نیز دیگر مقامات کے اجلاس عام اور اس موضوع سے متعلق مختلف پروگراموں کی بھی سی ڈی تیار کرائی جاتی ہیں۔خواہش مند حضرات پیشگی آرڈر بک کرائیں۔

اور یہ بھی یاد رکھیں!

قادیانی اپنے باطل مزعومات کو ثابت کرنے کیلئے جن کتب تفاسیر میں تحریف و تلبیس کرتے ہیں وہ تو محدود نہیں البتہ وہ آیات قرآنی ضرور محدود ہیں جن کو مشق ستم بناتے ہیں۔قادیانی جن آیات کے معانی و مطالب میں تحریف کرتے ہیں اُن سے متعلق کتاب میں مندرج تفاسیر کے علاوہ جن تفاسیر کی آپ کو ضرورت ہو خواہ وہ تفسیر کسی بھی مکتب فکر کی ہو آپ ہم سے رابطہ کریں مطلوبہ تفسیر کی فوٹو کاپی آپ تک پہنچانے میں میں اپنی سعادت سمجھوں گا۔اس کیلئے ہمارا ای میل اور ویب سائٹ حاضر ہے۔

والسلام

E-Mail: shahalamgorakhpuri@rediffmail.com
website: www.mtkn-deoband.org
Ph:01336-220345